سخن ہائے ناگفتنی

خامہ بگوش

تحریروں کا انتخاب

مرتبہ

مظفر علی سید

Marfat.com

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

Marfat.com

سخن ہائے ناگفتنی

مرتب

مظفر علی سیّد

اکادمی بازیافت

Marfat.com

130266

پہلی اشاعت : اپریل ۲۰۰۴ء
کمپوزنگ : لیزر پلس، فون: ۷۷۵۱۳۲۴
قیمت : ۲۰۰/ روپے
جملہ حقوق محفوظ

ISBN: 969-5400-16-7

Sukhan Der Sukhan

(Literature)

Compiled By : Muzaffar Ali Syed

Kitab Market, Office# 17, St # 3
Urdu Bazar, Karachi, Pakistan
Ph. (92-21) 7751428
e-mail : mukalama@cyber.net.pk

Marfat.com

بے مثال شگفتہ نگار

مجتبیٰ حسین

کے لیے

محبت کے ساتھ

Marfat.com

Marfat.com

فہرست

دیباچہ　مظفر علی سیّد　۹

شاعری پر شب خون / ۱۷

جوش اور فتنۂ آخر الزماں / ۲۳

نقاد یا لذّتِ دشنامِ یار / ۳۲

رُونمائی یا رُسوائی / ۳۷

غالب شناس یا غلبچی / ۴۲

نئی شاعری یا فرسودہ شاعری / ۴۸

منیر نیازی کی نثری شاعری / ۵۳

تعریف یا ہجوِ ملیح / ۵۸

Marfat.com

واقعہ، حادثہ، سانحہ یا لطیفہ /۶۴

سفرنامہ یا شاہی دسترخوان /۷۰

سوختنی نہ فروختنی /۷۵

خوفِ فسادِ خلق /۸۱

شگفتہ بیانی یا آشفتہ بیانی /۸۶

تماشائے اہلِ قلم /۹۲

جانِ عالم کا پری خانہ یا ریڈیو پاکستان /۹۸

مشاہیر یا مساکین /۱۰۴

مطالعہ اور بلڈ پریشر /۱۰۹

ادب اور ازدواجی مسائل /۱۱۴

اردو ادب کے مہاراج کتھک /۱۱۹

ادیبوں کی جنگِ زرگری /۱۲۴

ردّیاتِ ادب کے سالانہ جائزے /۱۲۸

کتابت کی طبع زاد غلطیاں /۱۳۳

تنقید یا دُشنام نویسی /۱۳۹

تنقید کے چراغ تلے /۱۴۴

غالب ناشناسی /۱۴۸

سفرنامہ یا عبرت نامہ /۱۵۳

مطائباتِ شہرت بخاری /۱۵۹

ادیب اور راگ درباری /۱۶۴

Marfat.com

ادبی مجاور/۱۷۰
جوش ناشناسی/ ۱۷۶
تاریخ یا ٹلّے نویسی/۱۸۲
مرزا غالب پر قاتلانہ حملہ/ ۱۸۸
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو/۱۹۳
ترجمہ یا مجموعۂ لطائف/ ۱۹۹
گمراہانِ جادۂ تحقیق/۲۰۴

Marfat.com

ہمیں اِس موقعے پر وہ لوگ بھی یاد آرہے ہیں جو اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ مرحومین کے بارے میں کوئی کالم کتاب میں شامل نہ کیا جائے لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ مرحومین کو یاد رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اُن کا ذکر اُسی طرح کرتے رہیں جس طرح اُن کی زندگی میں کرتے تھے تاکہ وہ ہمیں اپنے آس پاس چلتے پھرتے نظر آتے رہیں۔ اِس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب زندہ ادب کے بارے میں نہ سہی، زندہ ادیبوں کے بارے میں ضرور ہے۔

اقتباس از ''غلط نامہ'' (دیباچہ: خامہ بگوش کے قلم سے)

Marfat.com

دیباچہ

کہتے ہیں کہ زندگی میں ایک جیسی خوشی خال خال ہی دوبارہ نصیب ہوتی ہے، جب کہ ملتے جلتے مصائب بار بار پیش آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ خامہ بگوش کے کالم منتخب کرنے کا مزید ایک موقع، مرتب کے لیے، اُس شیرینیِ دیگر کی طرح پُرکشش ہے جو شکر کے حریص (یا مریض) کے سامنے رکھ دی گئی ہو۔

پھر بھی چونکہ پہلا تجربہ زیادہ تر خوش گوار ثابت ہوا تھا، اس لیے ''یہی اور'' (more of the same) کی صدا لگانی پڑی، انجام جو بھی ہو۔ البتہ مصنفِ محترم کا پہلی جلد کے دیباچے میں یہ لکھنا کہ انتخاب کی ذمہ داری اِس نیازمند نے ''قبول کرلی تھی''، محض ان کی منکسرمزاجی کا آئینے دار تھا۔ اصل میں اُن سے پوچھا تھا کہ آج کل جب کہ ہر اُلٹا سیدھا کالم نگار اپنے کالموں کے تابڑ توڑ مجموعے چھاپتا چلا جاتا ہے، آپ کو کیا موانع در پیش ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ کالموں کی تعداد پچھلے دس گیارہ برسوں میں بہت زیادہ ہو چکی ہے اور اب یا تو کوئی ثروت مند مربی ہاتھ لگے یا پھر سرکاری خزانے سے اپنا حصہ وصول ہو، تب کہیں جا کر کام بنے۔ پوچھا کہ انتخاب کے بارے میں کیا خیال ہے جب کہ جامعہ ملیہ دہلی والے اس کے خواہش مند بھی ہیں۔ کہا کہ میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سا کالم رکھوں، کون سا چھوڑ دوں؟ اس موقعے پر یہ جاں نثار آڑے آنے کو تیار ہوا، بشرطے کہ دیباچہ بھی وہی لکھے کہ آخر انتخاب کی محنت کا کچھ عوضانہ بھی تو ہو۔ اب یوں تو مجلّہ ''تخلیقی ادب'' کی ادارت اور مکتبۂ اسلوب کے پرچم تلے علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت کے دور میں، ہم محنت کشوں کا حق الخدمت ادا کرنے کے سلسلے میں انھیں کبھی نادہند نہیں پایا تھا، لیکن شاید یہ معاوضہ انھیں

Marfat.com

استحقاق سے زیادہ محسوس ہوا۔ یا پھر یہ گمان گزرا کہ آج کل تنقید میں ردِ تشکیل کا بہت تذکرہ ہوتا ہے، کہیں یہ بے مروّت آدمی اِس ساری عمارت کو جو سالہا سال میں تعمیر ہوئی ہے، اپنے دیباچے سے مسمار کر کے نہ رکھ دے۔

ظاہر ہے کہ یہ بات مزاحاً کہی گئی تھی کہ اِن دنوں سنجیدہ ترین باتیں مزاح ہی مزاح میں کہی جا سکتی ہیں۔ تاہم اِس گمان یا خوش گمانی نے راقم کو دیر تک گومگو میں ڈالے رکھا۔ انتخاب ہو چکا بلکہ اس کی کمپوزنگ بھی مکمل ہوگئی لیکن دیباچے کے لیے جامعہ ملیہ کی ڈیڈ لائن ایک مرتبہ ملتوی ہونے کے بعد بھی گزرنے لگی تو بالآخر یہ طے ہوا کہ ہفتے بھر میں دیباچہ نہ ملا تو کتاب اس کے بغیر ہی شائع کردی جائے گی۔ اب یہ دھمکی اتنی سخت ثابت ہوئی کہ اس ناتواں کو بیماری نے دبوچ لیا اور انتخاب خامہ بگوش کے اپنے ''غلط نامے'' کے ساتھ چھپ کر بھی آگیا، اگرچہ آخری مہلت کے آٹھ مہینے بعد۔ یقیناً اِس دوران میں، جل تو جلال تو کا وِرد خضوع و خشوع کے ساتھ جاری رہا ہوگا۔

بعد میں البتہ انتظار حسین نے اس کوتاہی کو فہمیدہ ریاض کے ''دفضیحتے'' کے ساتھ پرو دیا (جو ''زندہ بہار'' کا دیباچہ شائع ہونے پر اُچھالا گیا تھا)۔ اپنے کالم ''عطرِ فتنہ'' (عطر کم، فتنہ زیادہ) میں انھوں نے خامہ بگوش کی دانش مندی کو سراہا جس کی وجہ سے ''سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی''۔ یہ الگ بات کہ انتظار حسین دیو مالا کے جنگل میں تو سانپ دیوتا کو سب سے اونچے سنگھاسن پر بٹھاتے ہیں لیکن ادب کی دنیا میں اس کی ذرا سی مداخلت بھی گوارا نہیں کرتے۔

خامہ بگوش کے بارے میں محمد خالد اختر نے بہت پہلے کہہ رکھا ہے کہ ان کے قلم کا ڈسا پانی نہیں مانگتا اور یہ بھی کہ اِس سلسلے میں وہ دوست دشمن کا امتیاز روا نہیں رکھتے۔ حالانکہ شواہد کی روشنی میں یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ دشمنوں کو غیر مستحق سمجھتے ہوئے، ساری نوازشیں دوستوں پر ڈھیر کر دیتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو نظیر صدیقی یا گوپی چند نارنگ سے پوچھ لیجیے اور اتنی دور نہ جاسکیں تو یہ نیاز مند بھی حاضر ہے:

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

پہلی جلد کے انتخاب کی ضخامت ناشر کے نزدیک کچھ زیادہ ہوگئی تھی۔ چنانچہ راقم کے مرتبہ کالموں میں مصنف کو دخل دینے کا موقع مل گیا۔ نتیجہ یہ کہ بقول شمیم حنفی ''چند ایک یاد رہنے والے کالم'' تخفیف کی نذر ہوگئے جن میں ''شہاب نامے'' پر سہ قسطی کالم (جسے خامہ بگوش کا شہکار کہنا چاہیے) اور ''ساداتِ امروہہ'' والی بے نظیر تحریر بھی شامل تھی۔ یقیناً اِن نشان زد

Marfat.com

نوشتوں کی جگہ بعض دوسرے کالم قلم زد کیے جاتے تو مناسب ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ پھر ایسا کیوں ہوا؟ اس کے سوا کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کہیں سے ''جذباتی دباؤ'' کا زور آن پڑا ہو۔ یہ دباؤ انھوں نے لکھتے ہوئے اور رسالے میں چھاپتے ہوئے تو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا تھا لیکن لگتا ہے کہ انتخاب کی سُن گُن ملتے ہی اس میں خاصا اضافہ ہو گیا اور خامہ بگوش بھی جنھیں مظہر امام نے خطرناک اور بعض دوسرے ستم رسیدوں نے خوف ناک تک قرار دے رکھا ہے، لحاظ ملاحظے پر مجبور ہو گئے۔

اس سے پہلے انھوں نے چند ایک شدید قسم کی ''سخن گسترانہ'' تحریروں کو خارج کرنے کا یہ فارمولا دریافت کیا تھا کہ انتخاب کی پہلی جلد، ہفت روزہ ''تکبیر'' میں ۸۳ء سے ۹۰ء تک کے مطبوعہ کالموں کا انتخاب ہو (چنانچہ صدیق سالک مرحوم کی کتاب ''تا دمِ تحریر'' پر ایک یادگار ''مزاحمتی تبصرہ'' پھر فیض اور ندیم پر لکھے ہوئے کالم، اور ان کے علاوہ بھی کچھ اہم تحریریں جو ۸۳ء سے پہلے روزنامہ ''جسارت'' کراچی میں شائع ہوئی تھیں، معرضِ اخفا میں چلی گئیں) لیکن اس سے نقصان کس کا ہوا؟ یقیناً خامہ بگوش سے زیادہ ہمارا اور اردو ادب کا، جس میں وہ شخصیات بھی شامل ہیں جو اِن تحریروں کا موضوع بنی تھیں۔ تاہم تلافی کی خاطر جب راقم نے تجویز کیا کہ دوسری جلد میں اِن ''متروکات'' کو بھی واگزار کرلیا جائے تو فرمایا کہ نہیں، اس میں تو صرف ۹۴ء سے ۹۶ء تک کے کالموں کا انتخاب ہوگا۔ مجبوراً اِن ہی ''شرائطِ حوالہ'' کے دائرے میں رہتے ہوئے موجودہ انتخاب مرتب کیا گیا ہے اور جو کچھ پہلی جلد میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا اسے کسی مناسب تر موقع پر چھوڑنے کے سوا چارہ نہیں۔ اب کے البتہ خامہ بگوش سے گزارش کی گئی ہے کہ کسی دوسرے کی مرتبہ کتاب میں ردّ و بدل سے پرہیز مستحسن ہے۔ چاہے وہ آپ ہی کی تخلیقات پر مشتمل ہو۔ خصوصاً جب کہ اس کی مجموعی ضخامت بھی زیادہ نہ ہو۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' کے ادبی ایڈیشن کے مہتمم جناب عطاء الحق قاسمی نے پہلی جلد پر تبصرے کے دوران، یہ سمجھتے ہوئے کہ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا انتخاب مرتب کرنے کے بعد یہ گنہ گار اپنے انتخاب کے ساتھ (بڑے) قاسمی صاحب کو بھی مسترد کر چکا تھا (خدا جانے کب اور کہاں؟)، یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ دیکھیں اب خامہ بگوش کو کب مسترد کیا جاتا ہے۔ اب اگرچہ ندیم صاحب نے خامہ بگوش کے نام ایک خط میں جو اُن کی اجازت سے شائع بھی ہو چکا ہے، اپنے استرداد یا راقم کے انحراف کی خبر سے لاعلمی کا اظہار کر دیا ہے، عزیزم عطاء الحق کو اپنے خدشے کی تصدیق کے لیے سطورِ بالا میں بہت کچھ مل سکتا ہے۔ آخر آدمی کو اتنا ناقابلِ اعتبار بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہ کی جاسکے۔

Marfat.com

یوں مجموعی طور پر جن مبصرین نے پہلی جلد کے مندرجات کی تعریف و توصیف میں لیت ولعل سے کام نہیں لیا تو مرتب نے مصنف کے ساتھ خود کو بھی اس میں شریک سمجھا۔ خصوصاً اسلوب احمد انصاری نے (''نقد و نظر''، علی گڑھ میں) شمیم حنفی نے (''کتاب نما''، دہلی میں) اور فضیل جعفری نے (''بلٹز''، بمبئی میں) جو مفصل تبصرے شائع کیے، انھیں خود ان کے لیے بھی لائقِ تحسین کہنا چاہیے۔ پاکستانی ایڈیشن پر ڈاکٹر اسلم فرخی اور تقی حسین خسرو کے تبصرے بھی بالترتیب استادانہ اور عالمانہ تھے (جب کہ انتظار حسین کو محترمہ فہمیدہ ریاض نے اتنی مہلت نہ دی کہ کتاب کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی گنجائش نکال سکتے)۔ البتہ ہمارے ادبی ماحول کی ایک خوش گوار خبر یہ ہے کہ عطاء الحق قاسمی اور ڈاکٹر انور سدید ہماری آپ کی زندگی میں پہلی بار کسی معاملے میں متفق نظر آئے (خدا کرے یہ آخری بار نہ ہو) یعنی خامہ بگوش کی مدلّل مدّاحی اور مرتب کی معکوس مدّاحی دونوں لحاظ سے۔ یہ اتفاق مبارک ہے مومنوں کے لیے۔ بلکہ دونوں کے یہاں خامہ بگوش کے لیے پورے چھ لفظوں کا ایک جملہ... ''وہ تو ہیں ہی سراپا انتخاب'' توارد کے طور پر وارد ہوا۔ یوں ان سے برسوں پہلے میر حسن، دیوانِ درؔد کے بارے میں کہہ چکے تھے کہ دیوانِ حافظؔ کی طرح ''سراپا انتخاب'' ہے مگر یہاں مفہوم مختلف تھا۔ مطلب یہ تھا کہ انتخاب کی ضرورت ہی کیا تھی، گویا مرتب کا نام نہ آتا تو بہتر تھا چاہے کالموں کی کلیات کتنی ہی ضخیم کیوں نہ ہو جاتی۔

ایک کے نزدیک مرتب کو انتخاب کرتے ہوئے کوئی دقت پیش نہ آئی ہوگی (گویا سارا کلام معیاری ہو تو انتخاب آسان ہو جاتا ہے)۔ دوسرے محترم کو یوں لگا جیسے یہ کام قرعہ اندازی کے ذریعے انجام دیا گیا ہو (لیکن قسمت آزمائی کے اس طریقِ کار میں، کوئی زیادہ معیاری چیز رہ تو نہیں گئی، اس کے جواب میں نشان دہی کی بجائے یہی کافی سمجھا گیا کہ باقی تمام کالم، جن کی مجموعی تعداد تین ساڑھے تین سو تک پہنچتی ہے اور جن کے لیے مزید پندرہ سولہ سو صفحے درکار ہوتے۔ گویا ''اوراق'' کے تین خاص نمبر اور ''معاصر'' کے سات آٹھ نمبر اس کے لیے وقف کرنے پڑتے، اشتہارات کو چھوڑ کر۔ حیرت ہے کہ خامہ بگوش کی کلیات چھاپنے کی اتنی آسان تجویز کیوں صورت پذیر نہ ہو سکی)۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مرتب کے بارے میں انھیں میں سے ایک صاحب کو کہیں سے یہ اطلاع بھی موصول ہوئی کہ وہ تو ''اپنی حالیہ زندگی بسترِ علالت پر صرف کر چکے ہیں، پھر یہ کیسے ہوا کہ وہ سیکڑوں کالم پڑھ کر انتخاب کی زحمت اٹھاتے؟'' غالباً ان کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ علالت کا حادثہ تو انتخاب کے بعد پیش آیا تھا۔

ان دونوں کے عین درمیان میں ایک اور تبصرہ نگار تھے جنھوں نے ایک قلمی نام سے

Marfat.com

انیس ناگی صاحب کے ''دانشور'' میں یہ تحریر فرمایا کہ مرتب کا نام ''سجاوٹ'' کے طور پر لکھا گیا ہے۔ البتہ چند سطروں کے بعد یہ سجاوٹ، محض ''مروّت'' میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔ پھر بھی یہ شکایت کہ مرتب نے بطور دیباچے کے کچھ نہ لکھا، خود جناب مصنف نے اور ان کی پیروی میں بہت سے کرم فرماؤں نے داخلِ دفتر کی۔ اوپر اس کی وجہ لکھی جا چکی ہے، البتہ ایک مزید سبب یہ ہوا کہ مصنف کے بارے میں ایک تفصیلی مقالہ لکھنے کا ارادہ ہو گیا (جو اب بھی قائم ہے) اور ظاہر ہے کہ کتاب میں اس کی گنجائش نہ تھی۔ اُس وقت بلکہ اب بھی یہ کتاب میں شامل ہوتا تو کم ازکم چار پانچ کالموں کی قربانی دینا پڑتی جو اس نیازمند کی نظر میں مناسب نہیں کہی جا سکتی۔

موجودہ کتاب جو مارچ ۱۹۹۴ء سے لے کر اواخر ۱۹۹۶ء تک کے کالموں سے منتخب کی گئی ہے، تناسب کے لحاظ سے اصل سے تقریباً نصف ضخامت پر مشتمل ہے جب کہ پہلی جلد اصل کا چھٹا ساتواں حصہ تھی۔ چنانچہ یہاں خامہ بگوش کی خوبیاں (بلکہ خرابیاں بھی) زیادہ تفصیل سے دیکھی جا سکتی ہیں جن میں سے چند ایک خصوصیات پڑھنے والوں کو توجہ دلانے کے لیے مختصراً بیان ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں، مثلاً یہ کہ خامہ بگوش کے کالم نہ تو عین مین تنقیدی کالم ہیں اور نہ اکثر (برائے نام) ادبی کالموں کی طرح محض گپ شپ پر مشتمل۔ گویا انھیں عسکری کی ماہانہ ''جھلکیاں'' کے مماثل کہا جا سکتا ہے نہ انتظار حسین کی ''باتیں اور ملاقاتیں'' کے۔ یہ سیاسی کالم بھی قرار نہیں دیے جا سکتے اگرچہ سیاست کا حوالہ، اشارۃً اور کنایتہً، جابجا دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بھی بڑی حد تک درست ہوگا کہ ادبی گروہ بندیوں کے قضیے میں غیر جانب داری ان کو پسند ہے چاہے کبھی کبھار ایک خاص طرف ان کا ہلکا میلان جھلک جاتا ہو۔

اس کے علاوہ جس رسالے اور اس سے پہلے جس اخبار میں یہ کالم شائع ہوتے رہے (اور ہو رہے ہیں) اس کی دائیں بازو کی سیاست سے خامہ بگوش کی ادبی حیثیت کا کوئی میل نہیں چاہے مدیر مرحوم کے ان سے ذاتی تعلقات کی نوعیت کتنی بھی گہری کیوں نہ رہی ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں نہ مستند ترقی پسندوں (یا ان کے باقیات) کی ناموری مقصود ہے نہ سکہ بند اسلام پسندوں کی قدر افزائی۔ یوں کسی کتاب یا کسی گفتگو پر رائے زنی کرتے ہوئے خصوصیت میں تھوڑی سی عمومیت پیدا ہو جائے تو اور بات ہے لیکن یہ بات خامہ بگوش کے وسیع ادبی روابط پر کم ہی اثر انداز ہوتی ہے۔ تاہم چند ایک روابط تقاضائے بشری کے طور پر کہیں نہ کہیں قربتِ خاص کا اشارہ ضرور کرتے ہیں جنھیں پڑھنے والا چاہے تو نظر انداز کر سکتا ہے یا زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرے تو ایک طرح کا ''جھکاؤ'' کہہ سکتا ہے۔ پھر بھی خامہ بگوش کے بارے میں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ زیادہ دیر تک کسی کے سامنے جھکنے والے آدمی نہیں، بس ذرا

Marfat.com

کی ذرا مروّت کر بیٹھیں تو الگ ہے۔ اگرچہ یہ ذرا سی مروّت بھی بعض اوقات بہت مہنگی پڑتی ہے۔

جن لوگوں کا وہ بالکل لحاظ نہیں کرتے، ان میں ہر طرح کے ادیب اور دانشور شامل ہیں، اپنے بھی اور بیگانے بھی۔ لیکن وہ سب کو اپنا ہی سمجھ کر ان سے بے تکلفانہ سلوک کر جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کام خالصتاً اللہ انجام دیتے ہیں اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نیشِ عقرب میں کوئی کینہ نہیں ہوتا۔ لیکن خامہ بگوش کے بارے میں کہی گئی دوسری باتوں کی طرح اسے بھی پوری طرح درست قرار دینا مشکل ہے کہ ان کی کاٹ اکثر دو دھاری ہوتی ہے۔ پہلو داری کا کمال ہی یہی ہے کہ اِدھر سے اُدھر کا پہلو نظر نہ آئے لیکن جب دونوں طرف ہاہا کار مچتی ہے تب پتا چلتا ہے کون کون زد میں آ گیا۔ دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ شخصی اور خصوصی تصاویر کا یہ مرقع مجموعی طور پر کس طرح کا نقشہ بناتا ہے۔ اسے ادب کا اور ادبی کلچر کے زوال کا نقشہ ہی کہا جاسکتا ہے جیسا کہ شمیم حنفی نے کہا ہے اور بڑے ادیبوں کے چھوٹے پن کا انکشاف بھی جیسا کہ ''دانشور'' کے گم نام تبصرہ نگار نے کہا ہے۔ لیکن خامہ بگوش نے زوال کی اس تصویر میں بھی اچھی خاصی تفریح کا سامان پیدا کیا" ہے اور انکشاف میں بھی سچ مچ کے بڑے ادیبوں کو کم ہی کہیں موضوع بنایا ہے کہ وہ تو یوں بھی اپنے ماحول میں مستثنیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ خامہ بگوش کے بہت سے کالم کتابوں کی تقریباتِ رونمائی یا ادیبوں سے رُو در رُو گفتگوؤں پر مشتمل ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ خامہ بگوش یا ان کے ہم زاد استاد لاغر مراد آبادی کسی ادبی تقریب میں کسی بھی حیثیت سے بطور صدر، بطور مہمانِ خصوصی، بطور مقرر حتیٰ کہ بطور سامع بھی، کم ہی کبھی شرکت کرتے ہیں۔ اُن تقریبوں میں بھی نہیں جو خود ان کے زیرِ اہتمام منعقد ہوتی ہیں۔ ضروری معلومات ان تک بالواسطہ پہنچتی ہیں لیکن فوری طور پر اور خاصی تفصیل کے ساتھ۔ وہ خود کراچی میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن لاہور اور اسلام آباد، دہلی اور لکھنؤ بلکہ بمبئی اور حیدرآباد تک کی وہ باتیں جن کو صیغۂ راز میں رکھا جاتا ہے لاتعداد ''فرشتوں'' کی مدد سے ان کے ذہنی کمپیوٹر میں فیڈ اور پروسیس ہوتی رہتی ہیں۔ جب بھی ضرورت پڑی، بٹن دبایا اور دفتر کے دفتر کھل کر رہ گئے۔ یہ اُن کا روحانی تصرف ہے یا ریشہ دوانی کا کمال، اس کا فیصلہ بھی آسان نہیں۔

پھر، غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ خامہ بگوش نے شاید ہی کبھی کسی ادیب سے شخصی انٹرویو کیا ہو۔ جو کالم گفتگوؤں پر مبنی بنائے جاتے ہیں ان میں بھی شخصِ مذکور کے کسی مطبوعہ یا

Marfat.com

نثری انٹرویو کا حوالہ موجود ملے گا۔ لیکن یہ حوالہ بہت جلد بھول جاتا ہے اور پڑھنے والا سوال در سوال اور جواب در جواب کے جال میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور نکلتا ہے تو اس کی توجہ انٹرویو کے موقع محل کی بجائے انٹرویو دینے والے کی بوالعجبیوں پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ کتابوں کے سلسلے میں حسنِ اقتباس ان کا خاص جوہر ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہر کتاب کے جنگل میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گیدڑ چھپا ہوتا ہے تو خامہ بگوش کی نظر نہایت تیزی سے اس گیدڑ کو برآمد کر لیتی ہے۔ وہ کسی بھی مصنف کے لکھے ہوئے مختلف فقروں اور پیراگرافوں... اور ان پر رواں رائے زنی کی مدد سے ایک ایسی خندہ آور تلخیص تیار کرتے ہیں جو زیرِ نظر تصنیف کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دے۔ پھر بھی انھیں جدید ناقدین کی ردِ تشکیل سے شکایت ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ کسی بھی معروف نقاد کی نسبت کسی بھی تازہ کتاب کا مطالعہ کہیں زیادہ توجہ اور تفصیل کے ساتھ انجام دیتے ہیں اور جب وہ کہتے ہیں کہ نقاد لوگ پڑھتے وڑھتے بالکل نہیں تو زیادہ تر درست معلوم ہوتا ہے۔

پھر بھی، خامہ بگوش کو ایک سنجیدہ اور ذمّے دار نقاد قرار دے کر انھیں اردو زبان کے ممتاز ناقدین کی مشہور یا بدنامِ زمانہ برادری میں شامل کرنا، ان کی تمام غیر سنجیدگیوں اور غیر ذمّے داریوں کے ہوتے ہوئے، ناقدین کے علاوہ خود ان کے ساتھ بھی بے انصافی ہوگا۔ خصوصاً جب تک پڑھنے والے خود ہی کوئی ایسا فیصلہ نہ کریں۔ میرا کام تو یہی تھا کہ پچھلے تین برس کے دوران انھوں نے جو کچھ لکھا، اس کا ایک چنیدہ مجموعہ☆ چند ایک گزارشات کے ساتھ پیش کر دوں۔ باقی رہا ان پر میرا مجوزہ مقالہ تو وہ بہتر ہے کہ میری اپنی ہی کتاب میں شامل ہو۔ یہ تو خامہ بگوش کا مال ہے جسے قومی تحویل میں لیا جا سکتا ہے، دوبارہ نجی ملکیت میں جانے سے پہلے۔

مظفر علی سیّد

☆ مظفر علی سیّد صاحب نے خامہ بگوش کے کالموں کا جو انتخاب کیا تھا، اُس کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے اسے دو (تقریباً مساوی) جلدوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ دونوں جلدیں ہمارے ادارے سے ''سخن در سخن'' اور ''سخن ہائے ناگفتنی'' کے نام سے بیک وقت شائع کی جا رہی ہیں۔ (ادارہ)

Marfat.com

Marfat.com

شاعری پر شب خون

شمس الرحمن فاروقی اردو کے اُن چند نقادوں میں سے ہیں جنھیں صحیح معنوں میں رجحان ساز نقاد کہا جاسکتا ہے۔ اِس کی گواہی محمد حسن عسکری بھی دے چکے ہیں، جنھوں نے ایک مرتبہ یہ لکھا تھا کہ حالی کے بعد اردو تنقید فاروقی کے ذریعے ایک نئے معیار سے آشنا ہوئی ہے۔ فاروقی کا مطالعہ حیران کن حد تک وسیع ہے۔ وہ بیک وقت مشرق و مغرب کی ادبی روایات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اُنھیں عروض اور معانی و بیان جیسے بے برکت علوم پر بھی ماہرانہ دسترس حاصل ہے۔

فاروقی ۱۹۶۶ء سے رسالہ ''شب خون'' شائع کر رہے ہیں۔ گزشتہ تین دہائیوں میں اِس رسالے نے جدید ادبی رجحانات کو متعارف کرانے میں اور جدید ادیبوں کی ذہنی تربیت کے سلسلے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ ''شب خون'' رسالہ نہیں ایک تحریک ہے جو اردو ادب میں نئے خیالات و رجحانات کی آب یاری کر رہی ہے۔ جس طرح زلزلے اور سیلاب جیسی آفاتِ ارضی کے متاثرین بے شمار ہوتے ہیں، اُسی طرح ''شب خون'' سے متاثر ہونے والوں کی تعداد بھی شمار سے باہر ہے۔

جدیدیت اور جدیدیوں سے ہماری کوئی ذہنی قربت نہیں ہے۔ ہم پرانے زمانے کے آدمی ہیں۔ ہمیں کسی جدید چیز میں اُس وقت تک کوئی خوبی نظر نہیں آتی جب تک اُس پر قدامت کی گرد جم نہ جائے۔ فاروقی کو بھی ہم نے اسی لیے پسند کیا ہے کہ اُنھیں لکھتے ہوئے ۴۰-۴۵ برس گزر چکے ہیں۔ اپنی ساری قدامت پسندی کے باوجود ہم ''شب خون'' کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ جب کبھی اس کا تازہ شمارہ آتا ہے تو ہم سب کام چھوڑ کر اُس کا مطالعہ کرتے

Marfat.com

ہیں اور مطالعے کے بعد بھی سب کام چھوڑنے پڑتے ہیں کیوں کہ کچھ دنوں تک ہم اِس لائق نہیں رہتے کہ کوئی کام کرسکیں۔ حال ہی میں خوش قسمتی سے ''شب خون'' کے پانچ شمارے ایک ساتھ ملے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دولت ہاتھ آگئی ہو۔ دولت بھی وہ جس کے بارے میں یگانہ نے کہا تھا:

دنیا کا کیا بھروسا، دولت کا کیا ٹھکانا
دولت تو دولت آخر لٹنے کی نوبت آئی

سو اِس دولت کو بے دریغ لٹانے کے لیے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں۔

''شب خون'' کے تازہ شماروں میں سے کسی ایک میں اختر الایمان کا وہ معرکہ آرا انٹرویو بھی شائع ہوا ہے جس میں اُنھوں نے اقبال، فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور دوسرے کئی شاعروں کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ موجودہ زمانے میں بہترین اردو شاعری، پاکستان میں نہیں، ہندوستان میں ہو رہی ہے۔ اختر الایمان کا یہ فیصلہ پاکستانی شاعروں کو ضرور ناگوار گزرے گا اور وہ یہ کہیں گے کہ ہماری شاعری کا مطالعہ کیے بغیر یک طرفہ فیصلہ سنا دیا گیا ہے۔ پاکستانی شاعروں سے گزارش ہے کہ وہ آزردہ خاطر نہ ہوں، اختر صاحب نے جو فیصلہ دیا ہے، اُس کے لیے اُنھیں پاکستانی تو کیا، ہندوستانی شاعری بھی پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ فیصلہ اختر صاحب نے اپنی شاعری کے حوالے سے دیا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ وہ ہندوستان میں رہتے ہیں، اگر وہ بھوٹان کے باشندے ہوتے تو پھر بہترین شاعری وہیں ہو رہی ہوتی۔

ہم نے چوں کہ انصاف پسند طبیعت پائی ہے، اِس لیے ہمارے دل نے یہ گواہی دی کہ اختر الایمان جیسا بڑا شاعر غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا۔ اُنھوں نے جو کچھ فرمایا ہے یقیناً اُس کی بنیاد ٹھس دلائل پر نہیں ٹھوس حقائق پر ہوگی۔ صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ہم نے ''شب خون'' کے پانچوں شماروں میں شائع شدہ غزلوں کو بغور پڑھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ اختر صاحب مطالعے کے بغیر جس نتیجے پر پہنچے تھے، مطالعے کے بعد ہمیں اُسی نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ اب ہماری بھی یہی رائے ہے کہ بہترین اردو شاعری ہندوستان ہی میں ہو رہی ہے، پاکستانی شاعر خواہ مخواہ اپنا اور پڑھنے والوں کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اُنھیں چاہیے کہ ہندوستانی شاعروں کی تقلید کر کے اپنی شاعری کو بہتر بنائیں، ورنہ کوئی دوسرا آبرو مندانہ شغل اختیار کریں تاکہ سیاست کی طرح شاعری بھی ہمارے ملک کی رسوائی کا باعث نہ ہو۔

ہندوستان کی اردو شاعری کی خصوصیات کو ایک کالم میں سمیٹنا ممکن نہیں، اِس کے لیے

Marfat.com

دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ لہٰذا ہم مختصر طور پر خاص خاص خوبیوں ہی کی طرف اشارہ کریں گے تاکہ کسی حد تک یہ اندازہ ہو سکے کہ ہندوستان کی اردو شاعری، پاکستان کی شاعری سے کیوں بہتر ہے اور عالمی ادب کی سطح پر اُس کی الگ شناخت کیا ہے۔ ہم بحث کے دوران صرف شعر درج کریں گے، شاعروں کے نام نہیں بتائیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ شاعروں کے صرف نام ہی الگ الگ ہیں، باقی سب کچھ یعنی کلام اور اندازِ بیان وغیرہ ایک ہی جیسا ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری غزلیں کسی ایک شاعر نے لکھ کر بہت سے شاعروں کے نام سے چھپوا دی ہیں۔ ممکن ہے یہ ''ایک شاعر'' خود شمس الرحمٰن فاروقی ہوں۔ اُنھوں نے بڑا زرخیز ذہن پایا ہے۔ ان کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ ۲۰۔۲۵ مختلف ناموں سے غزلیں لکھ دیں بہرحال اصل شاعر کوئی بھی ہو، ہم شاعری کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔

سب سے پہلی چیز جو قاری کو اپنی گرفت میں لیتی ہے، وہ یہ ہے کہ شاعر کو نئے نئے مضمون سوجھتے ہیں یا یوں کہیے کہ خاصی دور کی سوجھتی ہے۔ مثلاً:

کپڑوں کی الماری کھولے کھڑا ہوں میں حیران
نہیں ہے میرے ناپ کا اس میں کوئی ایک لباس

کسی دوسرے کے کپڑوں کی الماری کھول کر حیران ہونا ایک بالکل نیا خیال ہے۔ اپنے کپڑوں کی الماری شاعر نے شاید اِس لیے نہیں کھولی کہ اُس میں سوائے خلعتِ سخن کے کچھ نہیں تھا لہٰذا رقیب کے کپڑوں کی الماری کھول لی۔

حیران ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر کو چونکنے کا بھی شوق ہے۔ اِس شوق کی خاطر فرماتے ہیں:

رستے میں کچھ تو ایسا ہو جس کو دیکھ کے چونک پڑیں
اور نہیں تو دو کاریں ہی آپس میں ٹکرا جائیں

جس راستے میں کاروں کے ٹکرانے کا منظر دیکھنے کی خواہش ہے، وہ راستہ کالج کی طرف جاتا ہے کیوں کہ جناب شاعر ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔ ایک شعر میں انھوں نے اپنا تعلیمی نصاب بھی بتا دیا ہے:

مرے کالج میں ہر جانب ترا ہی نام لکھا ہے
تجھے ہی پڑھنے جاتا ہوں تجھے ہی پڑھ کے آتا ہوں

جو شاعر دورانِ تعلیم ایسے عمدہ شعر کہہ سکتا ہو، تعلیم کی تکمیل کے بعد تو معلوم نہیں وہ کیا قیامت ڈھائے گا لیکن قیامت ڈھانے سے پہلے بھی اُسے کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ مثلاً

Marfat.com

دو کام تو اِس شعر میں بتائے ہیں:

نیش نو صوتیات میں رکھ دو
مغز جاں بھی دوات میں رکھ دو

ایک کام یہ بھی ہے:

چھت پر کبوتروں کے لیے صرف تھوڑی دیر
مشکل سہی یہ کام مگر کر لیا کریں

شاعر کو صرف کبوتروں سے نہیں، ہر طرح کے پرندوں سے دلچسپی ہے۔ یہاں تک کہ اُسے باتوں اور مداراتوں کے پرندے بھی اڑتے دکھائی دیتے ہیں:

وہ تواضع بھری باتوں کے پرندے
اُن لبوں پر مداراتوں کے پرندے

پرندوں کے علاوہ اُسے ہر طرح کے جانوروں سے بھی بے حد لگاؤ ہے اور اُس نے اُن کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔ خصوصاً کتوں، بلیوں اور خچروں پر تو ایسے ایسے شعر کہے ہیں کہ اُنھیں بلا تکلف میر کے بہتر نشتروں کا جواب سمجھنا چاہیے:

شہر کے سڑتے ہوئے ملبے میں
بلی کیا ڈھونڈ رہی ہے دیکھو

☆

گھورتا کیا ہے کمینے کتے
سونگھتا کیا ہے کمینے کتے
سوچنے کا کوئی علاج نہیں
سوچتا کیا ہے کمینے کتے

☆

نسب پر ہم نشینوں کے ہے اتراتا
شجاعت جنگ کا خچر معاذ اللہ

ہم تو سمجھتے تھے کہ پرندوں، چرندوں، درندوں اور گزندوں پر بہترین شاعری ساقی فاروقی نے کی ہے کیوں کہ خود اُس کا شمار ادبی گزندوں میں ہوتا ہے لیکن اب معلوم ہوا، ساقی کو اُس مقام تک پہنچنے میں خاصا وقت درکار ہوگا جہاں تک دبستانِ شب خون والوں کی رسائی ہے۔

غزل میں صرف اُڑتے ہوئے پرندے اور بھاگتے ہوئے جانور ہی دکھائی نہیں

Marfat.com

دیتے، چلتی ہوئی جوتیاں اور کھڑی ہوئی بسیں بھی نظر آتی ہیں:

جرابیں اور جوتیاں تو اُس کی
سفر کے سارے عذاب میرے

☆

سب تھکے ہارے لوگوں کو گھر چھوڑ کر
اپنے اڈوں پہ خالی بسیں رہ گئیں

دوسرا شعر علامتی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے جس کا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ شعروں کو خالی بسیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ مسافرانِ معانی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں۔

شب خونیوں نے غزل کا دامن اتنا وسیع کردیا ہے کہ اِس میں مشرق سے مغرب تک، جنوب سے شمال تک اور جنوری سے دسمبر تک کی ہر چیز سما گئی ہے:

تمام رنج و ملال اوڑھے
بدن نے سب ماہ و سال اوڑھے
میں مغربوں کے سفر میں مشرق
جنوب میں بھی شمال اوڑھے
لہو میں سلگا کے جون موسم
ملے دسمبر میں شال اوڑھے

اِن شعروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شال میں لپیٹ کر بھی اچھے شعر کہے جاسکتے ہیں۔

اوڑھنے بچھونے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی شاعری میں ایسے فلسفیانہ مسائل پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے جن پر پوری پوری کتابیں لکھی جاسکتی ہیں، لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ صرف دو دو مصرعوں میں بات مکمل کردی گئی ہے:

محفل میں رات گیت یہ تھا مجھ سے وصل کر
گویا مغنّیہ کو کوئی کام ہی نہیں

☆

گناہ کھلتے ہیں میرے کس کس آنگن میں
یہ بھید مرنے سے پہلے مجھے بتانے ہیں

مگر شاعر یہ بھید نہیں بتائے، البتہ اس نے ایک اور اہم راز فاش کردیا ہے:

گئے سال کی روشنی پی گیا
نئے سال کا یہ کیلنڈر سیاہ

Marfat.com

غزل میں پینے پلانے کا ذکر کوئی نئی بات نہیں، نئی بات یہ ہے کہ غیر مردّف غزل میں قافیہ مصرعے کے آخر میں آتا ہے، لیکن مندرجۂ بالا شعر میں شروع میں آیا ہے۔ ''گئے'' اور ''نئے'' سے دونوں مصرعوں کا آغاز صوتی اعتبار سے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی شاعر غزل کی ہیئت میں نئے نئے تجربے کر رہے ہیں۔ ممکن ہے آگے چل کر قافیہ مصرعوں کے درمیان لایا جائے۔

ہم نے اب تک جو شعر پیش کیے ہیں، وہ موضوعات اور لفظیات کے اعتبار سے جدید ترین ہیں لیکن اِس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ زبان کی شاعری نہیں کی جارہی۔ کی جارہی ہے اور نوح ناروی سے بہتر کی جارہی ہے:

کہیں بھی تو کیا اس سے سب جان کر کے
اڑا دے گا ایران توران کر کے
سمجھ بوجھ کے خوب پہچان کر کے
وہ جب مجھ سے بولا تو انجان کر کے

اسی طرح سہلِ ممتنع کی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں مثلاً:

پسِ دیوار سایہ، دھوپ ننگی
چلے آؤ میاں کوئی نہیں ہے

سہلِ ممتنع کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اگر شعر کو نثر میں تبدیل کیا جائے تو لفظوں کی ترتیب میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ اِس شعر کو نثر میں تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ یہ پہلے ہی نثر میں ہے۔ معنوں میں تبدیلی کی بھی گنجایش نہیں ہے کیوں کہ تبدیلی اُسی چیز میں کی جاسکتی ہے جو موجود ہو۔

ہم نے اوپر جو شعر مثالاً درج کیے ہیں، ایسے ہی تقریباً دو سو شعر اور بھی ''شبِ خون'' کے پیشِ نظر شماروں میں موجود ہیں، لیکن اِن شعروں کو نقل کرنے کے لیے جس حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے، اُس کے فقدان کے سبب ہم نقل نویسی کی مزید خدمت انجام دینے سے معذور ہیں، لہٰذا پاکستانی شاعروں سے گزارش ہے کہ وہ تھوڑے لکھے کو بہت جانیں اور یہ مان لیں کہ ہندوستان میں پاکستان سے بہتر شاعری ہو رہی ہے۔

(۱۶ر مارچ ۱۹۹۵ء)

130266

Marfat.com

جوش اور فتنۂ آخر الزماں

(۱)

گزشتہ فروری میں جوش ملیح آبادی کے انتقال کو پورے تیرہ برس ہو چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اِن تیرہ برسوں میں ایک دن کے لیے بھی اُنھیں فراموش نہیں کیا گیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اُنھیں اُس طرح یاد نہیں رکھا گیا جس طرح رکھا جانا چاہیے تھا۔ اُنھیں فراموش نہ کرنے کا ثبوت یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند ہی میں نہیں بلکہ متعدد دوسرے ممالک میں بھی اُن کے بارے میں ادبی اجتماعات ہوئے، مشاعرے منعقد کیے گئے، رسالوں کے خاص نمبر شائع کیے گئے، متعدد کتابیں لکھی اور مرتب کی گئیں۔ ظاہر ہے کہ جس شاعر کے لیے اتنا بہت کچھ کیا جائے، اُس کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ اُسے فراموش نہیں کیا گیا۔ لیکن جہاں تک جوش کو یاد رکھنے کا تعلق ہے تو اِس کا اندازہ صرف اور صرف ایک ہی بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جس شاعر کے لیے اتنا کچھ کیا جارہا ہے، اُسے کوئی پڑھتا بھی ہے؟ افسوس کہ اس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ اتنی ہنگامہ آرائیوں کے باوجود گزشتہ تیرہ برسوں میں جوش کی شاعری کی حیثیت ''ورقِ ناخواندہ'' سے زیادہ نہیں رہی۔ دو سال پہلے تک اُن کا کوئی مجموعہ بازار میں دستیاب نہیں تھا۔ پروین شاکر اور احمد فراز کی کتابوں کے جعلی ایڈیشن اُن کی آنکھوں کے سامنے چھپتے رہے لیکن جوش کے کلام کا کوئی جعلی تو کیا، اصلی ایڈیشن بھی چھاپنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں کاپی رائٹ ایکٹ کی وجہ سے کسی نے اُن کے کلام کا جعلی ایڈیشن نہیں چھاپا، مگر ہندوستانی ناشر تو اس پابندی سے آزاد ہیں۔ وہاں بہت سے پاکستانی مصنّفین کی کتابیں اُن کی اجازت کے بغیر چھاپی جاتی ہیں مگر جوش کا کوئی شعری مجموعہ نہیں چھاپا گیا۔

Marfat.com

جوش کے کلام کا خاصا حصہ غیر مطبوعہ ہے۔ اُنھوں نے جیتے جی بہت کوشش کی کہ یہ سارا کلام چھپ جائے لیکن دو مختصر مجموعوں ''الہام و افکار'' (۱۹۶۶ء) اور ''نجوم و جواہر'' (۱۹۶۷ء) کی اشاعت سے آگے بات نہ بڑھی۔ اُن کی وفات کے گیارہ برس بعد غیر مطبوعہ کلام کا ایک حصہ ''محراب و مضراب'' کے نام سے جنگ پبلی کیشنز نے چھاپا۔ سات سو صفحات کے اِس ضخیم مجموعے میں بلاشبہہ جوش کا بہترین کلام شامل ہے لیکن صرف ایک ہزار کی تعداد میں چھاپا جانے والا یہ مجموعہ اشاعت کے دو سال بعد بھی خریداروں کا منتظر ہے۔ ناشر نے بڑے پیانے پر اِس مجموعے کی تشہیر کی۔ اخبار ''جنگ'' کے تمام ایڈیشنوں میں اِس کے اشتہار چھاپے گئے، اِس کے باوجود نتیجہ مایوس کن نکلا تو اِس مجموعے کو تقریباً نصف قیمت پر فروخت کرنے کا اعلان کیا گیا لیکن پھر بھی گاہکوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ حالؔی نے اپنے نایاب مال کی دکان شہر سے الگ کھولی تھی، اِس لیے گاہک بے خبر رہے مگر جوش کا کلام تو بیچ بازار میں موجود ہے مگر گاہک اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

آخر اس بے التفاتی کا سبب کیا ہے؟ ہم نے یہ سوال استاد لاغر مراد آبادی کے سامنے رکھا تو اُنھوں نے فرمایا: جوش اپنے زمانے کے مقبول ترین شاعر تھے لیکن اُن کی شاعری اپنے زمانے کی مقبول ترین شاعری نہیں تھی۔ بظاہر اِن دونوں باتوں میں تضاد نظر آتا ہے، لیکن یہ تضاد نہیں، نہایت تلخ حقیقت ہے۔ جوش ایک طرح دار اور پُرکشش مجلسی شخصیت کے مالک تھے، وہ جس محفل میں ہوتے اپنی پُرکشش حرکات و سکنات سے جانِ محفل بن جاتے۔ وہ اپنی شاعری ہی سے نہیں، گفتگو سے بھی محفل پر چھا جاتے۔ حاضرینِ محفل کے دلوں کو مسخر کرنے کے لیے اُن کی گفتگو بھی اتنی ہی موثر ہوتی جتنی کہ اُن کی شاعری۔ محفل ختم ہو جاتی تو جوش کی گفتگو کی طرح اُن کی شاعری بھی اپنا کوئی دیرپا نقش حاضرینِ محفل کے دلوں پر نہ چھوڑتی۔

جوش کی زبان سے اُن کی شاعری جتنی دل کش لگتی تھی، کاغذ پر وہ اتنی دل کش نظر نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے کہ اُن کا پڑھنے کا انداز، اُن کی شاعری میں ایک ایسی وقتی معنویت اور طلسمی کیفیت پیدا کر دیتا تھا جس سے سننے والے مسحور ہو جاتے تھے۔ کاغذ پر جوش کی شاعری اُن کے اندازِ خواندگی سے محروم ہو کر عام قاری کے لیے کشش کا باعث نہیں رہتی۔ ہاں لغت نویسوں کے لیے یہ ایک بہت بڑا خزانہ ہے جس سے الفاظ کے استعمال کی مثالیں فراوانی سے مل جاتی ہیں۔ جوش کے کلام سے صحتِ زبان کی سند تو لی جاسکتی ہے، ذہنی صحت مندی کے لیے کوئی رہ نمائی نہیں ملتی۔ لفظوں کی یلغار اتنے بڑے پیانے پر ہوتی ہے کہ معانی دب کر رہ جاتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا مقصد صرف یہ ہے کہ انبار در انبار

Marfat.com

لفظ جمع کر دیے جائیں۔

استاد لاغر مراد آبادی نے اپنی اِن باتوں کی وضاحت کے لیے جوش کی ایک نظم ''یادش بخیر'' کا حوالہ دیا جو ۱۹۷۰ء کے قریب لکھی گئی تھی۔ نظم کا موضوع جوانی کے زمانے کی یادیں ہیں۔ استاد نے اِس نظم کا یہ بند سنایا:

بینِدی، عبیر، ابٹن، کاجل، گلال، افشاں
سلما، ستارہ، لچکا، مہندی، اگر، چراغاں
چھاگل، چغانہ، چھم چھم، رم جھم، رباب، ریحاں
شب ہائے باد و باراں، لب ہائے بوسہ خواہاں
یہ طرفہ کارواں تھا، ہم میرِ کارواں تھے
یہ داستاں ہے جب کی، جس وقت ہم جواں تھے

اور کہا: اِس بند کے پہلے تین مصرعوں میں اٹھارہ لفظ یکجا کر دیے گئے ہیں جن میں سے کچھ نسوانی سنگھار سے تعلق رکھتے ہیں، کچھ لباس کی آرایش سے، کچھ آوازوں اور سازوں کے نام ہیں، باقی لفظ قافیے کی مجبوری کی وجہ سے استعمال کیے گئے ہیں۔ اِن لفظوں سے جوانی کے زمانے کی کوئی تصویر سامنے نہیں آتی، ہاں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعر کا حافظہ بہت اچھا ہے کہ اُسے بعض ایسے لفظ بھی یاد ہیں جن کے معانی سے اُن کے ننانوے فی صد قاری ناواقف ہیں۔ آج کتنے لوگ جانتے ہیں کہ چھاگل پاؤں کے ایک زیور کا نام ہے اور چغانہ ایک خاص قسم کے باجے کو کہتے ہیں۔ جوش کا کمال یہ ہے کہ وہ مردہ لفظوں کو زندہ کر دیتے ہیں اور اگر مردہ لفظوں کو زندہ کر دینا ہی شاعری ہے تو پھر جوش بلاشبہہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ ویسے جوش کی شاعری سے اُن کی نثر بہتر ہے جس کا ثبوت اُن کے خطوط کا وہ مجموعہ ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے اور جسے راغب مراد آبادی نے مرتّب کیا ہے۔

استاد لاغر مراد آبادی کے مذکورۂ بالا خیالات بڑی حد تک ''معاصرانہ چشمک'' کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ استاد نے جوش کے ساتھ کئی مشاعروں میں شرکت کی، جوش کے سامنے کس کا چراغ جلا جو اُن کا جلتا، لہٰذا اب استاد جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے ہیں۔ معاصرانہ چشمک کے لیے دو شاعروں کا ہم عمر ہونا ضروری نہیں ہے۔ غالب کی وفات کے سترہ برس بعد یگانہ پیدا ہوئے لیکن اُنھوں نے غالب کے خلاف جو کچھ لکھا، اِس انداز سے لکھا جیسے ساتھ کے کھیلے ہوں۔ استاد کو حق ہے کہ وہ جوش کے بارے میں جو چاہیں کہیں اور ہمیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ استاد سے اختلاف کریں لہٰذا اپنے اِس حق کو استعمال کرتے ہوئے ہم عرض کریں گے کہ

Marfat.com

جوش کی شاعرانہ عظمت سے اِس وجہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج کا قاری اُن کو پڑھتا نہیں ہے۔ قاری کو متوجہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جوش کے کلام کا ایک ایسا انتخاب شائع کیا جائے جس میں اُن کی وہ تمام تخلیقات شامل ہوں جو شاعرِ شباب اور شاعرِ انقلاب دونوں کی نمایندگی کرتی ہوں۔

استاد لاغر مراد آبادی کا یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ جوش کی نثر اُن کی شاعری سے بہتر ہے۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ جوش کی نثر ویسی ہی ہے جیسی اُن کی شاعری۔ اگر اُن کی شاعری سے وزن خارج کردیا جائے یا نثر کو موزوں کردیا جائے تو دونوں میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ یہ رائے رکھنے والے مثال میں جوش کی مقفّٰی نثر پیش کرتے ہیں۔ جیسے ''یادوں کی برات'' میں سروجنی نائیڈو کے بارے میں یہ اقتباس:

بادۂ شاعری سے سرشار
گروہِ شعرا کی غم گسار
آزادی کی شیدائی
محبت کی شہنائی
لہجے میں ارغنون
باتوں میں افسون
میدانِ جنگ میں جھانسی کی رانی
ایوانِ امن میں قرۃ العین ثانی
تقریر میں نغمۂ آبِ حیواں
آواز میں جمالِ ماہِ کنعان

اِس نثر میں صرف وزن کی کمی ہے، باقی وہ سب کچھ موجود ہے جو جوش کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ ''یادوں کی برات'' میں اِس قسم کی نثر اِس کثرت سے ملتی ہے کہ انیسویں صدی کے مصنّفین کی کتابیں جوش کی کتاب کے سامنے خانۂ بے چراغ دکھائی دیتی ہیں۔

استاد نے ''خطوطِ جوش'' کی تعریف کی ہے۔ ہم نے یہ کتاب دیکھی تو اِس میں ایک اور ہی تماشا نظر آیا۔ ''یادوں کی برات'' میں انتہائی فحش کلمات کی جگہ نقطے ملتے ہیں لیکن ''خطوطِ جوش'' میں تو نقطوں کی جگہ بھی انتہائی فحش کلمات نظر آتے ہیں۔ کتاب کے دیباچہ نگار، مشہور نقاد محمد علی صدیقی نے اس فحاشی کو یہ کہہ کر مستحسن ٹھہرایا ہے کہ اِس کے ذریعے ہمارے

Marfat.com

معاشرے کی اجتماعی جرأت کی سطح بلند ہوگی۔ ساتھ ہی یہ اقرار بھی کیا ہے کہ ''زیرِنظر خطوط میں بعض مقامات تو ایسے بھی آئے ہیں کہ اگر اِن خطوط کو شرطیہ طور پر تنہائی میں بھی پڑھا جا رہا ہو تو نگاہ احتیاط ادھر ادھر گھوم جاتی ہے کہ مبادا...''۔ لفظ ''مبادا'' کے بعد کے نقطے اصل تحریر کا جزو ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ محمد علی صدیقی یہ کہہ رہے ہیں کہ اِن خطوں کے بعض حصے ایسے ہیں جنھیں تنہائی میں پڑھتے ہوئے بھی قاری کو یہ خوف رہتا ہے کہ یہ غلط کام کرتے ہوئے کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ حیرت ہے کہ جن خطوں کی وجہ سے معاشرے کی اجتماعی جرأت کی سطح بلند ہوتی ہے، اُنھیں خطوط کی بنا پر قاری کی انفرادی جرأت کی سطح کم سے کم تر ہو جاتی ہے۔

جرأت کی بات چلی ہے تو یہ بتا دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ یہ کتاب جب چھپ کر بازار میں آئی تو ناشر کو احساس ہوا کہ اِس میں بہت سے حصے ایسے ہیں جو ناقابلِ اشاعت ہیں اور آزادیِ تحریر کا نرم سے نرم معیار بھی اُن کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اِس مشکل پر قابو پانے کے لیے سیاہ مارکر سے کچھ جملوں کا منھ کالا کر دیا گیا مگر بات نہ بنی کیوں کہ اور بھی بہت سے جملے اِس ''سیاہ کاری'' کے طالب تھے۔ اگر ایسے تمام جملوں پر سیاہی پھیری جاتی تو ایک چوتھائی کتاب کسی گناہ گار کے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ ہو جاتی۔ آخر ناشر نے اپنی سرخروئی کا حل یہ نکالا کہ کتاب کے شروع کے چار صفحات الگ کر دیے جن میں اُس کا نام آتا تھا۔ اب یہ کتاب اِن چار صفحوں کے بغیر چوری چھپے فروخت ہو رہی ہے۔ گویا اجتماعی جرأت کی سطح بلند کرنے والے خطوں نے قاری کے ساتھ ساتھ کتب فروشوں کی جرأت کو بھی زائل کر دیا ہے۔

جوش اپنی شاعری میں بہت بڑے نقیبِ انقلاب اور معلمِ اخلاق نظر آتے ہیں مگر اُن کی عملی زندگی اِس کے برعکس تھی۔ وہ ایک خوش باش انسان تھے۔ محفلوں میں گفتنی و ناگفتنی کا اور خطوں میں نوشتنی و نانوشتنی کا فرق کرنا اُن کے لیے ناممکن تھا۔ زیرِنظر مجموعے میں اُن کے بعض خط بلاشبہ انشائے عالیہ کا نمونہ ہیں مگر ایسے خط بھی بہت سے ہیں جن سے خود اُن کے اور اُن کے مکتوب الیہم کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں ہوتی۔ ایسے خطوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ تہذیبی قدریں جن کی پامالی پر جوش زندگی بھر آنسو بہاتے رہے، خود اُن کے اپنے ہاتھوں پامال ہو رہی ہیں۔ اِن خطوں میں لکھنے والے کی ذہنی سطح ایک اوباش اور ذہنی مریض کی سطح سے مختلف نظر نہیں آتی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جوش زندہ ہوتے تو کیا وہ ان خطوں کو اصل صورت میں شائع کرنے پر آمادہ ہو جاتے؟ ہمارا خیال ہے کہ وہ اس پر راضی نہ ہوتے۔ مرتب نے اِن خطوں کو مطابقِ اصل شائع کر کے جوش صاحب کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ اُن کی عزت خاک میں ملا دی ہے۔ یہ دوستی کے پردے میں دشمنی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

(۱۱رمئی ۱۹۹۵ء)

Marfat.com

(۲)

مولوی عبدالحق نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہماری ہر علمی و ادبی کوشش جو قلم سے نکل کر کاغذ پر آتی ہے، غیروں کے لیے ہے اور یہ سمجھ کر لکھتے ہیں کہ غیروں کے ہاتھوں میں جائے گی اور غیروں ہی کی نظریں اُس پر پڑیں گی۔ اِس لیے خیال کو صاف صاف لکھنے کی بجائے طرح طرح کے پیرائے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن جب انسان خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی اور ہر شے کے متعلق جیسا کہ اُس کا خیال ہوتا ہے، صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوسکتا۔

مولوی عبدالحق نے جو کچھ لکھا ہے، اگر اُس کی روشنی میں ''خطوط جوش'' مرتبہ راغب مراد آبادی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اِن خطوں سے جوش کی سیرت کا جو اندازہ ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعے سے ممکن نہیں ہے۔ خطوں کے اِس حمام میں جوش ہی نہیں، اُن کے مکتوب الیہم بھی ایک ہی جیسے نظر آتے ہیں۔ حیرت ہے کہ اِن خطوں میں جوش جیسے بظاہر شایستہ اور نستعلیق انسان نے وہ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے جس کی توقع صرف، جوش ہی کے الفاظ میں، باورچی ٹولے کے سوقیوں سے ہوسکتی ہے۔ اِن خطوں میں فحش گالیاں ہی نہیں ہیں، جوش نے اپنے بعض مشاغل اور خواہشات کی ایسی لفظی تصویریں بھی پیش کی ہیں جنھیں دیکھ کر تصویریں بنانے والے کی ذہنی صحت مشکوک نظر آتی ہے۔ بعض خطوں میں تو القاب و آداب سے لے کر خط کے خاتمے تک ایسے ایسے الفاظ دکھائی دیتے ہیں جو شاید ابھی لغات میں بھی شامل نہیں کیے گئے۔ اگر کبھی فحش الفاظ کا کوئی لغت تیار کیا گیا تو اِس کے لیے یہ خطوط ہی بنیادی مواد فراہم کریں گے۔

اِن خطوں میں جوش ایک ایسے جاگیردار کی صورت میں نظر آتے ہیں جس نے اپنی ساری زندگی مرغ بازی، بٹیر بازی اور اِسی قسم کی دوسری بازیوں میں گزاری ہو اور پھر ۸۵ برس کی عمر میں:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

کے مصداق یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ اُس کا دل ابھی تک جوانوں کی سی خواہشوں اور آرزوؤں سے لبالب ہے۔ لیکن یہ سب کچھ بوڑھے چونچلوں کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اگر ایک ۸۵ برس کا بوڑھا، ۷۰۔۷۱ برس کے دوسرے بوڑھے کو ''اقلیم جمال کی شہزادی، مس... مراد آبادی'' کہہ کر مخاطب کرے تو یہ بد مذاقی بوڑھے چونچلوں ہی میں شمار کی جائے گی۔

Marfat.com

زیرِ نظر کتاب میں جو خطوط شامل ہیں، اُن میں سے ایک بھی خط ایسا نہیں ہے جس میں کوئی علمی و ادبی نکتہ بیان کیا گیا ہو، یا کوئی ایسی بات لکھی گئی ہو جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ خطوط اپنے عہد کی ایک بہت بڑی ادبی شخصیت کے ہیں۔ ایک صاحب نے کوئی علمی قسم کا سوال کیا، اُس کے جواب میں جوش لکھتے ہیں: ''تحقیقی نوعیت کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے مجھے اپنی طبیعت پر بہت جبر کرنا پڑتا ہے۔ یہ معاملات میرے مزاج کے بالکل برعکس ہیں''۔

جو معاملات جوش کے مزاج کے عین مطابق ہیں، اُن پر اُنھوں نے خوب کھل کر اور جم کر لکھا ہے۔ مثلاً حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم کے سیکریٹری کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: ''میں، علم، زبان اور ادب کا، جیسا کہ پاک و ہند میں سب کو معلوم ہے، ایک نہایت پرانا خادم اور پندرہ کتابوں کا مصنف ہوں ... میری خواہش ہے کہ ہندوستان نے جس طرح میری ادبی خدمات کے اعتراف میں مجھ کو ایک بڑا خطاب اور ایک بہت بڑا بنگلہ دیا تھا، اُسی طرح، خطاب تو نہیں لیکن مجھ کو تاحیات رہنے کے واسطے ایک شایستہ بنگلہ عنایت کیا جائے... میں نے ۲۶/جولائی ۱۹۶۳ء کو اِس سلسلے میں اپنے صدرِ قوم سے بھی گفتگو کی تھی جس سے متاثر ہو کر اُنھوں نے مجھے یہ ہدایت کی ہے کہ میں آپ کے ذریعے سے اپنے اِس مقصد کو حاصل کرلوں''۔

عام طور پر مشہور ہے کہ جوش نے صدر پاکستان محمد ایوب خان سے ملاقات کے دوران اُن کو کچھ ''نصیحتیں'' کی تھیں جن کی وجہ سے وہ ناراض ہوگئے تھے لیکن مذکورہ خط کی اشاعت سے یہ راز کھلا کہ جوش نے کچھ مراعات حاصل کرنے کے لیے ملاقات کی تھی!

کتاب میں دو چار خط ایسے بھی ہیں جن سے جوش کے دردناک گھریلو حالات سامنے آتے ہیں۔ اُنھیں اِس کا بے حد قلق تھا کہ اُن کی اولاد اور پھر اولاد کی اولاد تعلیم یافتہ نہیں۔ بیٹا جوش سے بدگمان تھا اور اُن سے الگ رہتا تھا۔ اسلام آباد سے وہ اپنے بیٹے کو جو کراچی میں مقیم تھا، لکھتے ہیں: ''میرے بیٹے میرے پاس آ کر رہو۔ میری تنہائی پر رحم کرو۔ جب تمھیں یاد کرتا ہوں، دل سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ بیٹا تم اِس قدر بے رحم کیوں ہو گئے ہو اور کراچی میں پڑے خود کو گھلائے ڈال رہے ہو۔ خدا کے واسطے میری پکار سنو اور میری آغوش میں آجاؤ''۔

بیٹا اور بیٹی نہ صرف جوش سے الگ رہتے تھے، آپس میں بھی ایک دوسرے سے ناخوش تھے۔ اِن حالات کی وجہ سے جوش کی زندگی خاصی پریشانیوں میں گزری۔ اُنھوں نے ایک مرتبہ اپنی بیٹی کو لکھا: ''میری بشاشتوں، میری سرور طلبیوں اور میرے قہقہوں سے دھوکا نہ کھاؤ۔ بیٹی! میں اندر سے اس قدر زخمی ہوں جس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا''۔

Marfat.com

ایک طرف تو یہ درد ناک صورتِ حال ہے اور دوسری طرف جوش یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ''میں شاید مرتے دم تک بوڑھا نہیں ہوں گا۔ میر انیس نے فرمایا ہے کہ جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی، لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ جو آ کے نہ جائے وہ جوانی دیکھی''۔

اِسی غلط فہمی کی وجہ سے جوش نے ۸۵ برس کی عمر میں بیس برس کی لڑکی سے بزعمِ خود معاشقہ کیا۔ خطوط جوش کے عقبی سرورق پر جلی حرفوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ اِس کتاب میں جوش کے انیسویں عشق کا دستاویزی ثبوت پیش کیا گیا ہے، حالاں کہ اِس سلسلے میں سب سے اہم دستاویزی ثبوت ''یادوں کی برات'' کا تیسرا ایڈیشن ہے جس کے آخر میں ۱۷ صفحات میں اِس ''واردات'' کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور پھر ''مضراب و محراب'' کے ساتویں حصے کی تیس سے زیادہ نظمیں اور پچاس کے قریب رباعیات بھی اِسی ''فتنۂ آخر الزماں'' سے متعلق ہیں۔ اِن سب تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوش جسے معاشقہ سمجھتے ہیں، وہ دراصل اُن کی خوش فہمی یا غلط فہمی تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ ایک تیز و طرار لڑکی نے ملازمت حاصل کرنے کے لیے جوش صاحب کو وسیلہ بنایا۔ وہ اُن سے ملتی رہی اور اُن پر یہ ظاہر کرتی رہی کہ وہ بھی اُن کی طرح ''مبتلائے دردِ دل'' ہے، لیکن جب اُس کا مقصد پورا ہو گیا اور جوش کی کوششوں سے ملازمت مل گئی تو اُس نے جوش کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ اِس کا ثبوت جوش کے ایک خط سے ملتا ہے جس میں انھوں نے پہلے تو یہ لکھا: ''جس وقت آپ کو بینک کی ملازمت دلائی تھی، اُس وقت بھی مجھ کو علم تھا کہ آپ محبت سے توبہ فرما چکی ہیں''۔ اِس کے بعد ''فریقِ ثانی'' پر دلچسپ الزامات عائد کیے جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ آپ نے مجھ کو اپنی ملازمت کی اطلاع تک نہ دی۔

۲۔ میری بیوی کے انتقال پر تعزیت نہیں فرمائی۔

۳۔ مجھے یہ لکھا کہ جب آپ کو فون کرتا ہوں تو لوگ اعتراض کرتے ہیں، حالاں کہ باہر سے جو فون آتا ہے، اُس سے بینک کا بل نہیں بڑھتا، جب میرے فون سے بینک پر بار نہیں پڑتا اور بل مجھے ادا کرنا پڑتا ہے تو پھر اعتراض کس بات کا؟ شاید کوئی رقیب یا کئی رقیب ہوں جن کو میرا فون کرنا زہر لگتا ہے۔

۴۔ آپ نے مجھ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں لاہور آؤں تو آپ چھپ کر میرے پاس آجائیں گی۔

۵۔ اسٹیشن پر ملنے آئیں تو مجھے موقع نہ دینے کے واسطے، ایک عدد سہیلی کو بھی ساتھ

Marfat.com

لیتی آئیں۔

۶۔ میں نے درخواست کی ساہیوال تک چلنے کی، آپ یہ سنتے ہی میرے کمپارٹمنٹ سے بھاگ کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہوگئیں۔

۷۔ آپ نے مجھے پورے ایک سال تک خط نہیں لکھا۔ خود نہ سہی، کسی سہیلی سے لکھا کر بھیج دیتیں، مگر آپ نے اِس کی قطعی پروا نہیں کی۔

اِن الزامات کو پڑھ کر جوش پر ہنسی بھی آتی ہے اور رحم بھی۔ وہ کیسے معصوم آدمی تھے کہ ابتدائے عشق ہی میں فریقِ ثانی کو ملازمت دلا دی، کچھ دن سبز باغ دکھاتے رہتے تو اور کچھ نہ سہی ''محراب ومضراب'' کے ساتویں حصے میں بہت سی نظموں اور رباعیوں کا اضافہ تو ہوسکتا تھا۔

کلام کی بات چلی ہے تو نمونۂ کلام بھی دیکھ لینا چاہیے:

اللہ ری یہ حرفِ انکشافی، آنکھیں
جھکتی، اٹھتی، رواں، زِحافی آنکھیں
احساس پہ گر پڑی کڑک کر بجلی
کافر نے اٹھائیں یوں غلافی آنکھیں

جوش، فریق ثانی پر جب کوئی نظم یا رباعی لکھتے تھے تو اُسے ضرور سناتے تھے۔ سنا ہے کہ جب اُنھوں نے مذکورہ رباعی سنائی تو اس فتنہ آخر الزماں نے کہا: ''جوش صاحب! آپ میری تعریف اِس طرح کرتے ہیں جیسے مجھے لفظوں سے سنگسار کر رہے ہوں''۔

(۱۸ رمئی ۱۹۹۵ء)

Marfat.com

نقاد اور لذّتِ دُشنامِ یار

جو ادیب ایک سے زیادہ اصنافِ ادب میں رواں ہوتے ہیں، وہ قارئین کے لیے بہت سے مسئلے پیدا کر دیتے ہیں۔ شعر کہنے والے نقادوں کی تنقید پر طرحی غزل کا گمان گزرتا ہے اور اُن کی شاعری تنقید کی طرح خشک نظر آتی ہے۔ ہمارے ایک محقق دوست مزاح نگاری کا بھی شوق رکھتے ہیں، اُن کی تحقیقی کتاب پڑھتے ہوئے ہنسی آتی ہے اور مزاحیہ مضامین دیکھ کر آنکھیں نم ناک ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر اُن معدودے چند اہلِ قلم میں سے ہیں جو بیک وقت افسانہ نگار، نقاد اور ادبی مورخ ہیں لیکن تینوں حیثیتیں اتنی مستحکم ہیں کہ کیا مجال کوئی اُن کی تنقید کو افسانہ و افسوں کا نام دے سکے یا اُن کی ادبی تاریخ کو طبع زاد کہانیوں کا مجموعہ کہہ سکے۔ وہ جب بھی کسی موضوع پر لکھتے ہیں، ڈوب کر لکھتے ہیں۔ بلکہ قاری کو بھی گلے گلے ڈبو دیتے ہیں۔ اِس سے زیادہ اِس لیے نہیں ڈبوتے کہ اُسے سانس لینے میں تکلیف نہ ہو۔ محاورتاً دم گھٹنے کا احساس تو دوسری بات ہے، لیکن اِس میں ڈاکٹر صاحب کا کوئی قصور نہیں، بعض محاورے اپنا محلِ استعمال خود تلاش کر لیتے ہیں جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔

سنجیدہ ادبی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب اپنے مُنھ کا مزہ بدلنے کے لیے اور ادبی حریفوں کے مُنھ کا مزہ خراب کرنے کے لیے ادبی معرکہ آرائیوں میں بھی مصروف رہتے ہیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ متنوّع علمی و ادبی کاموں میں منہمک رہنے کے باوجود وہ اتنا وقت کہاں سے نکال لیتے ہیں کہ معرکہ آرائیوں کا حق بھی خوش اسلوبی سے ادا ہو جاتا ہے۔ استاد لاغر مراد آبادی یہی مضمون ایک دوسرے انداز سے باندھتے ہیں۔ فرماتے ہیں، ڈاکٹر سلیم اختر سزاوارِ ستایش ہیں کہ معرکہ آرائیوں میں مصروف رہنے کے باوجود علمی و ادبی کاموں کے لیے

Marfat.com

بھی وقت نکال لیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ اردو کی ایک مقبول ترین کتاب کے مصنف ہیں۔ ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کے سولہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اردو میں اگر حسنِ اتفاق سے کسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپ جائے تو اُس کا مصنف زمین پر پاؤں نہیں رکھتا۔ مگر ڈاکٹر صاحب سراپا انکسار ہیں، وہ زمین پر پاؤں ایسی شائستگی سے رکھتے ہیں کہ کتاب کے اگلے ایڈیشن کے لیے زمین خود بخود ہموار ہوتی جاتی ہے بلکہ اِس سال تو زمین ایسی ہموار ہوئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ادب کے ساتھ زبان کی بھی ایک مختصر ترین تاریخ لکھ ڈالی ہے۔

یہ تاریخ اِسی مہینے شائع ہوئی ہے اور اِس کا نام ہے ''اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ''۔ اس کتاب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اِس کے ناشر مشہور اور طرح دار شاعر افتخار عارف ہیں۔ مقتدرۂ قومی زبان کی سربراہی پر فائز ہونے کے بعد اُنھوں نے مقتدرہ کی طرف سے سب سے پہلے یہی کتاب شائع کی ہے اور اِس پر ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا ہے جو بذاتِ خود تاریخی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ افتخار عارف نے اس سے پہلے کسی علمی کتاب پر کبھی کوئی دیباچہ نہیں لکھا تھا۔ دیباچہ لکھا ہے تو یقیناً کتاب پڑھی بھی ہوگی لہٰذا یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ افتخار عارف نے علمی کتابوں کا مطالعہ شروع کردیا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب صاحبِ مطالعہ، صاحبِ کتاب بن جائیں گے یعنی خود بھی علمی کتابیں تصنیف فرمانے لگیں گے۔ ظاہر ہے مقتدرۂ قومی زبان کا صدر نشین ہونے کے بعد صرف شاعری پر گزر اوقات نہیں ہوسکتی۔ اگر افتخار عارف واقعی علمی کام کرنے میں سنجیدہ ہوں تو ہم اُنھیں مشورہ دیں گے کہ مشہور لغت ''فرہنگِ پیشہ وراں'' کو وہ مرتب کر ڈالیں اور اس میں اُن پیشوں کی اصطلاحات بھی شامل کرلیں جو پچھلے آٹھ دس برسوں میں وجود میں آئے ہیں۔ مثلاً نئے پیشہ وروں کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جو حکومت کے بدلتے ہی علمی، ادبی اور ثقافتی اداروں پر قابض ہو جاتا ہے۔ ان پیشہ وروں کی اصطلاحات مذکورہ لغت کے نئے ایڈیشن میں شامل ہوں گی تو اُس کی افادیت بڑھ جائے گی۔ لغت کو مقبولِ عام بنانے کے لیے پیشہ وروں کی تصاویر بھی شامل کی جاسکتی ہیں اور اس مناسبت سے لغت کا نام ''اصطلاحاتِ پیشہ وراں باتصویر'' رکھا جاسکتا ہے۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو اس لیے زبانِ قلم پر آگیا کہ افتخار عارف خود جدید ادب میں جملۂ معترضہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جملۂ معترضہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ جس متن میں شامل ہوتا ہے اُس کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔ سو اِس جملۂ معترضہ کی وجہ سے ڈاکٹر سلیم اختر کے بارے میں جو کچھ لکھا جارہا ہے، اُس کی معنویت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

Marfat.com

ہاں تو ذکر تھا ڈاکٹر صاحب کی تازہ ترین تصنیف ''اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ'' کا۔ اردو زبان کی اب تک جو تاریخیں لکھی گئی ہیں، وہ سب عالموں کے لیے ہیں۔ عام آدمی کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی تاریخ عام آدمی کے لیے ہے۔ عالموں کے لیے نہیں ہے۔ وہ اِسے ہرگز نہ پڑھیں کیوں کہ اُن کے پلے بھی کچھ نہیں پڑے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے ایسے لسانی مسائل پر بحث نہیں کی جو عام آدمی کی سمجھ سے بالا ہوتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کے آغاز اور ارتقا کی پوری تاریخ نہایت آسان زبان میں بیان کردی ہے۔ یہ زبان کس طرح وجود میں آئی اور کون کون سے مرحلے طے کر کے اپنی موجودہ صورت تک پہنچی، اِس کا برصغیر کے کس کس خطے اور کن کن زبانوں سے گہرا تعلق ہے، اِس میں اصلاح کی کون کون سی تحریکیں ظہور پذیر ہوئیں، اِس کے رسم الخط کی خصوصیات کیا ہیں، اِس میں لغات و قواعد پر کیا کیا کام ہوا ہے، تراجم اور وضعِ اصطلاحات کی نوعیت کیا رہی ہے، غرض کہ تمام ضروری سوالات کا جواب اِس مختصر کتاب میں مل جاتا ہے۔ ایسی عمدہ کتاب لکھنے پر ہم ڈاکٹر سلیم اختر کو اور چھاپنے پر افتخار عارف کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ مبارک باد کے مستحق ہم بھی ہیں کہ اِس کتاب کو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا، یہ سوچ کر کہ جو گزرنی ہے ایک ہی بار گزر جائے۔ ہمیں کون سا ایم اے اردو کا امتحان دینا ہے جو ہم اِس کتاب کے مطالب ذہن نشین کرنے کے لیے متعدد نشستوں میں اِس کا مطالعہ کرتے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی ایک ادائے دلبرانہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں ڈاکٹر انور سدید کا ذکر بہ انداز دیگر ضرور کرتے ہیں لیکن اِس کتاب میں اُنھوں نے اشارتاً کنایتاً بھی ڈاکٹر انور سدید کو نہیں چھیڑا۔ حالاں کہ کتاب میں جہاں متروکات کی بحث ملتی ہے، وہاں بآسانی اُن کے ذکرِ خیر کی گنجایش نکالی جاسکتی تھی۔ شاید اِس کی وجہ یہ ہے کہ اب ڈاکٹر سلیم اختر کو احساس ہوگیا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید سے لڑنے جھگڑنے کا کوئی فائدہ نہیں اور اگر کوئی فائدہ ہے بھی تو وہ ڈاکٹر انور سدید کو پہنچتا ہے کیوں کہ وہ ایک سطر کے مذاق کے جواب میں پورا ایک سنجیدہ مقالہ تحریر فرما دیتے ہیں۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کو معاف کردینے کے بعد ڈاکٹر سلیم اختر نے خود اپنے بارے میں وہی کچھ کہنا شروع کردیا ہے جو ڈاکٹر انور سدید اُن کے متعلق کہا کرتے تھے۔ ماہنامہ ''قومی زبان'' کے تازہ شمارے میں ڈاکٹر سلیم اختر کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے، اُس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ فرماتے ہیں: ''تنقید میں دونوں ممالک (پاکستان اور ہندوستان) تقریباً یکساں ہیں۔ دونوں طرف برے نقادوں کی اکثریت ملتی ہے۔

Marfat.com

بُرے نقادوں میں اپنا نام میں خود گنوائے دیتا ہوں، باقی کی اسم شماری آپ خود کرلیں''۔

ہمارے خیال میں کسی ادیب کو اِس حد تک انکسار سے کام نہیں لینا چاہیے کیوں کہ ہم جیسے سادہ لوح پڑھنے والے ایسی باتوں کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔

مذکورہ انٹرویو میں تنقید ہی کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی فرمایا: ''ہر لکھنے والا نقاد سے سند بھی چاہتا ہے اور اُسے برا بھلا بھی کہتا ہے ... جب تک نقاد غیر مشروط تعریف کرے، غیر مدلل مداحی کرے تو ادیب خوش، لیکن جہاں ادبی، فکری، فنی یا تخلیقی نوعیت کا وہ کوئی اعتراض اٹھائے تو وہ طعنوں اور دشنام طرازیوں کا ہدف بننے لگتا ہے''۔

ڈاکٹر صاحب نے بالکل درست فرمایا۔ بے چارے نقاد کی جان ہمیشہ مشکل میں رہتی ہے۔ دشنام طرازیوں کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ یگانہ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا:

پڑھتا ہے کوئی شعر، کوئی سُنتا ہے
منھ تکتا ہے کوئی، کوئی سر دُھنتا ہے
ارباب نگاہ رولتے ہیں موتی
اندھا نقاد کنکری چُنتا ہے

تنقید نگار ہونے کا ڈاکٹر صاحب کا ذاتی تجربہ بھی خاصا اندوہ ناک ہے۔ وہ ہر سال ادب کا جائزہ لکھتے ہیں، اس کے حوالے سے فرماتے ہیں: ''میرے بہت سے ادبی تنازعے، مخالفتیں، دشمنیاں اور دشنام طرازیاں، ان سب کا ایک بڑا سبب یہ سالانہ ادبی جائزے ہیں۔ جس شاعر کا ذکر جائزے سے رہ گیا وہ ہمیشہ کے لیے دشمن ہو گیا۔ لطیفہ یہ ہے کہ بعض ایسے لوگ بھی ناراض ہو جاتے ہیں جن کا ذکر تو ہوتا ہے اور تعریف بھی ہوتی ہے لیکن بقدرِ ظرف نہیں ہوتی، یوں وہ اس تعریف سے بھی ناخوش رہتے ہیں ... معاصرین کے بارے میں قلم اٹھانا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے اور میں گزشتہ پندرہ برسوں سے بھڑوں کے مختلف چھتوں میں ہاتھ اور پاؤں بلکہ سارا وجود ہی ڈالے بیٹھا ہوں۔ آپ میرے جائزوں کو برا کہیں لیکن مجھے بھڑوں سے کٹوانے کی داد تو دیں''۔

اسے بھی ڈاکٹر صاحب کا انکسار ہی سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے اپنے بڑے بڑے ادبی و علمی کاموں کی کبھی داد طلب نہیں کی اور داد طلب کی بھی تو بھڑوں سے کٹوانے کی۔ مگر کسی نقاد کے لیے یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ اس موقع پر نقاد کے بارے میں یگانہ ہی کا ایک مصرع یاد آرہا ہے:

موذیوں کے موذی کو فکرِ نیشِ عقرب کیا

Marfat.com

ڈاکٹر صاحب نے ادب اور کالم نگاری کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ہمارے کالموں پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ یہ ہماری عزت افزائی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ خامہ بگوش کا حال یہ ہے:

اُسے جب سے ذوقِ شکار تھا
اسے زخم سے سروکار تھا

ڈاکٹر صاحب نے ہمارے ساتھ انصاف نہیں فرمایا۔ ہمیں شکار کا شوق ہے نہ زخم لگانے کا یارا۔ ہم تو زخم خوردگانِ ادب میں سے ہیں کہ ہمیں کالم لکھنے کے لیے وہ کتابیں بھی پڑھنی پڑتی ہیں جنھیں خود مصنفین اور افتخار عارف کے سوا کوئی اور نہیں پڑھتا۔ افتخار عارف کو اِس لیے پڑھنی پڑتی ہیں کہ بطور صدر نشین مقتدرہ قومی زبان، یہ اُن کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ وہ اعزازی صدر نشیں نہیں ہیں کہ صرف تقریروں پر گزارا کریں۔

(۲۹ر جون ۱۹۹۵ء)

Marfat.com

رُونمائی یا رُسوائی

حالات کی ستم ظریفی سے کراچی کی ادبی و تہذیبی زندگی تقریباً ختم ہوگئی ہے، وہ تو خدا بھلا کرے سحر انصاری کا کہ تھوڑی بہت ادبی چہل پہل جو نظر آتی ہے، اُنھیں کے دم سے ہے۔ اگر وہ کتابوں اور ادیبوں کی رونمائیوں میں شرکت نہ کریں تو دنیائے ادب خانۂ بے چراغ ہو جائے۔ کراچی کی کسی ادبی تقریب کا سحر انصاری کے بغیر تصور کرنا ایسا ہی ہے جیسے خود سحر انصاری کا تصور کسی ادبی تقریب کے بغیر کیا جائے۔ خدا نے اُنھیں علم کے ساتھ توانائی بھی بہت دی ہے کہ وہ ایک ایک دن میں کئی کئی تقریبیں بھگتا دیتے ہیں۔ کچھ دن ہوئے کہ اُنھوں نے ایک ہی دن میں اور ایک ہی وقت میں تین تقریبوں میں مقرر، مہمان خصوصی اور صدر کی حیثیت سے شرکت کی۔ وہ اِس طرح کہ پہلی تقریب میں سب سے پہلے تقریر کر کے دوسری تقریب میں چلے گئے اور وہاں کچھ دیر مہمان خصوصی بن کر بیٹھے۔ پھر یہاں سے اُٹھ کر تیسری تقریب میں کرسیِ صدارت کو رونق بخشی۔ آخری تقریب میں آٹھ بجے رات تک بیٹھے رہے۔ اس سے زیادہ اِس لیے نہ بیٹھ سکے کہ انھیں ٹیلی ویژن کے ایک مذاکرے میں شرکت کرنی تھی اور اس کے بعد ریڈیو کے ایک مشاعرے میں اپنا کلام سنانا تھا۔ دوسرے روز کے اخبار سے معلوم ہوا کہ یہ سب مصروفیات سہ پہر کے بعد کی تھیں۔ دن میں دس بجے اُنھوں نے ایک اخبار کے دفتر میں ایک مذاکرے میں شرکت کی تھی اور بارہ بجے ایک مقامی کالج کے مباحثے میں منصف کے فرائض انجام دیے تھے۔

حق یہ ہے کہ سحر انصاری جیسا کوئی دوسرا مستعد، فعال اور مصروف ادیب ہم نے تو کیا، خود سحر انصاری نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ خدا نظر بد سے بچائے، اُن کی ذات ادبی پاور ہاؤس

Marfat.com

کا درجہ رکھتی ہے کہ اُن سے اہلِ ادب توانائی حاصل کرتے ہیں۔

سحر انصاری کو خدا نے جو مقبولیت بخشی ہے، وہ کم ادیبوں کے حصے میں آتی ہے۔ وہ نوجوانوں ہی میں نہیں، بزرگوں میں بھی بے حد مقبول ہیں۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ استاد لاغر مراد آبادی نے وصیت کر رکھی ہے کہ اُن کی نماز جنازہ سحر انصاری سے پڑھوائی جائے۔ ہم نے اِس کا سبب پوچھا تو استاد نے فرمایا: ''میں اپنی کسی کتاب کی رونمائی کا یا اپنے ساتھ شام منانے کا قائل نہیں ہوں۔ شامِ غریباں کو تو آنا ہی آنا ہے، اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ یہ شام سحر انصاری کی امامت میں منائی جائے''۔ ہم نے عرض کیا: ''انصاری صاحب صرف زندہ ادیبوں کی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں''۔ فرمایا: ''پھر تو اُنھیں میری تقریب میں ضرور آنا چاہیے کیوں کہ مرنے کے بعد میرا شمار زندۂ جاوید ادیبوں میں ہوگا''۔

اِس کے جواب میں ہم نے استاد کو انھیں کا ایک شعر سنایا:

اس غلط فہمی پہ زندہ ہیں جنابِ لاغر
بعد مرنے کے اُنھیں یاد کرے گی دنیا

اور عرض کیا، ایک طرف تو آپ اپنے آپ کو زندۂ جاوید ادیب کہتے ہیں اور دوسری طرف آپ کو اِس میں شبہہ ہے کہ دنیا مرنے کے بعد آپ کو یاد رکھے گی۔ کیا یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں؟ فرمایا: ''ہر چیز اپنی ضد ہی سے پہچانی جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کل مجھے کوئی یاد نہیں کرے گا لہٰذا میں اِس غم کو غلط کرنے کے لیے اپنا شمار زندۂ جاوید ادیبوں میں کرتا ہوں۔ اِسی طرح میں کتابوں اور ادیبوں کی رونمائیوں کے خلاف ہوں لیکن اِن تقریبوں کے گل سرسبد سحر انصاری کا تہ دل سے قدر دان ہوں اور اُنھیں ادب کے حق میں ایک نعمت سمجھتا ہوں''۔

ہم نے اِس کا سبب پوچھا تو استاد نے فرمایا: ''سحر انصاری نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور پرانے پاپیوں کی دل جوئی نہایت عمدگی سے کرتے ہیں۔ جس ادیب کی تقریب میں جاتے ہیں، اُس کے عظیم ہونے میں کوئی کسر رہ جاتی ہے تو اُسے اپنی تقریر یا مقالے سے پورا کر دیتے ہیں۔ کبھی کسی کے بارے میں کوئی سخن گسترانہ بات خود کہتے ہیں نہ کسی دوسرے مقرر کو کہنے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ جس تقریب میں شریک نہ ہوں، وہ تقریب، تقریب رسوائی بن جاتی ہے۔ یقین نہ آئے تو قمر علی عباسی کے نئے سفر نامے ''نیل کے ساحل'' کی جو تقریب ہوئی تھی، اس کی روداد پڑھ لیجیے''۔

یہ کہہ کر استاد نے اخباروں کے ایک پلندے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: 'یہ اخبار لے جایئے اور قمر علی عباسی کے صبر و تحمل کی داد دیجیے کہ وہ کیا سننے کی توقع رکھتے تھے اور اُنھیں

Marfat.com

کیا کچھ سننا پڑا''۔

ہم نے جلسے کی روداد پڑھی تو چودہ طبق روشن ہوگئے۔ ہمیں یقین نہ آیا کہ کوئی شخص فائیو اسٹار ہوٹل کے بھاری اخراجات برداشت کر کے وہ کچھ سن سکتا ہے جسے سننے کے لیے گرہ سے کچھ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تقریب کے ہر مقرر نے قمر علی عباسی کے بارے میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ تمام مقرر پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق صاحبِ تقریب کی فن کتاب سازی سے دلچسپی کو تاراج کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اورتو اور ڈاکٹر اسلم فرخی جیسے مرنجاں مرنج عالم نے بھی یہ فرمایا کہ عباسی کے سفر نامے پڑھنے والا جہاں دیدہ بن جاتا ہے۔ اِس جملے کا مطلب سمجھنے کے لیے چوں کہ ایک خاص حد سے زیادہ پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے، اِس لیے تقریبِ رونمائی کے پورے مجمع میں، بشمول جناب صدر، کوئی بھی ڈاکٹر اسلم فرخی کی ژرف نگاہی کی داد نہ دے سکا۔ ڈاکٹر صاحب نے گلستان سعدی کی ایک حکایت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ حکایت اُس زمانے کی ہے جب دربار شاہی میں سیّدوں، حاجیوں اور شاعروں کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ ایک شخص نے جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھا، اپنے آپ کو بیک وقت سیّد، حاجی اور شاعر کی حیثیت سے مشہور کر کے دربار شاہی تک رسائی حاصل کی اور بادشاہ کی مدح میں قصیدہ پڑھ کر عزت و دولت حاصل کی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص سیاح تو ہے لیکن سیّد، حاجی اور شاعر نہیں ہے۔ دربار میں اُس نے جو قصیدہ پڑھا تھا، وہ بھی کسی اور شاعر کے دیوان سے اُڑایا تھا۔ بادشاہ نے سزا دینے کے لیے اس سیاحِ روسیاہ کو اپنے دربار میں طلب کیا اور اُس سے کہا: ''اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہو''۔ اُس نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

اگر راست می خواہی از من شنو
جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ

اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سچی بات سننا چاہتے ہو تو مجھ سے سنو، جس نے دنیا دیکھی ہوتی ہے، وہ جھوٹ زیادہ بولتا ہے۔ بادشاہ یہ سن کر ہنسا اور کہا چوں کہ اس شخص نے زندگی میں پہلی بار سچ بولا ہے، اس لیے میں اسے معاف کرتا ہوں۔

اِس حکایت کو ذہن میں رکھا جائے تو ڈاکٹر اسلم فرخی کے جملے کی معنویت واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی اُنھوں نے یہ فرمایا، سفرنامہ نگار تو جہاں دیدہ تھا ہی، اُس کے سفرنامے پڑھنے والے بھی جہاں دیدہ بن جاتے ہیں۔

ایک اور مقرر نے یہ عجیب بات کہی کہ قمر علی عباسی ہر سال دو بار مختلف ممالک کا سفر

Marfat.com

کرتے ہیں اور ہر چھ ماہ بعد ایک سفرنامے کی تقریبِ رونمائی منعقد کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ اپنا اصل کام چھوڑ کر یہ کام کیسے کرتے ہیں اور سال میں دو مرتبہ عالمی سفر کی اجازت اُنھیں کیسے مل جاتی ہے۔

معترض کا اشارہ اِس طرف ہے کہ عباسی ایک ذمہ دار سرکاری افسر ہیں، جب وہ سال میں چھ مہینے سفر کریں گے اور باقی چھ مہینے سفرنامہ لکھیں گے تو سرکاری فرائض کس طرح انجام دیں گے؟ ہمارے نزدیک یہ اعتراض درست نہیں۔ قمر علی عباسی بہرحال اُن سرکاری عمال سے بدرجہا بہتر ہیں جو اپنا اصل کام بھی نہیں کرتے اور کسی بے اصل کام میں مصروف بھی نہیں رہتے۔ عباسی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ کم از کم سفر کرنے اور سفرنامے لکھنے میں تو اپنے آپ کو مشغول رکھتے ہیں۔

پی آئی اے کے سربراہ نے اپنی تقریر میں کہا: ''عباسی کا سفرنامہ چوں کہ مصر کے بارے میں ہے، اِس لیے اگر وہ اِس کی تقریب رونمائی اہرام مصر کے قریب منعقد کرانا چاہیں تو انھیں اور ان کی اہلیہ کو پی آئی اے کی طرف سے سفری سہولت مہیا کی جاسکتی ہے''۔

خوشی کی بات ہے کہ پی آئی اے مصنّف اور اُن کی اہلیہ کو سفری سہولت مہیا کرے گا مگر یہ دونوں وہاں اکیلے جا کر ایک دوسرے کی رونمائی تو کر سکتے ہیں، کتاب کی رونمائی کیسے کریں گے۔ اِس کارِ خیر کے لیے کچھ مقررین اور سامعین کی بھی ضرورت ہوگی۔ پی آئی اے کو چاہیے کہ اِس مقصد کے لیے پورا ایک جہاز مہیا کرے تاکہ عباسی کے ساتھ اُن کے ہم جیسے قدردان بھی اہرامِ مصر دیکھ سکیں۔ اگر پی آئی اے نے یہ تجویز منظور کرلی تو پھر ہم مصنّف سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنے ساتوں سفرناموں کے تمام ایڈیشن بھی ساتھ لے چلیں تاکہ تقریبِ رونمائی کی یادگار کے طور پر پتھر کے اہرام کے بالمقابل سفرناموں کا اہرام بھی تعمیر کیا جاسکے۔ آیندہ زمانوں کے سیاح یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ بیسویں صدی کے آخر میں کتابوں سے وہی کام لیا جاتا تھا جو دو ہزار نو سو قبل مسیح میں پتھروں سے لیا جاتا تھا۔

سب سے زیادہ قابلِ اعتراض تقریر، صدر تقریب کی تھی۔ اُنھوں نے چھوٹتے ہی فرمایا: ''اِس تقریب میں ہر شخص کو کسی نہ کسی مقصد کے پیشِ نظر مدعو کیا گیا ہے۔ پی آئی اے کے سربراہ کو اِس لیے بلایا گیا ہے کہ صاحبِ تقریب کو اگلے سفر کے لیے مفت ٹکٹ مل جائے۔ مجھے اِس لیے بلایا ہے کہ میں اطلاعات و نشریات کا وفاقی سیکریٹری ہوں۔ میری وجہ سے ٹی وی پر تقریبِ رونمائی کی کوریج بہترین ہوگی''۔

ٹی وی تو ہم نہیں دیکھتے، البتہ اخبارات کی حد تک ہم گواہی دیں گے کہ آج تک کسی

Marfat.com

کتاب کی تقریبِ رونمائی کی خبریں اور تصویریں اِس شان اور اہتمام سے شائع نہیں ہوئیں۔ مسلسل تین روز تک یہ خبریں اور تصویریں یوں چھپتی رہی ہیں جیسے جرائم کی خبریں اور تصویریں چھپتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ جنگ جیسا اخبار جو اپنے بانی کی برسی کی خبر کو سوئم اور چہلم کی عام خبروں سے زیادہ جگہ نہیں دیتا، اُس نے بھی اطلاعات ونشریات کے وفاقی سیکریٹری کو خوش کرنے کے لیے اِس تقریب کی دو کالمی روداد ۴۶ سینٹی میٹر جگہ میں چھاپی ہے۔

صدرِ تقریب نے یہ بھی کہا: ''ہر سفرنامے میں عباسی کا فوکس ایک یا کئی حسینائیں ہوتی ہیں جو اُن کو خوش آمدید یا خدا حافظ کہتی ہیں اور وہ اُن کے اصرار کے باوجود ہوٹل میں اپنے کمرے کا نمبر نہیں بتاتے۔ پتا نہیں وہ اپنے اِس متن میں ہمیشہ کیسے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ میں بھی اٹھارہ سال کی عمر سے اب تک حالتِ سفر میں ہوں لیکن کبھی کسی حسینہ سے واسطہ نہیں پڑا''۔

موصوف نے صرف سفر کیے ہیں، اِسی لیے حسیناؤں سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اُنھیں چاہیے کہ وہ بھی سفرنامہ لکھیں۔ سفرنامہ لکھنے کے دوران یہ مخلوق قدم قدم پر اِس طرح دامن گیر ہوگی کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ اگر یہ حسینائیں ہوٹل کے کمرے کا نمبر پوچھیں تو انکار نہ کریں۔ اگر ہر پاکستانی عباسی کی طرح اُنھیں مایوس کرتا رہا تو یہ حسینائیں پاکستان کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کریں گی۔ اِس لیے گزارش ہے کہ اپنے کمرے کا نہ سہی، عباسی کے کمرے کا نمبر بتا کر اِن بے چاریوں کو نامرادانہ زیست کرنے سے بچا لیا جائے۔

(۶ر جولائی ۱۹۹۵ء)

Marfat.com

غالب شناس یا غلبچی

غالب شناسی کا آغاز تو مولانا حالی کی ''یادگارِ غالب'' سے گزشتہ صدی میں ہو گیا تھا لیکن غالب پرستی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مشہورِ عالم مقالے ''محاسنِ کلامِ غالب'' سے شروع ہوئی۔ یہ مقالہ پہلی بار مولوی عبدالحق کے رسالے ''اردو'' میں جنوری ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ پھر دیوانِ غالب کے مشہور عالم ''نسخۂ حمیدیہ'' کے ساتھ بطور مقدمہ چھپا۔ اِس کے بعد کتابی صورت میں اِس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ بجنوری نے غالب کی کچھ ایسے مبالغہ آمیز انداز میں تعریف کی کہ غالب کو سوچے سمجھے بغیر پسند کرنا فیشن میں داخل ہو گیا۔ بعض شاعروں نے غالب کے انداز اور غالب کی زمینوں میں غزل گوئی کو شاعری کی معراج سمجھ لیا، اور یہ نہ سوچا کہ بڑے شاعر کی تقلید کا فائدہ بھی بڑے شاعر ہی کو پہنچتا ہے کہ اُس کی خوبیاں، مقلّدین کی خامیوں کی وجہ سے مزید واضح ہو جاتی ہیں۔ مقلّد ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں کہ اُن کے ذاتی جوہر کو ابھرنے کا موقع نہیں ملتا۔ لکھنؤ کے مقلّدینِ غالب سے جب یاس یگانہ چنگیزی کی معرکہ آرائی ہوئی تو یگانہ نے اُن شاعروں کے ساتھ ساتھ خود غالب سے بھی جو ناگفتہ بہ سلوک کیا، وہ ''غالب شکن'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اِس معرکہ آرائی کا حاصل ایک لفظ ''غلبچی'' ہے جو یگانہ نے اُن لوگوں کے لیے وضع کیا جو بلا سوچے سمجھے غالب کی تعریف کرتے ہیں۔ یگانہ نے غلبچیوں کے خلاف اتنا کچھ لکھا کہ بقولِ خود، اُن کا قلم گھس جانے کے باوجود تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ کہتے ہیں:

دل کتنوں کے چھنی ہوئے پتے پتے
بہ بہ گئیں غم سے آنکھیں رِستے رِستے

Marfat.com

کیا لاگ غلبچیوں سے رکھتا ہے قلم
تیز اور ہوا جاتا ہے گھستے گھستے

اب یگانہ رہے نہ مقلدینِ غالب۔ بس غلبچی رہ گئے ہیں جو آئے دن غالب پر کتابیں اور مضامین لکھ لکھ کر غالبیات کی بجائے غلبچیات کے انبار لگاتے رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاک و ہند کے نقادوں اور محققوں کو کسی حکیم نے نسخے میں لکھ کر دے دیا ہے کہ کلام غالب کو سمجھو نہ سمجھو، اُس پر لکھو ضرور۔ نتیجہ یہ ہے کہ جسے لکھنے کے لیے کوئی موضوع نہیں ملتا، وہ غالب پر طبع آزمائی کر کے اپنی سخن فہمی کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑتا ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ محققوں اور نقادوں کی کوششوں سے غالب کو اُس کے گناہوں کی سزا اسی دنیا میں مل گئی۔ اب اُس کا داخلِ جنت ہونا یقینی ہے۔ غالب کو جنت میں جانے کے یوں تو بے شمار فائدے ہوں گے، لیکن سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ محققوں اور نقادوں سے جان چھوٹ جائے گی۔

ایسا نہیں ہے کہ غلبچیوں کے موجودہ دور میں غالب شناس نہیں رہے۔ ہیں مگر بہت کم۔ دو غالب شناس تو ہمارے شہر کراچی ہی میں ہیں۔ ایک افتخار احمد عدنی اور دوسرے آفتاب احمد خاں۔ افتخار احمد عدنی سول سروس سے وابستہ اُن چند افراد میں سے ہیں جنھوں نے دنیاوی جاہ و حشم کی بجائے علم اور ادب سے رشتہ جوڑا۔ سرکاری مصروفیات سے جو وقت بھی بچتا تھا، وہ اُسے پڑھنے لکھنے میں صرف کرتے تھے اور اب جب کہ وہ ملازمت کی زنجیر سے آزاد ہو چکے ہیں، اُن کا سارا وقت علمی مشاغل کی نذر ہوتا ہے۔ تصوف سے بھی اُنھیں علمی و عملی شغف ہے۔ خلوت میں صوفیہ کے ملفوظات پڑھتے ہیں اور جلوت میں قوالوں کے ساتھ عالمِ وجد وحال کی سیر کرتے ہیں۔ قوالی سے اُنھیں اتنی دلچسپی ہے کہ جس سرکاری دفتر کے سربراہ بنے، وہاں کے سارے کلیدی عہدوں پر قوالوں کو بٹھا دیا۔ اُن کے عہدِ اقتدار میں قوال ہمیشہ خوش حال رہے۔ نیازمندی کے باوجود ہم جو بے روزگار رہے تو اِس کی وجہ سوائے اِس کے کچھ اور نہیں کہ ہم قوالی کی محفلوں میں تو شریک رہے، قوالوں کے کسی گروہ میں شامل نہ ہو سکے۔ قوالی سے عدنی صاحب کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے کسی نے خوب کہا تھا کہ اگر ملک کی مزید خوش حالی کے خیال سے کبھی عدنی صاحب وزیرِ اعظم بن گئے تو اُن کی کابینہ قوالوں پر مشتمل ہوگی، اور ان قوالوں پر یہ پابندی ہوگی کہ وہ صرف جمیل الدین عالی کا کلام گایا کریں۔

اردو ہی عدنی صاحب کے گھر کی زبان نہیں ہے، فارسی سے بھی اُن کا تعلق گھریلو نوعیت کا ہے کیوں کہ وہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پرپوتے ہیں۔ وہی شیفتہ جن کا یہ شعر

Marfat.com

ضرب المثل ہے:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

عدنی صاحب کے بچپن میں گھر میں شیفتہ کو دادا جان کہہ کے یاد کیا جاتا تھا چوں کہ جدِّ امجد کا نام لینا سوءِ ادب میں داخل تھا، اِس لیے جب عدنی صاحب اِس شعر کو پڑھتے تھے تو پہلے مصرعے کی یہ صورت ہوتی تھی:

شاید اسی کا نام محبت ہے دادا جان

اِنھیں دادا جان کی سخن فہمی کی داد غالب نے اِس طرح دی ہے:

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

اِس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ غالب کو اپنی شاعری کے باب میں اِس قدر افزائی پر ناز ہے کہ اُس نے اپنے دیوان میں کوئی غزل اُس وقت تک درج نہ کی جب تک اُسے مصطفیٰ خاں شیفتہ نے پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھ لیا۔

اِس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عدنی صاحب کو سخن فہمی اور غالب شناسی کی دولت ورثے میں ملی ہے جس کا بھرپور مصرف اُن کی اُس کتاب میں ہوا ہے جو حال ہی میں ''غالب شناسی کے کرشمے'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اِس کتاب کا ذکر تو ہم بعد میں کریں گے، پہلے ذرا کراچی کے دوسرے غالب شناس آفتاب احمد خان کے بارے میں بتا دیا جائے کہ وہ غالب شناسی کے کس مرتبے پر فائز ہیں۔

آفتاب احمد خان نام کے دو غالب شناس ہیں۔ ایک اسلام آباد میں ہیں جنھیں تحریری غالب شناس کہا جاسکتا ہے۔ اُنھوں نے غالب کے علاوہ ن م راشد اور محمد حسن عسکری پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ کراچی والے آفتاب احمد خان زبانی غالب شناس ہیں۔ اُنھوں نے غالب پر کبھی کچھ لکھا تو نہیں لیکن غالب نے جو کچھ لکھا ہے اور غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ اُنھوں نے نہ صرف پڑھ رکھا ہے بلکہ حافظے میں محفوظ بھی ہے۔ غالب کے صرف شعر ہی نہیں، نثر بھی اُنھیں ازبر ہے۔ اگر اُنھیں چلتا پھرتا غالب انسائی کلو پیڈیا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ شاید مصروفیات کی وجہ سے اُنھیں لکھنے کا موقع نہیں ملتا مگر جب بولنے پر آتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے علم کا دریا بہ رہا ہے اور دریا بھی ایسا جو غالب کے دریائے معاصی کی طرح تنک آب نہیں ہے۔

Marfat.com

آفتاب صاحب بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ سنا ہے کہ سرکاری فائلوں اور میٹنگوں میں وہ غالب کے شعروں سے بہت کام لیتے تھے۔ سرکاری اہل کار غالب کے شعروں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آفتاب صاحب کی آرا سے عموماً اتفاق کر لیتے تھے۔ ۱۹۸۶ء میں دہلی میں انتظامی اصلاحات کے بارے میں جو سارک کانفرنس ہوئی تھی، اُس میں پاکستانی وفد کی قیادت آفتاب صاحب نے ہی کی تھی۔ کانفرنس میں اُنھوں نے اپنی تقریر میں غالب کے شعر اس کثرت سے استعمال کیے تھے کہ اہلِ کانفرنس غالب کو کوئی ایسا مفکر سمجھے جو انتظامی مسائل پر درجۂ استناد رکھتا ہے۔

آفتاب صاحب خود کچھ نہیں لکھتے تو کیا ہوا، اسلام آباد والے اُن کے ہم نام کی کتابوں کو لوگ اُنھیں کی تصانیف سمجھتے ہیں۔ یہ ہمارا چشم دید واقعہ ہے کہ جن دنوں اسلام آباد والے آفتاب احمد خان کی کتاب ''غالبِ آشفتہ نوا'' شائع ہوئی تھی، ایک محفل میں ایک صاحب نے کراچی والے آفتاب احمد خان کو اِس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد دی جو انھوں نے شکریے کے ساتھ قبول کی۔ اُن صاحب نے یہ بھی کہا: ''آپ تو ماشاء اللّٰہ خاصے جوان نظر آتے ہیں لیکن کتاب میں جو تصویر شائع ہوئی ہے، اُس سے آپ کی عمر کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے''۔ اِس موقع پر افتخار احمد عدنی بھی موجود تھے۔ اِس سے پہلے کہ آفتاب صاحب کچھ کہتے، عدنی صاحب نے فرمایا: ''کتاب میں اِن کی جو تصویر شائع ہوئی ہے، وہ پانچ سال بعد کی ہے۔ پانچ سال بعد جب آپ آفتاب صاحب سے ملیں گے تو وہ تصویر ہی کی طرح نظر آئیں گے''۔

آفتاب صاحب کی دوسری شناخت اُن کے قیامت خیز قہقہے ہیں۔ قہقہہ عموماً بات ختم ہونے پر لگایا جاتا ہے مگر آفتاب صاحب گفتگو کا آغاز ہی قہقہے سے کرتے ہیں اور قہقہوں ہی کے درمیان بات مکمل ہو جاتی ہے یا ادھوری رہ جاتی ہے۔ تحریر میں جو کام رموز اوقاف سے لیا جاتا ہے، آفتاب صاحب گفتگو میں وہی کام قہقہوں سے لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن سے گفتگو کرنے والا اپنے آپ کو دیوارِ قہقہہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاید اُسی کو دیکھ کر قہقہہ باری ہو رہی ہے۔

عدنی صاحب کی مذکورۂ بالا کتاب کا انتساب آفتاب صاحب کے قہقہوں ہی کے نام ہے اور کتاب میں بھی اُن کا ذکر اِس کثرت سے ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ عدنی صاحب غالب شناس بڑے ہیں یا قہقہہ شناس۔ خیر یہ تو مذاق کی باتیں تھیں، اصل بات یہ ہے کہ عدنی صاحب کی کتاب غالب کے حوالے سے لکھی گئی کتابوں میں ایک منفرد اضافہ ہے۔ منفرد اِن معنوں میں کہ یہ کوئی روایتی تنقید کی کتاب نہیں ہے جس میں منشیانِ تنقید کی طرح باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے غالب کی شاعری کی خصوصیات نمبروار بیان کی گئی ہوں یا مدرّس

Marfat.com

نقادوں کے انداز میں غالب کے بارے میں ایسی باتیں لکھی گئی ہوں جنھیں پڑھ کر طلبہ کی نصابی ضروریات پوری ہوسکیں۔ بلکہ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ غالب کی شاعری ہماری زندگی میں کس کس طرح اور کن کن مرحلوں میں ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ بظاہر تو یہ کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ہے لیکن اِن مضامین میں وہی معنوی ربط پایا جاتا ہے جو کسی ناول یا داستان کے مختلف ابواب میں ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی ایک باب پڑھ لینے سے پورے ناول یا داستان کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، اُسی طرح اِس کتاب کے مضامین کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنے سے کتاب کے اصل مقصد کو سمجھنا مشکل ہے اور کتاب کا مقصد یہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ غالب کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے کیا کیا فائدے ہیں۔ غالب روزمرہ زندگی کے عام حالات ہی میں ہمارا ساتھ نہیں دیتا بلکہ مشکل سے مشکل لمحات میں بھی ثابت قدم رہنے کا سلیقہ سکھاتا ہے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ گویا غالب کے ساتھ زندگی بسر کی جائے تو نہ صرف بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں بلکہ زندگی بسر کرنے کا سلیقہ بھی آجاتا ہے۔

عدنی صاحب نے اِس کتاب میں اپنے اور دوسروں کے بہت سے دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں اور غالب کے شعروں سے اُن واقعات کا تعلق اِس طرح قائم کیا ہے کہ غالب بھی اِن واقعات کا حصّہ بن جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ڈیڑھ سو سال پہلے کے مصطفیٰ خاں شیفتہ کا ہم عصر نہیں، شیفتہ کے پرپوتے کا معاصر ہے۔ غالب کی اِسی خوبی نے اُسے آفاقی شاعر بنایا ہے کہ وہ ہر دور اور ہر زمانے میں اُسی دور اور اُسی زمانے کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔

عدنی صاحب کا خیال ہے کہ غالب اتنا بڑا شاعر ہے کہ کوئی بھی فرد اُس کی شاعری کے آئینے میں اپنے آپ کو جلوہ گر دیکھ سکتا ہے بہ شرطے کہ وہ دیکھنے والی آنکھ رکھتا ہو۔ اس خیال کی تصدیق اُس مضمون سے بخوبی ہوتی ہے جس کا عنوان ہے: ''عصمت چغتائی اور غالب''۔ عدنی صاحب نے نہایت دلچسپ پیرائے میں عصمت کی زندگی کے ہر اہم واقعے کا جواز غالب کے کلام میں تلاش کیا ہے۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد نذر آتش کیے جانے کی سند بھی اُنھیں غالب کے ہاں مل گئی۔ لکھتے ہیں :

> ''غالب قبر سے اتنا ڈرتے تھے کہ اُنھیں اصرار تھا کہ اگر ڈوب کے مرنا اُن کی قسمت میں نہیں تو اُنھیں مرنے کے بعد جلا دیا جائے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے کیسا واضح شعر کہا ہے۔ قبر سے بچنے کے لیے اُنھیں کافر

Marfat.com

بن جانے میں بھی کوئی باک نہیں تھا:

نعشِ مرا بسوز، کم از برہمن نیم

ننگِ نسوختن نتواں در مزار برد

میری لاش کو جلا دو کہ میں کسی طرح برہمن سے کم نہیں ہوں۔ میں اِس داغ کو قبر میں کیسے لے جاؤں کہ مجھے جلانے کے قابل بھی نہ سمجھا گیا... غالب نے تو صرف جلائے جانے کی تمنا کی تھی، عصمت نے جل کے دکھا دیا''۔

عدنی صاحب کا اسلوبِ بیان نہایت دل کش ہے۔ اُن کے ہاں علم اور طنز و مزاح کی ایسی آمیزش ملتی ہے جو کسی دوسرے لکھنے والے کے ہاں نظر نہیں آتی۔ مشکل سے مشکل اور سنجیدہ سے سنجیدہ مسئلے پر لکھتے ہوئے بھی وہ طنز کے نشتروں اور مزاح کی پھلجھڑیوں سے اپنے اسلوب کو ایسا باغ و بہار بنا لیتے ہیں کہ پڑھنے والا ہنستا بھی جاتا ہے اور بہت کچھ حاصل بھی کرتا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو نثری نظم اور علامتی افسانے کی وجہ سے اردو کے مستقبل سے مایوس ہو چکے ہیں، اُنھیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔

عدنی صاحب نے اِس کتاب میں غالب کی کچھ فارسی غزلوں کے منظوم ترجمے بھی شامل کیے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ شعر کا ترجمہ شعر میں کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی زندہ جانور کو ہلاک کر کے اُس کی کھال میں بھس بھر دیا جائے اور کہا جائے کہ یہ بالکل اصل کے مطابق ہے۔ شعر کا ترجمہ شعر میں کرنا ممکن ہی نہیں۔ اِس کے باوجود عدنی صاحب کے ترجمے اُن لوگوں کے لیے ایک ادبی تحفہ ہیں جنھیں فارسی نہیں آتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ جنھیں فارسی نہیں آتی اُن کے لیے غالب کی اردو شاعری بھی گنبدِ بے در کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ اُسے باہر ہی سے دیکھ سکتے ہیں، اندر داخل نہیں ہو سکتے۔

شاعری کے ترجمے کے حوالے سے ہمیں ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ بلا تشبیہ عرض ہے کہ رفیق خاور مرحوم نے علامہ اقبال کے ''جاوید نامہ'' کا منظوم اردو ترجمہ کیا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کو یہ ترجمہ دیا اور چند روز بعد اُس کی رائے معلوم کی۔ اُس نے کہا: ''یہ ترجمہ اتنا عمدہ ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اقبال نے آپ کے اردو متن ہی کو فارسی میں منتقل کر دیا ہو۔ افسوس کہ اکثر جگہ اقبال نے آپ کے مفہوم کو غلط سمجھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ سارا فارسی ترجمہ غلطیوں سے پُر ہے''۔

(۲۳؍اگست ۱۹۹۵ء)

Marfat.com

نئی شاعری یا فرسودہ شاعری

''شاعری میں مولانا حالی کھڑے ہوگئے اور اُنھوں نے مقدمۂ شعر و شاعری میں قدیم شاعری کے عیوب بتائے اور جدید شاعری کی خوبیاں بتائیں۔ علامہ اقبال نے اِس کے خلاف لکھا لیکن بات آگے بڑھتی گئی۔ مولانا محمد حسین آزاد سے شاعری میں جو سفر شروع ہوا وہ نظم معرّیٰ کی صورت عبدالحلیم شرر اور عظمت اللہ خان سے ہوتا ہوا راشد، میراجی اور فیض تک آیا۔ نظم کے اِس سفر میں خدا کے فضل سے ایک نیا سفر میری ذات سے بھی شروع ہوا۔ اِس میں اور لوگ بھی شامل ہوگئے۔ یہ نیا سفر نثری نظم کا تھا۔ یہ ایک بڑا قدم تھا اور بڑا قدم اٹھانے کے لیے آدمی کو پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔ نثری نظم کم پڑھے لکھوں کا کام نہیں ہے''۔

یہ اقتباس قمر جمیل کے ایک اخباری بیان کا ہے۔ قطعِ نظر اِس سے کہ علامہ اقبال نے مولانا حالی کے خلاف کیا لکھا اور کہاں لکھا، اِس اقتباس میں بنیادی نکات دو ہیں، (۱) محمد حسین آزاد کی طرح قمر جمیل نے بھی اردو نظم میں ایک نئے سفر کا آغاز کیا اور یہ نیا سفر نثری نظم کا ہے۔ (۲) نثری نظم لکھنے کے لیے بہت زیادہ پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔

ہمیں اِن دونوں دعووں سے صد فی صد اتفاق ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ قمر جمیل سے اتفاق کرنے والوں کا شمار بھی پڑھے لکھوں میں ہوتا ہے۔ ہم اختلاف کر کے اِس اعزاز سے محروم نہیں ہونا چاہتے، لیکن استاد لاغر مراد آبادی کو اِن ارشادات سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اردو میں نثری نظم کا رواج موجودہ صدی کی تیسری دہائی میں ہو چکا تھا اور چوتھی دہائی میں کثرت سے نثری نظمیں لکھی گئیں جو اُس دور کے ادبی رسالوں میں محفوظ ہیں۔ استادِ گرامی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ''عالم گیر'' اور ''نیرنگ خیال'' جیسے موقر ادبی جریدوں

Marfat.com

کے کئی شمارے ہمیں دکھائے جن میں مس حجاب اسماعیل (آج کی حجاب امتیاز علی تاج) اور غلام عباس (افسانہ نگار) جیسے نام ور ادیبوں کے دوش بدوش اُس زمانے کے مشہور مگر آج کے غیر معروف بعض ادیبوں کی نثری نظمیں بھی شامل تھیں۔ اُس زمانے میں نثری نظم کو شعر منثور، اشعار منثور یا منثور نظم کہا جاتا تھا۔ نثری نظم لکھنے والوں میں ایک شاعر سحر انصاری رام پوری بھی ہیں، اُن کی ایک نظم ہم نے ''نیرنگ خیال'' میں دیکھی۔ ہمیں بے حد خوشی ہوئی کہ ہمارے دور کے مشہور شاعر اور نقاد سحر انصاری جو کسی زمانے میں اپنے نام کے ساتھ ''رام پوری'' بھی لکھتے تھے، نثری نظم کے بانیوں میں سے ہیں، لیکن استاد لاغر مراد آبادی نے یہ کہہ کر ہماری خوش فہمی دور کردی کہ ''نیرنگ خیال'' کے جس شمارے میں یہ نظم چھپی ہے وہ مارچ ۱۹۳۶ء کا ہے اور ہمارے دور کے سحر انصاری کی پیدائش سے بہت پہلے کا ہے۔

استادِ محترم کا اصرار ہے کہ ہم مس حجاب اسماعیل، غلام عباس اور سحر انصاری رام پوری کی نظموں کے عکس اپنے کالم کے ساتھ شائع کردیں☆ تاکہ نثری نظم کی ''تاریخ'' پر کام کرنے والوں کو کسی درست نتیجے تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ اِن شواہد کی روشنی میں اہلِ نظر خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قمر جمیل کا دعویٰ کہاں تک درست ہے۔

استاد لاغر مراد آبادی کو اِس سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ نثری نظم لکھنے کے لیے شاعر کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اگر ایسا ہوتا تو نثری نظموں سے اِس کا اظہار بھی ہوتا جب کہ بیشتر نثری نظموں سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے، اُس کا ظاہر نہ ہونا ہی بہتر ہے۔ اِس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ میر و غالب سے لے کر اقبال و فیض تک وہ تمام شعرا جنھوں نے نثری نظمیں نہیں لکھیں، اُن کا پڑھا لکھا ہونا مشکوک ٹھہرتا ہے۔

استادِ گرامی کی خدمت میں عرض ہے کہ جب میر و غالب اور اقبال و فیض نے نثری نظم نہ لکھ کر اپنے پڑھے لکھے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اُن کا پڑھا لکھا ہونا ثابت کیا جائے۔

قمر جمیل کے مذکورۂ بالا ملفوظات کا ماخذ ایک مذاکرہ ہے جو روزنامہ ''جنگ'' کے ادبی صفحے پر گزشتہ ہفتے شائع ہوا ہے۔ اِس مذاکرے کا موضوع یہ تھا کہ نئی شاعری مقبول ہے یا نامقبول۔ اِس مذاکرے میں قمر جمیل کے ساتھ رضی اختر شوق، عذرا عباس اور انور شعور شریک تھے۔ یہ سب عہد حاضر کے ممتاز اور منفرد شعرا ہیں اور اُنھوں نے اعلیٰ معیار کی گفتگو کی ہے، حالاں کہ ایسا کم ہوتا ہے کہ کسی جگہ چار شاعر جمع ہوں اور اُن کی گفتگو کا معیار اُن کی شاعری کے معیار سے بلند ہو جائے۔

Marfat.com

گفتگو کا آغاز ادارۂ جنگ کی طرف سے ایک طویل سوال کی صورت میں کیا گیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کیا نئی شاعری کی مقبولیت اور پسندیدگی میں کمی آ رہی ہے؟ ضمنی سوال یہ تھا کہ نثری نظم اور اُس جیسی دوسری نامانوس اصنافِ سخن نے ہمارے ادب کو کیا دیا ہے؟

عذرا عباس نے اِن سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا، ''پہلی بات تو یہ ہے کہ جس شاعری کو نئی شاعری کہا گیا ہے، وہ گزشتہ بیس برس سے تو میں کر رہی ہوں، اتنے برسوں بعد بھی یہ نئی شاعری ہے تو مجھے اِس پر حیرت ہے۔ دوسرے اِس نئی شاعری کے نامقبول ہونے والی بات کا جواب یہ ہے کہ میں جو شاعری کر رہی ہوں اُسے مقبولیت مل رہی ہے، یہ مقبولیت اُس حلقے سے مل رہی ہے جو ادب کو سنجیدگی سے پڑھتا ہے ... میں نے جو کچھ لکھا ہے اُسے کافی حد تک سراہا گیا ہے اور میں مطمئن ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نثری نظمیں لکھتی ہوں اور اِس حوالے سے میں کہہ سکتی ہوں کہ نثری نظم لکھنے والے شعرا کو شاعری کے حوالے سے مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اِن شعرا کی نظموں کے تراجم دنیا کی بڑی زبانوں میں کیے جا رہے ہیں''۔

عذرا عباس کا یہ کہنا درست ہے کہ نئی شاعری اب خاصی پرانی ہو چکی ہے۔ بیس برسوں سے تو وہ لکھ رہی ہیں اور جو نثری غزلیں بزرگ شاعر شہرت بخاری لکھ رہے ہیں اُنھیں بھی نئی شاعری کا حصہ سمجھ لیا جائے تو نئی شاعری کی عمر نصف صدی کے قریب ٹھہرتی ہے اور اگر مس حجاب اسماعیل کی نثری نظم ''الو'' کو نئی شاعری کا نقطۂ آغاز سمجھا جائے تو اِس شاعری کی عمر ۶۴ برس قرار پاتی ہے۔ اتنی پرانی اور کہنہ و فرسودہ بلکہ کرم خوردہ شاعری کو نئی شاعری کا نام دینا ایسا ہی ہے جیسے زنگی کا نام کافور رکھ دیا جائے۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ عذرا عباس جو شاعری کر رہی ہیں، اُس سے وہ نہ صرف خود مطمئن ہیں بلکہ وہ حلقہ بھی مطمئن ہے جو ادب کو سنجیدگی سے پڑھتا ہے۔ مزید خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک ایسے دور میں جب مشاعروں میں شاعر اپنا کلام بھی سنجیدگی سے نہیں پڑھتے، ادب کو سنجیدگی سے پڑھنے والوں کا ایک حلقہ موجود ہے۔ ہماری گزارش ہے کہ اِس حلقے کے اراکین کے نام پتے ظاہر نہ کیے جائیں ورنہ عام شعرا بھی اُنھیں اپنے مجموعے بھیجنے لگیں گے اور اِس طرح ادب کو سنجیدگی سے پڑھنے کا عمل ختم ہو جائے گا۔

عذرا عباس نے یہ اطلاع دے کر دل خوش کر دیا کہ نثری نظموں کے ترجمے دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں ہو رہے ہیں۔ ہماری گزارش ہے کہ اِن زبانوں میں اردو کو بھی شامل کر لیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ جب اِس زبان میں اِسی زبان کی نثری نظموں کے ترجمے کیے جائیں گے تو اِس کا شمار بھی دنیا کی بڑی زبانوں میں ہونے لگے گا۔

Marfat.com

انور شعور نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے تجویز پیش کی کہ نثری نظموں کو مقبول کرنے کے لیے ایسی نشستوں کا اہتمام کیا جانا چاہیے جن میں صرف نثری نظمیں پڑھی جائیں۔ رضی اختر شوق نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی کہ نثری نظم کے مشاعروں کا سلسلہ جاری کیا جانا چاہیے۔ یہ تجویز نہایت معقول ہے مگر اس پر عمل درآمد میں یہ رکاوٹ ہوگی کہ سامعین دستیاب نہیں ہوں گے۔ اگر رضی اختر شوق اور انور شعور نثری نظم کے مشاعروں میں بطور سامعین شرکت کی ذمہ داری قبول کرلیں تو اِس نیک کام کا آغاز ہوسکتا ہے۔ اِس کا ضمنی فائدہ یہ ہوگا کہ ہمارے اِن دونوں شاعروں کو جو مشاعروں میں کلام سنانے کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں، کلام سننے کا تجربہ بھی ہو جائے گا اور یوں اُنھیں معلوم ہو جائے گا کہ کلام سننا، کلام سنانے سے زیادہ ٹیڑھا کام ہے۔

نثری نظم کو مقبول بنانے کے لیے ہم یہ تجویز بھی پیش کرنے کی جسارت کریں گے کہ مجوزہ مشاعروں میں نثری نظمیں ترنم سے سنائی جائیں۔ ترنم شعری عیبوں کی پردہ پوشی ہی نہیں کرتا، خوبیوں کو بھی چمکا دیتا ہے، بشرطے کہ وہ موجود ہوں۔ مشاعروں کی طرح ایسی محافلِ موسیقی بھی منعقد کی جاسکتی ہیں جن میں صرف نثری نظمیں گائی جائیں۔ ان محفلوں کے لیے صرف اُنھیں گلوکاروں کو زحمتِ نغمہ دی جائے جو موزوں کلام کو بھی ناموزوں کر کے سناتے ہیں۔ اِس تجویز پر کچھ عرصے عمل ہوگا تو امید ہے کہ نثری نظموں کو فلمی گانوں جیسی مقبولیت حاصل ہو جائے۔ اِس مقبولیت کو دیکھ کر ممکن ہے ہمارے فلم ساز اپنی فلموں میں گیتوں کی بجائے نثری نظموں کو کام میں لانے لگیں۔ ٹی وی کی وجہ سے ہمارے ملک میں فلمی صنعت رُوبہ زوال ہے۔ نثری نظموں کی وجہ سے امید ہے زوال کی رفتار تیز ہو جائے گی۔ اِس طرح کم از کم ایک شعبۂ زندگی میں ہم دم توڑتی ہوئی بیسویں صدی کی تیز رفتاری کا ساتھ دے سکیں گے۔

مذاکرے میں قمر جمیل نے سب سے زیادہ گفتگو کی۔ اُنھیں ایسا کرنا ہی چاہیے تھا کہ موجودہ دور میں وہ نثری نظم ہی کے سب سے بڑے شاعر نہیں ہیں، تنقید میں بھی اُن کا نام بہت بڑا ہے۔ اسی بڑائی کی وجہ سے وہ بعض اہلِ قلم کے بارے میں ایسی باتیں بھی کہہ دیتے ہیں جو کوئی دوسرا نہیں کہہ سکتا۔ مثلاً غالب اور نظیر صدیقی کے بارے میں اُنھوں نے جو کچھ فرمایا، اُس سے وہ لوگ اتفاق نہیں کریں گے جنھیں آنکھیں بند کر کے اتفاق کرنے کی عادت نہیں ہے۔ غالب کا ذکر کرتے ہوئے قمر جمیل نے کہا: ''انھیں زبردستی آسان لکھنے پر مجبور کیا گیا ورنہ اُن کی شاعری کے رنگ کچھ اور ہی تھے''۔ پوچھنے والے پوچھ سکتے ہیں کہ غالب کو کس نے آسان لکھنے پر مجبور کیا اور مجبور ہو کر اُنھوں نے کیا لکھا۔ معترضین سے عرض ہے کہ یہ کوئی تنقیدی رائے نہیں ہے جو اِس کی وضاحت طلب کی جائے۔ اس جملے کو نثری نظم کا ایک مصرع سمجھ کر

Marfat.com

محظوظ ہونا چاہیے۔

نظیر صدیقی سے قمر جمیل نے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہونے کی کوشش کی ہے اور یہ کہا ہے کہ جس شاعری میں ندرت اور حیرت نہ پائی جائے اُسے نظیر صدیقی کا کلام کہا جاسکتا ہے۔ ندرت کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، لیکن جہاں تک حیرت کا تعلق ہے، وہ نظیر صدیقی کی شاعری میں موجود نہ بھی ہو تو اُس کے پڑھنے والوں میں ضرور پائی جاتی ہے۔ ہمارا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ موصوف کا کلام پڑھتے ہوئے ہمیں اتنی ہی حیرت ہوتی ہے، جتنی نثری نظمیں پڑھتے وقت۔

(۸رفروری ۱۹۹۶ء)

☆ جب یہ کالم ''تکبیر'' میں چھپا تھا تو اِس کے ساتھ اِن نظموں کے عکس شائع کیے گئے تھے۔

Marfat.com

منیر نیازی کی نثری شاعری

بعض دور اندیش اچھے وقتوں میں محنت یا حسنِ اتفاق سے جو کچھ کماتے ہیں، اُس کا کچھ حصہ بچا کر ایسے مالیاتی اداروں کے حوالے کر دیتے ہیں جن سے اُنھیں ماہ بہ ماہ یا مناسب وقفوں سے منافع ملتا رہتا ہے۔ جب یہ لوگ محنت کے لائق نہیں رہتے یا ''حسنِ اتفاق'' کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں تو اِس منافع سے وہ روح و تن کا رشتہ برقرار رکھتے ہیں۔ وہ اپنی دور اندیشی کی داد دیتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ روپے کی قیمت جس تیزی سے گر رہی ہے، اُسی نسبت سے اُن کی اُس رقم کی قوتِ خرید بھی کم ہو رہی ہے جو مالیاتی اداروں کے پاس جمع ہے۔ ماہرینِ معاشیات کا خیال ہے کہ سرمایہ کار کو جو منافع ملتا ہے، وہ منافع نہیں ہوتا، اُس کی اپنی جمع شدہ رقم ہوتی ہے جسے وہ مالِ غنیمت سمجھ کر اپنے تصرف میں لاتا ہے۔ یہی حال ہمارے بعض ادیبوں کا ہے جنھوں نے کسی زمانے میں کچھ کام کی چیزیں لکھ لی تھیں اور اب وہ اُنھیں کی شہرت پر گزارا کر رہے ہیں۔ اُنھیں اِس کا بالکل احساس نہیں کہ اُنھوں نے اچھے وقتوں میں جو ادبی سرمایہ کاری کی تھی، اُس کی قدر و قیمت میں تغیر آ رہا ہے اور ایک دن آئے گا کہ صرف تغیر ہی باقی رہ جائے گا کیوں کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔

ادبی تغیرات کی دنیا میں اِس وقت سب سے بڑا نام منیر نیازی کا ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ ہمارے دور کے اہم ترین شاعروں میں سے ہیں لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب سے اُنھوں نے اپنا کلیات شائع کیا ہے، اُن کی شاعری اِس کلیات سے باہر کہیں نظر نہیں آتی۔ کلیات کو چھپے ہوئے تقریباً دس برس ہو چکے ہیں، اِن دس برسوں میں منیر نے کوئی ایسی نظم یا غزل نہیں لکھی جو کلیات میں شامل کسی نظم یا غزل سے بہتر ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے

Marfat.com

آپ کو دُہرا رہے ہیں اور یہ عمل اُن کے کلیات میں شامل شاعری پر منفی طور پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ منیر کی شہرت کا گراف تو عمودی ہے لیکن شاعری کے معیار کا گراف افقی ہے۔

''بعض لوگوں'' کی اِس رائے سے ہمیں بالکل اتفاق نہیں ہے۔ اول تو یہی بات بے معنی ہے کہ منیر کی شاعری کے معیار کا گراف افقی ہے۔ معترضین کو معلوم ہونا چاہیے کہ آفاقی شاعر کے معیار کا گراف افقی ہی ہو سکتا ہے نہ کہ عمودی۔ رہی یہ بات کہ منیر نے کلیات کی اشاعت کے بعد گزشتہ دس برسوں میں کوئی نظم یا غزل ایسی نہیں لکھی جو اُن کے شایانِ شان ہو تو اِسے معترضین کی لاعلمی کے سوا کچھ اور نہیں کہا جاسکتا۔ صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ گزشتہ دہائی میں منیر کی شاعری کے نہایت عمدہ نمونے وجود میں آئے ہیں، یہ نظم یا غزل جیسی روایتی اصناف کی صورت میں نہیں ہیں بلکہ اُن مکالمات کی شکل میں ہیں جو منیر کے بے شمار انٹرویوز میں ملتے ہیں۔ یہ انٹرویو مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مکالماتِ منیر میں ایسی برجستگی، معنویت اور ندرتِ فکر پائی جاتی ہے جس کی مثالیں صرف بڑی شاعری ہی میں مل سکتی ہیں۔ پرانے زمانے میں جب کسی کی خوش گفتاری کی تعریف کی جاتی تھی تو یہ کہا جاتا تھا کہ بات کرنے میں منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ جیسے مثنوی گلزارِ نسیم میں بکاولی کی تعریف میں کہا گیا ہے...

چلتی تو زمیں ؎ میں سرو گڑتے
باتیں کرتی تو منھ سے پھول جھڑتے

منیر نیازی کی گفتگو میں یہی پھول شعر بن جاتے ہیں اور سننے والوں کا وہی حال ہوتا ہے جو بکاولی کے خرامِ ناز کے وقت سرو کا ہوا تھا۔ اگر اِن مکالمات کو کتابی صورت میں شائع کردیا جائے تو شاعری کا ایک ایسا مجموعہ وجود میں آسکتا ہے جس کی پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں اور آیندہ بھی کسی مثال کے عدم سے وجود میں آنے کا اندیشہ نہ ہوگا۔

ہم نے اوپر کی سطور میں جو کچھ عرض کیا ہے، اُس کی حرف بہ حرف تصدیق منیر نیازی کے اُس انٹرویو سے بھی ہوتی ہے جو پچھلے دنوں ہفت روزہ ''ندائے ملت'' لاہور میں شائع ہوا ہے۔ پورا انٹرویو اِس لائق ہے کہ اُسے یہاں نقل کردیا جائے لیکن ہمارے کالم کی سنجیدہ فضا اِس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اِس لیے ہم خاص خاص نکات ہی سے سروکار رکھیں گے۔ سب سے اہم بات جو اس انٹرویو میں کہی گئی ہے وہ اِس الزام کے جواب میں ہے کہ کوئی بھی حکومت ہو، ادیب اور دانش ور اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''دانش ور تو مجبور ہیں۔ ایوب خان نے قدرت اللہ شہاب سے کہا رائٹرز گلڈ میں سارے ادیبوں کو اکٹھا کریں، ہم نے مزاحمت کی لیکن آخر ہمیں جانا پڑا۔ بھٹو صاحب نے شملہ کانفرنس میں جانا

Marfat.com

تھا، ہمیں مری طلب کرلیا گیا، سو ہمیں جانا پڑا۔ ہم بغاوت نہیں کر سکتے، کیسے کریں ہمارے پاس اتنی طاقت نہیں ہے''۔

منیر نیازی نہایت منکسرالمزاج ہیں۔ عام ادیبوں کی طرح اُنھیں اپنے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی عادت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی مجبوریوں کی فہرست نہایت اختصار سے پیش کی ہے۔ وہ چاہتے تو ایوب خان کے عہد سے لے کر بے نظیر کے عہد تک کی اپنی مجبوریوں کی داستان تفصیل سے بیان کر سکتے تھے، جس سے یہ واضح ہو جاتا کہ پاکستان میں ہر حکومت نے قطع نظر اِس سے کہ وہ کسی عوامی آمر کی حکومت تھی یا کسی فوجی طالع آزما کی، ادیبوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ روز افزوں گرانی کے سائے میں یہی ایک جنس ہے جو ارزاں سے ارزاں تر ہوتی رہی ہے۔ یہ جابر حکومتیں مختارِ کل تھیں اور ادیب مجبورِ محض۔ اِن بے چاروں کو اُنھیں کی خواہشوں کے کچے دھاگے سے باندھ کر کبھی رائٹرز گلڈ کے لنڈا بازار میں اور کبھی اکادمی ادبیات کی مچھلی مارکیٹ میں جھونک دیا جاتا تھا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

ایک سوال یہ کیا گیا کہ کمیونسٹ پارٹی نے اقبال کے انہدام کی ایک تحریک چلائی تھی، اُس میں کون کون سے لوگ شامل تھے اور کیا اُن میں احمد ندیم قاسمی بھی تھے؟ اِس سوال کا مقصد منیر نیازی کی زبان سے قاسمی صاحب کے خلاف کچھ سننا تھا مگر اُنھوں نے ایک فلسفیانہ بحث چھیڑ دی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ''کمیونسٹ پارٹی کی یہ تحریک بالکل غلط تھی۔ جب تک اقبال کی ری پلیس منٹ نہ ہوتی اُس وقت تک اِس تحریک کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ترقی پسند یہ چاہتے تھے کہ اِس تحریک کے ذریعے ہمارے نظریات رکھنے والا کوئی شخص اقبال کی جگہ لے لے ... فیض اگرچہ خوب صورت لہجے کے شاعر تھے ... لیکن وہ اقبال کی جگہ نہیں لے سکتے تھے۔ ترقی پسند اُنھیں اقبال کے مقام پر بٹھانا چاہتے تھے''۔

سوال اگر مہمل تھا تو جواب اُس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ منیر نیازی کو ترقی پسندوں کی مفروضہ اور خیالی تحریک کا علم اِسی سوال سے ہوا تھا لہٰذا اُنھوں نے اپنے علم غیب کی مدد سے یہ نتیجہ نکالا کہ کوئی ایسی تحریک اگر تھی تو وہ اِس لیے کامیاب نہیں ہوئی کہ یہ ایسے غلط وقت پر چلائی گئی تھی جب اقبال کی قائم مقامی کے لائق کوئی نہیں تھا۔ اِس جواب کے بین السطور میں منیر نیازی نے دراصل یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ اب صورت حال تبدیل ہو چکی ہے، تحریک چلانے والے تحریک چلا کر دیکھ لیں اُنھیں مایوسی نہیں ہوگی۔

ہمیں اِس موقع پر ایک پرانا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ فیض کی وفات کے فوراً بعد کسی نے

Marfat.com

منیر نیازی سے کہا تھا، فیض کی موت سے ادبی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اُسے آپ کے سوا کوئی پُر نہیں کر سکتا۔ منیر نے اپنے روایتی انکسار سے جواب دیا تھا: ''میں کیا کہہ سکتا ہوں یہ آپ لوگوں کے سوچنے کی بات ہے''۔ لوگوں کو چاہیے کہ اقبال کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو بھی پُر کرنے کے لیے کچھ سوچیں۔

مذکورہ سوال کے جواب میں منیر نیازی نے احمد ندیم قاسمی کے بارے میں اِس لیے کچھ نہیں کہا کہ اُنھیں ایک دوسرے سوال کے جواب میں یہ کہنا تھا کہ قاسمی صاحب خلیق انسان ہیں مگر شاعر نہیں ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ اِس رائے کو نامنصفانہ قرار دیں لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ منیر نیازی حق بجانب ہیں۔ ایک متوقع اندیشے کے پیشِ نظر قاسمی صاحب کے شاعرانہ وجود سے انکار ضروری تھا۔ اندیشہ یہ ہے کہ کہیں اقبال کی قائم مقامی کے لیے قاسمی صاحب بھی اپنی امیدواری کا اعلان نہ کر دیں لہٰذا یہی بہتر ہے کہ اِس فتنے کے سر اٹھانے سے پہلے ہی قاسمی صاحب کو شاعری کی مملکت سے خارج کر دیا جائے۔

ایک اور بزرگ شاعر قتیل شفائی کے حوالے سے منیر نیازی نے سنگ دلی ہی کا نہیں سنگ زنی کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ کہتے ہیں: ''قتیل شفائی فلمی شاعری میں کبھی کبھی کوئی اچھی لائن نکال لیتا ہے''۔ منیر نیازی کو ہم خود اُن کے مفاد میں یہ مشورہ دیں گے کہ وہ اِس قسم کی رائیں برسرِعام ظاہر نہ کیا کریں، اِس کا کوئی پریشان کن نتیجہ بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔ اگر کسی نے پوچھ لیا کہ قتیل شفائی نے فلمی شاعری میں کون کون سی اچھی لائن نکالی ہے تو جواب دیتے بن نہ پڑے گی۔ منیر نیازی کو معلوم ہونا چاہیے کہ فلمی شاعری کوئی آسان کام نہیں ہے۔ غالب جیسا بڑا شاعر بھی فلموں کے لیے آٹھ دس غزلوں سے زیادہ نہیں لکھ سکا۔ اِس کے برعکس قتیل شفائی نے کئی سو فلمی گانے لکھے ہیں جو ادبی لحاظ سے بھی خاصے معیاری ہیں۔ اِن گانوں کو اگر قتیل کی غیر فلمی شاعری میں ملا دیا جائے تو فلمی اور غیر فلمی میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے گا۔

منیر نیازی نے سب سے معصومانہ رائے کراچی کے شاعروں کے بارے میں دی ہے۔ فرماتے ہیں: ''کراچی میں بہت بُرے شاعر رہتے ہیں بلکہ وہ شاعر ہی نہیں ہیں''۔ کراچی والے حیران ہیں کہ جس شہر میں ایک سے ایک عمدہ شاعر موجود ہیں، وہاں کے شاعروں کے بارے میں اِس طرح کی بات کہنا ہوش و حواس سے آگے کی بات ہے۔ اِس بات سے بعض لوگ اتنے خفا ہیں کہ اُنھوں نے یہ سزا تجویز کی ہے کہ منیر نیازی کو آیندہ کراچی کے کسی مشاعرے میں مدعو نہ کیا جائے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ جرم کے مقابلے پر یہ سزا ذرا زیادہ ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ منیر نیازی کو کراچی کے مشاعروں میں بلایا تو جائے مگر پڑھوایا نہ جائے اور

Marfat.com

کہا جائے کہ آپ صرف کراچی کے شاعروں کو سنیے تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ اچھی شاعری کسے کہتے ہیں۔ یہ عمل اُس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک منیر نیازی اپنے الفاظ واپس نہ لے لیں۔ اِن مشاعروں میں کراچی کے کسی ایسے شاعر کو مدعو نہ کیا جائے جس نے منیر نیازی سے اپنے مجموعۂ کلام کا دیباچہ یا فلیپ لکھوایا ہو کیوں کہ ایسے ہی شاعروں کے قیاس پر منیر نیازی نے کراچی کے تمام شاعروں کے بارے میں خراب رائے قائم کی ہے۔

(۲۲رفروری ۱۹۹۶ء)

Marfat.com

تعریف یا ہجوِ ملیح

عطا الحق قاسمی کی اور ہماری عمروں میں اتنا فرق ہے کہ ہم اُنھیں ہر طرح کی نظر سے (از قسم نظرِ شفقت وغیرہ) دیکھنے کا حق رکھتے ہیں لیکن بوجوہ رشک کی نظر سے دیکھنا ہی ہمیں اچھا لگتا ہے۔ ہماری جگہ ڈاکٹر انور سدید ہوتے تو غصے کی نظر سے دیکھتے کہ عطاء الحق قاسمی کے معاملے میں یہی ایک اندازِ نظر اُن کے پاس ہے۔ ڈاکٹر انور سدید سے ہماری نیازمندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم اُن کے شریکِ نظر ہو جاتے لیکن انصاف کے تقاضوں کی وجہ سے ہماری نظر میں وسعت پیدا ہوگئی۔ گہرائی اِس لیے پیدا نہ ہوسکی کہ اِس کا تعلق مطالعے سے ہے اور ہمارا مطالعہ عطاء الحق قاسمی اور ڈاکٹر انور سدید کی اُن تحریروں تک محدود ہے جو اِن دونوں نے ایک دوسرے کے بارے میں لکھی ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کو رشک کی نظر سے دیکھنے کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ جس میدان میں بھی نکل جاتے ہیں، وہاں اپنی کام یابی کے جھنڈے گاڑ دیتے ہیں کہ گاڑنے کے لیے شاعری کے علاوہ اُن کے پاس یہی کچھ ہے۔ کالم نگاری کی طرف آئے تو اچھے اچھوں کے چراغ گل اور پگڑیاں غائب کردیں۔ بلاشبہہ آج وہ اردو کے بہترین کالم نگار ہیں۔ ابن انشا کے بعد یہ اعزاز اُنھیں کو حاصل ہے کہ اُن کے کالم اخبار میں چھپتے ہیں تو اخباری دنیا میں اُن کی دھوم مچ جاتی ہے اور یہی کالم جب کتابی صورت میں مرتب ہوکر سامنے آتے ہیں تو ادبی دنیا میں زلزلہ آجاتا ہے۔ ہماری ادبی دنیا کی خانہ خرابی اِسی قسم کے زلزلوں کی مرہونِ منت ہے۔

سفر نگاری میں بھی عطا کا جواب نہیں۔ اُن کے سفرنامے نہایت ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ جس طرح عطا ہر وقت نئے سفر کے لیے مائل پرواز رہتے ہیں، اُسی طرح

Marfat.com

صاحبانِ ذوق اُن کے نئے سفرنامے کے انتظار میں بے چین رہتے ہیں۔ اردو کے کسی ادیب نے اُن سے زیادہ سفر نہیں کیے۔ سفر اُن کے لیے وسیلۂ ظفر ہی نہیں، حصولِ علم کا ذریعہ بھی ہے۔ بعض لوگ پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں، عطا نے یہی سلوک علم سے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شخصیت کی طرح اُن کے سفرنامے بھی علم سے بوجھل نہیں ہوتے۔ جیسی شگفتہ ان کی شخصیت ہے ویسے ہی باغ و بہار اُن کے سفرنامے ہیں۔ پڑھنے والا سفرناموں کو پڑھتا نہیں، عطا کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ عطا دوسروں کی دعوت پر سفر کرتے ہیں، قاری اپنا خرچ خود اٹھاتا ہے یعنی سفرنامہ خرید کر پڑھتا ہے۔

شخصی خاکہ نگاری میں بھی عطا نے اپنی راہ الگ نکالی ہے۔ عام شخصیت نگار زندوں سے ڈرتے ہیں اور مرحومین پر لکھتے ہوئے حق گوئی و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہیں، لیکن عطا زندوں کے بارے میں بھی ایسی ایسی باتیں لکھ دیتے ہیں کہ یہ زندہ لوگ اِن باتوں کو سمجھ جائیں تو اپنا شمار مرحومین میں کرنے لگیں۔

شاعر کی حیثیت سے بھی عطا اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال تو داغ کے رسمی شاگرد تھے، معنوی شاگرد بلکہ جانشین عطا ہیں۔ اُنھوں نے داغ کے رنگ میں ایسی بے داغ شاعری کی ہے کہ زبان اور محاورے کے ساتھ ساتھ معاملہ بندی بھی مزہ دے جاتی ہے۔ بطور نمونۂ کلام تین شعر ''عرض'' ہیں:

ایسا نہیں کہ اُس نے بھلا ہی دیا مجھے
کہنے لگا کہ آپ کو دیکھا ہوا تو ہے

☆

وہ کہتا ہے کل مل لیں گے، آج ذرا
کچھ ملنے والوں کو گھر پہ بلایا ہے

☆

ہم ایک دوسرے کی شکل دیکھنے سے بھی گئے
یہ کون میرے اور تمھارے درمیان آ گیا

عطا کی بے مثال شاعرانہ حیثیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں اور پاکستان سے باہر بھی کوئی مشاعرہ اُن کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ عطا جس طرح اپنی نثر سے جلسے لوٹتے ہیں، اُسی طرح غزل سے مشاعرے لوٹ لیتے ہیں۔ گویا نثر ہو یا نظم دونوں لوٹ مار کا ذریعہ ہیں۔

Marfat.com

ادبی صحافت میں بھی عطا دوسروں سے بازی لے گئے ہیں۔ کچھ عرصے سے وہ رسالہ ''معاصر'' شائع کر رہے ہیں جس کا ہر شمارہ معاصر اردو ادب کا خزینہ ہوتا ہے۔ حال ہی میں اِس کا ساڑھے آٹھ سو صفحات پر مشتمل ضخیم پانچواں شمارہ شائع ہوا ہے جو اِس وقت ہمارے سامنے ہے۔ دبستانِ سرگودھا کے ادیبوں سے قطع نظر، پاکستان کے کسی بھی اہم ادیب کا تصور کیا جائے تو اُس سے ''معاصر'' کے صفحات پر ضرور ملاقات ہوگی۔ احمد ندیم قاسمی، مشتاق احمد یوسفی، انتظار حسین، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور قتیل شفائی سے لے کر ہما شما تک بے شمار نئے پرانے لکھنے والوں کی تازہ ترین تخلیقات ''معاصر'' میں جمع کی گئی ہیں۔ یہ تو ممکن نہیں کہ اِس مختصر کالم میں سب تحریروں کا تذکرہ کیا جائے، اس لیے ہم خاص خاص مندرجات ہی کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔

''معاصر'' کا آغاز تقریباً سو صفحات کے اُس گوشے سے ہوتا ہے جو پروین شاکر کی یاد میں ہے۔ پروین ہمارے دور کی ایک منفرد اور توانا آواز تھی جو ایک الم ناک حادثے کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ اُس نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے بہت کم عمری میں وہ مقام حاصل کرلیا جو ایک عمر کی ریاضت کے بعد بھی مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ زندہ تھی تو اُس کی زود گوئی بعض لوگوں کے نزدیک قابلِ اعتراض تھی، لیکن اب معلوم ہوا، چوں کہ شعر گوئی کے لیے اُسے بے حد مختصر مہلت ملی تھی، اِسی مہلت میں اُسے وہ سب کچھ لکھنا تھا، جو اُس کے مقدر میں لکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتی تو ایک بڑی شاعرہ ہوتی۔ مگر ہماری رائے میں وہ اب بھی اُس مقام پر فائز ہے جہاں اُس کے عہد کے کم شاعر ہی پہنچے ہیں۔

''معاصر'' میں پروین کے بارے میں جو مضامین شائع کیے گئے ہیں، وہ تعزیتی اور تاثراتی نوعیت کے ہیں۔ تاہم اُن سے پروین کی شخصیت کے بہت سے روشن پہلو سامنے آتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی مقبولیت کا دائرہ بے حد وسیع تھا۔ پروین کی شاعری کی قدر و قیمت کے تعین میں ابھی کچھ وقت لگے گا کیوں کہ تنقید کسی سانحے کے فوری ردعمل کے طور پر وجود میں نہیں آتی۔ پروین کی وفات کے بعد شخصی و تاثراتی قسم کے مضامین تو بہت شائع ہوئے لیکن ڈھنگ کا تنقیدی مضمون ایک ہی لکھا گیا ہے جو پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اپنے رسالے ''نقد و نظر'' (علی گڑھ) میں تحریر کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ''معاصر'' میں اِس مضمون کو بھی شامل کرلیا جاتا۔

''معاصر'' کی سب سے خوب صورت تحریر مشتاق احمد یوسفی کا وہ مضمون ہے جو افتخار عارف کے بارے میں ہے۔ افتخار عارف کا کمال یہی نہیں کہ وہ شعر اچھے کہتے ہیں بلکہ یہ

Marfat.com

بھی ہے کہ وہ اپنے بارے میں دوسروں سے جو کچھ لکھواتے ہیں، اُس کا اچھا ہونا بھی یقینی ہوتا ہے اور یوسفی صاحب کا مضمون تو اتنا اچھا ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی ارضی وسماوی حادثے کی وجہ سے یا خود افتخار عارف کی کسی بے احتیاطی کے نتیجے میں اُن کی شاعری ضائع بھی ہو جائے تو محض یوسفی صاحب کے مضمون کی وجہ سے ادب کی تاریخ میں اُن کا نام زندہ رہے گا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح آج عظیم نامی شاعر کا نام انشاء اللہ خان انشا کی اِس ہجو کی وجہ سے زندہ ہے جس کا پہلا بند یہ ہے:

گر تو مشاعرے میں صبا آج کل چلے
کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے
پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

یوسفی صاحب نے بھی اپنے مضمون میں بحر رجز اور بحر رمل کو اس طرح ''شیر وشکر آمیختہ'' کر دیا ہے کہ یہ معلوم نہیں ہوتا، کہاں تعریف کی ہے اور کہاں ہجوِ ملیح لکھی ہے۔ اِس کی بہترین مثال مضمون کا وہ حصہ ہے جس میں افتخار عارف کے پہلے مجموعۂ کلام ''دونیم'' میں شامل ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ''بھاری بھرکم'' مقدمے کا ذکر کیا گیا ہے۔

فرماتے ہیں: ''لکھنؤ میں یہ دستور تھا کہ بہو بیٹیاں، بالخصوص نئی نویلی دلہن، ڈولی میں بیٹھ کر کہیں جاتیں تو راستے میں کہاروں کو کندھا نہیں بدلنے دیتی تھیں اور روانہ ہونے سے پہلے ڈولی میں ایک پتھر رکھوا دیتی تھیں تاکہ کہاروں کو اصل وزن کا اندازہ نہ ہو سکے۔ بعض کم زور دل والے فقط وزن پر ہی عاشق ہو جایا کرتے تھے، سو محبّ گرامی قدر پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مقدمہ وہ بھاری پتھر ہے جو چوم چوم کر چھوڑنے کی بجائے ساتھ رکھنے کے لائق ہے کہ ہما شما کی نظرِ بد سے بچاتا ہے''۔

یوسفی صاحب نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ افتخار عارف کو بتا دیا ہے کہ مجموعۂ کلام کو باوزن بنانے کے لیے کسی دوسرے کی مدد حاصل نہیں کرنی چاہیے اور پروفیسر نارنگ پر واضح کر دیا ہے کہ دریائے سخن میں چھلانگ لگانے والے کی کمر سے کوئی بھاری چیز نہیں باندھنی چاہیے۔

''معاصر'' کے پچھلے شمارے میں ساقی فاروقی کی ایک غزل کے بارے میں احمد ندیم قاسمی اور ساقی فاروقی کی باہمی خط کتابت شائع ہوئی تھی۔ زیرِ نظر شمارے میں اس بحث کا دوسرا حصہ ہے جو خورشید رضوی اور ساقی فاروقی کی خط کتابت پر مشتمل ہے۔ یہ بحث عروض کے

Marfat.com

حوالے سے ہے اور ساقی فاروقی کی زیرِ بحث غزل ہی کی طرح بے مزہ ہے، لیکن بعض ضمنی مباحث بہت دلچسپ ہیں۔ خصوصاً ساقی کے آخری خط کا آخری حصہ جو یہ ہے: ''عطاء الحق قاسمی نے لکھا ہے کہ معاصر میں وہ میرا گوشہ نکالنے والے ہیں، میری شرط یہ ہے کہ وہ گوشہ صرف اِس صورت میں نکلے گا کہ اِس میں تمھارا مضمون بھی ہو اور تم پر یہ پابندی لگا رہا ہوں کہ مضمون میرے خلاف ہو اور میری شاعری کا ایسا سخت محاسبہ ہو کہ لوگ وزیر آغا پر میرا مضمون بھی بھول جائیں''۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ عطاء الحق قاسمی کے ذریعے ساقی فاروقی کی ایک پرانی خواہش پوری ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ''اوراق'' میں ساقی کا گوشہ نہیں نکالا تھا تو ساقی نے ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف مضمون لکھ کر حساب برابر کر دیا تھا۔ خدا کرے عطاء الحق قاسمی جلد از جلد اپنا وعدہ پورا کر دیں، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساقی کو اُن کے بارے میں بھی ''سفاکانہ'' قسم کا کوئی مضمون لکھنا پڑے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے، ساقی اِس قسم کی غلطی نہیں کریں گے کیوں کہ اِس کے جواب میں عطاء الحق قاسمی ''معاصر'' کا ویسا ہی ''ساقی نمبر'' نکال دیں گے جیسا شاہد احمد دہلوی نے رسالہ ''ساقی'' کا جوش نمبر نکالا تھا۔ عطاء الحق قاسمی تو نمبر سے آگے کی کوئی چیز یعنی جلوس وغیرہ بھی نکال سکتے ہیں۔

ساقی نے خورشید رضوی کو اپنے خلاف مضمون لکھنے کی جو دعوت دی ہے، اُس سے جہاں اُن کی وسیع النظری کا اندازہ ہوتا ہے وہیں کوتاہ اندیشی بھی ظاہر ہوجاتی ہے۔ خورشید رضوی بہت عالم فاضل آدمی ہیں، گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے استاد ہیں۔ فارسی سے ماہرانہ آشنائی ہے۔ انگریزی سے عمر بھر واسطہ رہا ہے۔ اردو گھر کی زبان ہے کہ ساداتِ امروہہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سات برس کی عمر سے پنجاب میں ہیں اور پنجابی ایسی روانی سے بولتے ہیں کہ منیر نیازی اُن کے سامنے ''غیر اہلِ زبان'' معلوم ہوتے ہیں۔ مختلف علوم و فنون کا مطالعہ بھی وسیع ہے کہ ایک عرصے تک اسلام آباد کے اسلامی تحقیق کے ادارے میں کام کر چکے ہیں۔ ایسے ہفت زبان اور عالم فاضل آدمی کو اپنے خلاف لکھنے کی دعوت دینا ادبی خودکشی کے مترادف ہے۔ خورشید رضوی مخالفانہ مضمون لکھیں گے تو ساقی کی شاعری کی خوبیاں بھی خامیاں قرار پائیں گی، جن خامیوں کا خود ساقی کو اور اُن کے ہم جیسے بہی خواہوں کو علم نہیں ہے، اُنھیں پردۂ خفا ہی میں رہنے دیا جائے تو بہتر ہے۔ مناسب یہی ہے کہ خورشید رضوی سے ویسا ہی سیدھا سادا تعریفی مضمون لکھوا لیا جائے جیسا شمس الرحمٰن فاروقی لکھ چکے ہیں۔

''معاصر'' میں ساقی کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں، اُن میں بلا ضرورت ڈاکٹر وزیر آغا کے لیے ناشایستہ الفاظ لکھے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ساقی کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا

Marfat.com

کوئی نفسیاتی مسئلہ بن گئے ہیں۔ اِس کے برعکس ڈاکٹر وزیر آغا کا رویہ اُن کی کشادہ دلی کا آئینہ دار ہے۔ حال ہی میں اُن کی کتاب ''تین سفر'' شائع ہوئی ہے، اِس میں لندن کا سفرنامہ بھی ہے۔ نو سال پہلے ڈاکٹر وزیر آغا لندن گئے تھے، واپس آ کر اُنھوں نے سفرنامہ لکھا تھا جو اُنھیں دنوں کسی رسالے میں شائع ہوا تھا، اِس میں ساقی کا ذکر بڑی محبت سے کیا گیا ہے۔ اب یہ سفرنامہ کتابی صورت میں شائع ہوا ہے تو اِس میں ساقی کا ذکر اُسی طرح موجود ہے جس طرح پہلی اشاعت میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تو ساقی کا ذکر حذف کر سکتے تھے یا یگانہ کی طرح ساقی نامۂ شققیہ لکھ سکتے تھے، مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

اِس سفرنامے میں ساقی کا ذکر جس شگفتہ انداز سے کیا گیا ہے، اُس کا اندازہ اِس ایک مثال سے ہو سکتا ہے۔ ساقی نے ایک خوں خوار قسم کا کتا پال رکھا تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اُس سے بہت ڈرتے تھے۔ ایک روز ساقی، ڈاکٹر صاحب کو اپنے گھر لے گئے۔ آگے کا قصہ ڈاکٹر صاحب کی زبانی یوں ہے: ''ساقی نے ہمیں باہر کھڑے رہنے کے لیے کہا اور خود اندر جا کر اپنے خوں خوار کتے سے بغل گیر ہوئے، اُس کا منھ سر چوما، بلائیں لیں، اُسے سمجھایا کہ گھر کے باہر دو بد بخت مہمان کھڑے ہیں، وہ ابھی اندر آئیں گے، اُنھیں ابھی کچھ نہیں کہنا ہے۔ کتے کو سمجھانے کے بعد اُنھوں نے ہمیں اندر طلب کیا اور جب تک ہم اُن کے ڈرائنگ روم میں چلے نہیں گئے، وہ کتے سے لپٹے رہے۔ پھر کتے کو وہیں چھوڑ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے اور دروازہ بند کر دیا۔ کہنے لگے کہ آپ یوں ہی گھبرا گئے، یہ کتا صرف بُرے شاعروں پر بھونکتا ہے۔ ...میں نے دل میں کہا کہ اگر یہ کتا واقعی سخن شناس ہوتا تو دن رات ساقی کے گھر میں رہتے ہوئے کیوں نہ بھونکتا''۔

ہم اِس بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے کیوں کہ اُس کتے کا انتقال ہو چکا ہے۔ سنا ہے کہ آں جہانی کو سخن شناس ہونے کی وجہ سے ہر روز صاحبِ خانہ کے شعر سننے پڑتے تھے۔ گویا وہ اپنی سخن شناسی کے ہاتھوں مارا گیا۔

(۱۴راپریل ۱۹۹۶ء)

Marfat.com

واقعہ، حادثہ، سانحہ یا لطیفہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی اِس سال پورے ۷۶ برس کے ہو جائیں گے۔ اِس عمر میں ادبی اعتبار سے وہ جتنے توانا اور باعمل ہیں، اتنے وہ جوانی میں بھی نہ تھے۔ اُن کی جوانی کی تحریریں تو ایسی ہیں کہ اُن میں نہ صرف وہ خود بوڑھے نظر آتے ہیں بلکہ اُن کے پڑھنے والے بھی کہولت و کسالت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پنجاب یونی ورسٹی کی پروفیسر شپ سے ریٹائر ہونے کے بعد گزشتہ پندرہ سولہ برسوں میں اُنھوں نے دو درجن سے زیادہ جو کتابیں شائع کی ہیں، اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا علم اور عمل دونوں شباب پر ہیں۔ اُنھوں نے میرؔ اور ولیؔ کے بارے میں نہ صرف مستقل کتابیں لکھی ہیں بلکہ جدید و قدیم ادب سے متعلق تنقیدی مقالات کے کئی مجموعے بھی شائع کیے ہیں۔ کئی پرانے شاعروں کی تصانیف کو مرتب کیا ہے اور اُن میں سے بیشتر ایسی ہیں جو پہلی مرتبہ اہلِ ادب کی نظر سے گزری ہیں۔

اُنھوں نے اپنی یادوں اور یادداشتوں پر مشتمل کئی کتابیں تحریر کی ہیں۔ ''یادِ عہدِ رفتہ'' اُن کی آپ بیتی ہے اور ''یادوں کے سائے'' میں تحریکِ آزادی سے متعلق اپنے تجربات و مشاہدات کو قلم بند کیا ہے۔ ترکی اور لندن میں اپنے قیام کے روزنامچے الگ الگ شائع کیے ہیں۔ دیارِ حبیبؐ کا سفرنامہ لکھا ہے۔ شخصی خاکوں کے نصف درجن مجموعوں میں پچاس سے زیادہ اہم ادبی شخصیات سے اپنے مراسم کی داستان بیان کی ہے۔ گویا مضامینِ نو کے ایسے انبار لگا دیے ہیں کہ دیکھنے والے حیران ہوتے ہیں اور اُن کے لیے درازیِ عمر کی دعا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک نہایت مفید کام یہ بھی شروع کر رکھا ہے کہ مشاہیرِ ادب کے جو خطوط اُن کے نام ہیں، اُنھیں الگ الگ مجموعوں کی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ اب تک

Marfat.com

وہ مولوی عبدالحق، احتشام حسین اور محمد حسن عسکری کے خطوط شائع کر چکے ہیں۔ اِس سلسلے کی تازہ ترین کتاب ''خطوطِ احمد ندیم قاسمی'' ہے اور اِسی کے بارے میں اِس وقت کچھ عرض کرنا ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے بیک وقت شاعری اور افسانہ نگاری میں جو رجحان ساز کردار ادا کیا ہے، اُس کی مثالیں ہمارے ادب میں بہت کم ملتی ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جو ادیب ادب کے ایک سے زیادہ شعبوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہیں، وہ عموماً کسی ایک شعبے میں بھی صحیح طور پر اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ نہیں کر پاتے۔ لیکن قاسمی صاحب کے کمالِ فن کا مظاہرہ صرف شاعری اور افسانہ نگاری میں نہیں ہوا، اُنھوں نے جس شعبۂ ادب میں بھی قدم رکھا، وہاں گل و گلزار کا سماں پیدا کر دیا۔ کالم نگاری کے حوالے سے طنز و مزاح میں بھی اُن کا کام اتنا وقیع ہے کہ اِس سے صرفِ نظر کرنا ادبی کفرانِ نعمت ہے۔ اب قاسمی صاحب ایک مکتوب نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں تو اِس میدان میں بھی اُن کی انفرادیت دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

قاسمی صاحب گوشہ نشین ادیبوں میں سے نہیں ہیں۔ اُنھوں نے بڑی فعال ادبی زندگی گزاری ہے اور گزار رہے ہیں۔ بعض رسالوں کی ادارت اور اداروں کے تنظیمی کاموں کی وجہ سے اُنھیں بے شمار ادیبوں سے خط و کتابت کا موقع ملا ہے۔ مولوی عبدالحق کی طرح خطوں کا جواب دینے میں وہ نہایت مستعد ہیں۔ گزشتہ پچاس پچپن برسوں میں اُنھوں نے بلامبالغہ ہزاروں خط لکھے ہوں گے اور یقیناً اُن کی بڑی تعداد محفوظ بھی ہوگی۔ لیکن جہاں تک خطوں کی اشاعت کا تعلق ہے، وہ ابھی تک بہت کم تعداد میں سامنے آئے ہیں۔ مختلف کتابوں اور رسالوں خصوصاً ''افکار'' کے ندیم نمبر میں کچھ خط شائع ہوئے ہیں یا پھر خواجہ حمید الدین شاہد نے اپنے نام کے خطوط رسالہ ''سب رس'' میں چھاپے تھے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کا شائع کردہ مجموعہ اِس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ جس دور کے یہ خط ہیں (۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۳ء) وہ ہمارے ادب میں ترقی پسند تحریک کے حوالے سے یادگار زمانہ ہے۔ اُس زمانے میں قاسمی صاحب کا ''ادبِ لطیف'' اور ''نقوش'' جیسے رسالوں سے ادارت کا اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے تنظیمی نوعیت کا تعلق تھا۔ قاسمی صاحب کے خطوں سے اُس زمانے کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں بڑی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً ''ادبِ لطیف'' کے ۱۹۴۴ء کے سال نامے میں منٹو کا افسانہ ''بُو'' شائع ہوا تو ترقی پسندوں کے مخالفوں نے ''ادبِ لطیف'' کے خلاف ایک مہم شروع کر دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس نے ''ادبِ لطیف'' کے دفتر پر چھاپا مار کر تمام غیر فروخت شدہ پرچے اپنی تحویل میں لے لیے، رسالے کے ناشر، ایڈیٹر

Marfat.com

اور منٹو کے خلاف مقدمہ قائم کر دیا۔

غیر ترقی پسندوں نے جو کچھ کیا، وہ تو خیر اُنھیں کرنا ہی چاہیے تھا مگر حیرت اِس پر ہے کہ اِس مصیبت کے وقت میں خود ترقی پسندوں کا رویہ بھی خاصا غیر ہم دردانہ تھا۔ ۲۲ر جولائی ۱۹۴۴ء کے خط میں قاسمی صاحب لکھتے ہیں: ''مقدمے کی نوعیت روز بروز عجیب وغریب صورت اختیار کرتی جا رہی ہے لیکن یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ترقی پسند ہم دردوں نے اِس سلسلے میں کوئی عملی اقدام نہیں کیا اور بہتوں نے تو لفظی ہم دردی سے بھی اجتناب کیا ہے۔ خدا جانے ہماری کوششوں سے متفق ہونے کا مطلب کیا ہے''۔

یہی بات ۱۶ر اگست ۱۹۴۴ء کے خط میں یوں لکھی گئی ہے: ''ہندوستان بھر کے ترقی پسندوں نے ادب لطیف کی ابتلا پر کسی قسم کی ہم دردی کا اظہار نہیں کیا۔ جو مصیبتیں اور ذلتیں میں نے برداشت کی ہیں، وہ کچھ میں ہی جانتا ہوں ... کہیں یہ خلوص کا فقدان تو نہیں''۔

اپنے ہی ایک ساتھی سے ترقی پسندوں کے تغافل اور بے تعلقی کے رویے کی وجہ بھی اِنھیں خطوں سے معلوم ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قاسمی صاحب عام ترقی پسندوں کی طرح ''اشتراکی'' نہیں تھے۔ عام مسلمانوں کی طرح اُن کی ہم دردیاں تحریک پاکستان کے ساتھ تھیں۔ وہ مسلم لیگ کی جدوجہد میں عملاً شریک رہتے تھے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۴۵ء کے خط میں وہ لکھتے ہیں: ''میں مسلم لیگ کا عقیدت مند ہوں اور اِن دنوں الیکشن کے پروپیگنڈے زور شور سے جاری ہیں، دیہات میں اِدھر اُدھر گھومنا بھی پڑتا ہے''۔ قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگی حکومت نے قاسمی صاحب کو مسلم لیگی ہونے کا یہ صلہ دیا کہ اُنھیں ایک عرصے تک جیل میں ڈالے رکھا!

ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ حلقۂ اربابِ ذوق والوں کے بارے میں بھی اِن خطوں میں دلچسپ معلومات ملتی ہیں۔ ۱۱ر فروری ۱۹۴۶ء کے خط میں قاسمی صاحب لکھتے ہیں: ''لاہور کے حلقے والے، یوسف ظفر، قیوم نظر، مختار صدیقی، اِن حضرات سے مجھے دلی محبت ہے مگر اکثر اصحاب ایسے ہیں کہ کسی دوسرے شاعر کا ذکر آیا نہیں اور وہ آتش زیر پا ہوئے نہیں۔ اب آپ ہی تصور فرمایئے، ادب لطیف سے تمام حلقے والوں نے اجتماعی حیثیت سے قطع تعلق کر رکھا ہے۔ مختار صدیقی... میرا بھائی... بھی میرے خط کا جواب نہیں دیتا... یہ ادب کی خدمت نہیں، یہ صاف طور پر ادب کی ٹھیکے داری ہے اور اس ٹھیکے میں اکثر نقصان ہی ہوتا ہے''۔

بعض ادیبوں کے بارے میں بھی قاسمی صاحب کے تبصرے بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً ایک جگہ شوکت صدیقی کا ذکر اِن الفاظ میں ملتا ہے: ''مجھے تو یہ سلام مچھلی شہری کی طرح سے زیادہ جلد باز اور جذباتی معلوم ہوتے ہیں۔ آن کی آن میں ناراض ہو جاتے ہیں''۔

Marfat.com

محمد حسن عسکری کے بارے میں لکھتے ہیں: ''میرے نہایت عزیز دوست ہیں، ان سے میری خط و کتابت بہت مدت تک رہی اور ہم ایک دوسرے سے بہت قریب ہوتے گئے۔ مگر جوں ہی وہ دلّی میں تشریف لائے بس دہلوی ہو کر رہ گئے اور اب خط و کتابت تو کجا، کبھی بھولے سے پوچھا تک نہیں۔ مجھے اُن کی ذہانت سے انس تھا مگر انھوں نے نہ جانے کیوں اپنی ذہانت کو 'ساقی' کی محدود ڈیوڑھی میں محبوس کرلیا اور افسانے لکھتے لکھتے نقاد بن گئے''۔

ترقی پسندوں کا ترجمان ''ادب لطیف'' قیامِ پاکستان کے بعد کس طرح رجعت پسندی کی طرف مائل ہوا، اِس کی تفصیل بھی اِن خطوں میں ملتی ہے۔ ۲۳ مئی ۱۹۴۹ء کے خط میں لکھتے ہیں: ''ادب لطیف کے نئے ایڈیٹر قتیل اور ادیب ہیں۔ قتیل ہماری انجمن کے ذمہ دار رکن ہیں۔ لیکن ادیب ممبر نہیں اور ڈاکٹر تاثیر جنھوں نے اِن دنوں عسکری کے مخالف ہونے کے باوجود ترقی پسند تحریک کو گالیاں دینا اپنا قومی فریضہ بنا رکھا ہے، ادیب صاحب کے خفیہ طور پر مشیر ہیں۔ اُنھی کی ہدایت کے مطابق سال نامہ ادب لطیف کا حصۂ نثر مرتب ہو رہا ہے اور اُنھی کے مشورے سے ادیب صاحب ترقی پسندی کا ڈھنڈورا پیٹ کر غیر ترقی پسندوں کو اچھال رہے ہیں۔ یہ بڑی افسوس ناک صورتِ حال ہے۔ قتیل صاحب بساط بھر کوشش کرتے ہیں مگر دفتر کا ماحول لحہ بہ لحہ رجعتی ہو رہا ہے، وہ بے بس ہوتے جارہے ہیں۔ بہرحال کوشش یہ ہے کہ اس رسالے کو ہاتھ سے جانے نہ دیں''۔

اِن خطوں سے بعض دلچسپ واقعات کا بھی علم ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ عبادت صاحب نے قاسمی صاحب کو بتایا کہ بندروں نے اُن کی کتابوں پر حملہ کردیا، تمام کتابیں پھاڑ کر پھینک دیں مگر قاسمی صاحب کے قطعات کے مجموعے کو پھاڑے بغیر اصل حالت میں اپنے ساتھ لے گئے۔ اِس واقعے پر قاسمی صاحب اِن الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں: ''بندروں کی ستم ظریفی پر مجھے بہت ہنسی آئی اور ساتھ ہی تعجب ہوا کہ تمام کتابیں پھاڑ کر ندیم کی کتاب کو بحفاظت ہمراہ لے جانے سے اُن کا مقصد کیا ہے۔ کیا میں اپنے قطعات کا ماتم کروں یا ڈارون کی تھیوری کو صحیح تصور کروں''۔

ایک زمانے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی شاعری سے بھی شغل فرماتے تھے۔ ایک خط میں قاسمی صاحب اُنھیں لکھتے ہیں: ''آپ تنقید کے علاوہ شاعری کی طرف بھی باقاعدہ توجہ فرمائیے۔ آپ تھوڑے سے عرصے میں بہتوں سے آگے نکل جائیں گے''۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ عبادت صاحب نے شاعری کی طرف باقاعدگی سے توجہ نہ کی۔ شاعری میں وہ کسی اور سے نہیں تو کم از کم اپنے آپ سے ضرور آگے نکل جاتے لیکن تنقید و تحقیق کا بنا بنایا گھروندا بگڑ جاتا۔

خط کتابت میں قاسمی صاحب نہایت فراخ دل واقع ہوئے ہیں، یہاں تک کہ وہ ہم

Marfat.com

پر بھی بے حد مہربان ہیں۔ پچھلے دنوں انھوں نے ایک خط لکھ کر ہماری عزت افزائی کی ہے۔ چوں کہ اِس خط کا تعلق ہمارے ایک کالم سے ہے، اِس لیے ہم اِسے اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

☆

آپ نے ہفت روزہ ''تکبیر'' کی ۱۵ر فروری ۹۶ء کی اشاعت میں ''دستِ بخیل میں قلم'' کے عنوان سے مظفر علی سید صاحب کے اسلوب تنقید کے بارے میں ایک دلچسپ کالم لکھا تھا۔ اِس میں سید صاحب کے اُس دیباچے کا بھی ذکر تھا جو اُنھوں نے ''احمد ندیم قاسمی کے بہترین افسانے'' کے لیے لکھا تھا۔ محبِّ عزیز عطا الحق قاسمی نے ۱۸ر جولائی ۱۹۹۵ء کے ''نوائے وقت'' میں یہ اطلاع دی تھی کہ ایک زمانے میں سید صاحب مجھ سے ناراض ہوئے تو اُنھوں نے میرے افسانوں کے ساتھ مجھے بھی ''مسترد'' کر دیا تھا، تو میں اِس کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔ سید صاحب باغ و بہار شخصیت کے آدمی ہیں۔ کبھی بہت قریب آجاتے ہیں تو کبھی بہت دور چلے جاتے ہیں۔ متذکرہ دیباچے میں اُنھوں نے میرے افسانوں کی تحسین کے سلسلے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا تھا بلکہ کھل کر داد دی تھی۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ''اگر مذکورہ انتخاب پر سید صاحب کا دیباچہ نہ ہوتا تو حالات اتنے خراب نہ ہوتے''... مگر حالات اِس دیباچے کی وجہ سے خراب نہیں ہوئے بلکہ کبھی خراب نہیں ہوئے۔ اختلافات اور غلط فہمیوں کی گنجایشیں ہمیشہ موجود رہتی ہیں مگر اِن کی وجہ سے میرے افسانوں کے یا میرے استرداد کا پہلو قطعی نہیں نکلتا۔

البتہ اپنے افسانوں کے اِس انتخاب کے ایک اور پہلو سے آپ کو متعارف کرانا چاہتا ہوں جو بیک وقت دلچسپ بھی ہے اور دل خراش بھی۔ میں اِس انتخاب کے ابتدائی چھ صفحات کی فوٹو کاپی منسلک کر رہا ہوں۔ مجھے علم نہیں کہ اِس انتخاب کا کوئی نیا ایڈیشن بھی نکلا ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے مجھے نہ صرف اِس انتخاب کے نئے ایڈیشن کے بارے میں بتایا بلکہ یہ انتخاب مجھ تک پہنچایا اور فرمایا کہ میں بطورِ خاص اِس کے صفحہ ۴ پر نظر ڈالوں۔ میں نے اِس صفحے پر نظر ڈالی تو یقین کیجیے میں چکرا کر رہ گیا۔ مجھے غصہ بہت کم آتا ہے مگر یہ صفحہ دیکھ کر میرا سارا خون میرے سر میں جمع ہو گیا۔ میں فوراً ناشر کی دکان پر پہنچا مگر معلوم ہوتا ہے وہ مجھے دیکھ کر چھپ گئے اور دکان پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے اطلاع دی کہ چوہدری صاحب ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں۔ اِن ناشر کا نام بشیر احمد چوہدری تھا اور وہ نذیر احمد چوہدری (سویرا والے) اور رشید احمد چوہدری (مکتبۂ اردو والے) اور محمد حنیف رامے (صوبائی اسمبلی والے) کے بھائی تھے۔ افسوس کہ اب اُن کا انتقال ہو چکا ہے۔

Marfat.com

۱۹۸۷ء کے اِس ایڈیشن کے صفحہ ۳ پر تو میرے منتخب افسانوں کی فہرست درج ہے مگر صفحہ الٹیے تو گھی، جیلی، مکئی کا آٹا، بکرے کا گوشت، کلیجی، دودھ، دہی، گردے، آم، انگور، امرود وغیرہ کی فہرست ہے اور سب کے سامنے شاید اُن کی قیمت درج ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب بھی احمد ندیم قاسمی کے منتخب افسانے ہیں اور اِن کے سامنے صفحے کے نمبر درج ہیں۔ میں نے سوچا جب یہ انتخاب کسی کے ہاتھ آیا ہوگا تو اُس نے ''افسانوں'' کے اِن عنوانات سے مسحور ہو کر افسانہ ''کلیجی'' پڑھنے کے لیے صفحہ ۸۰ الٹا ہوگا اور وہاں اُسے میرا افسانہ ''طلوع و غروب'' نظر آیا ہوگا تو اُسے بڑی مایوسی ہوئی ہوگی کہ افسانہ نگار نے اتنے خوش ذائقہ عنوانات کے افسانے لکھ کر اُنھیں کتاب میں درج کیوں نہیں کیا۔

میں نے بہت غور کیا مگر یہ نکتہ سمجھ میں نہیں آیا کہ میرے افسانوں... ''وحشی'' اور ''گھر سے گھر تک'' اور ''سلطان''... کے فوراً بعد گھی اور جیلی اور مکئی کا آٹا کہاں سے آدھمکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناشر نے اس کتاب کے لیے ردی خریدی ہوگی اور یہ ردی کسی ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے آئی ہوگی جہاں اِن اشیائے خوردنی کی قیمتیں درج کی گئی ہوں گی مگر فوراً بعد اِن قیمتوں میں اضافہ ہو گیا ہوگا، اِس لیے اِسے ردی میں اُٹھوا دیا ہوگا۔ کوئی اور توجیہ میری سمجھ میں نہیں آسکی۔

میں سمجھتا ہوں کہ کتابوں کی نشر و اشاعت کی دنیا میں یہ ایک ایسا واقعہ یا حادثہ یا سانحہ یا لطیفہ ہے جس کا شاید ہی کوئی جواب موجود ہو۔

☆

یہ خط پڑھ کر ہم نے سید صاحب کو فون کیا اور پوچھا کہ قاسمی صاحب کے منتخب افسانوں کی فہرست کے ساتھ آپ کی منتخب ڈشوں اور پھلوں کی فہرست کیسے شامل ہوگئی تو اُنھوں نے فرمایا: جس کاتب نے افسانوں کی کتابت کی تھی، وہ اُنھیں دنوں کسی ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی فہرست کی بھی کتابت کر رہا تھا۔ غلطی سے اُدھر کا ایک صفحہ اِدھر آ گیا''۔ ہم نے عرض کیا: ''اگر معاملہ اِس کے برعکس ہو جاتا یعنی آپ کے دیباچے کا ایک صفحہ اُدھر چلا جاتا تو ڈیپارٹمنٹل اسٹور والے اپنی فہرست کو بھی فہمیدہ ریاض کے سفرنامے کی طرح ضائع کر کے فہرست کا نیا ایڈیشن چھپواتے''۔ بہرحال حقیقت کچھ بھی ہو، یہ ماننا پڑے گا کہ کسی کتاب پر سید صاحب کے دیباچے کی وجہ سے کوئی نہ کوئی پیچیدگی ضرور پیدا ہوتی ہے۔

(۱۸/اپریل ۱۹۹۶ء)

Marfat.com

سفرنامہ یا شاہی دسترخوان

جو اہلِ قلم ایک سے زائد اصنافِ ادب کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بناتے ہیں، اُن میں سے اکثر عموماً خسارے میں رہتے ہیں کہ اُن کی ادبی توانائی مختلف جہتوں میں تقسیم ہو کر ادب کے لیے بھی خسارے کا سبب بنتی ہے۔ لیکن محسن بھوپالی کا معاملہ اِس کے برعکس ہے، وہ جس صنفِ ادب کو بھی ہاتھ لگا دیتے ہیں، وہ سونا بن جاتی ہے۔ آج کل مہنگائی کی وجہ سے اصلی سونا نایاب ہے، اِس لیے محسن بھوپالی کے تیار کردہ سونے کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔

محسن بھوپالی کے شعری سفر کا آغاز اِس شعر سے ہوا جو بالآخر اُن کے شعری سفر کا حاصل قرار پایا:

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل اُنھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

اِس شعر کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اُس کی کوئی دوسری مثال موجودہ زمانے کی شاعری میں نہیں ملتی۔ لوگوں کے ذہنوں سے لے کر بسوں اور رکشاؤں تک پر یہ شعر ثبت ہو چکا ہے۔ محسن کے معاصرین کے مجموعے دیکھ جایئے، اُن میں ایسا ایک شعر بھی نظر نہیں آئے گا، بلکہ خود محسن کے اپنے مجموعے بھی اِس قسم کے کسی دوسرے شعر سے خالی ہیں۔ مگر اتنے بھی خالی نہیں ہیں کہ تشنگانِ سخن اُن سے اپنی پیاس نہ بجھا سکیں۔ سچی بات یہ ہے کہ محسن جیسا کوئی دوسرا شاعر اُن کے معاصرین میں دور دور تک نظر نہیں آتا اور اگر نظر آ جائے تو اُسے نظر کا دھوکا سمجھنا چاہیے۔

محسن نے شاعری میں رنگا رنگ تجربے کیے ہیں۔ نظم اور افسانے کے امتزاج سے

Marfat.com

ایک نئی صنفِ سخن ''نظمانہ'' ایجاد کی ہے۔ شاعری میں نثر کی تمام خوبیوں کو یک جا کر دینا کوئی آسان کام نہ تھا، ہمارے ہاں شاعرانہ نثر لکھنے کی روایت تو موجود تھی، شاعری میں نثر نگاری کی روایت کا آغاز محسن سے ہوتا ہے۔

محسن کی ہائیکو نگاری کی تعریف میں ہم ایک پورا کالم لکھ چکے ہیں جس کی تردید ابھی تک کسی نے نہیں کی۔ ویسے بھی ہم جو کچھ لکھتے ہیں، کسی دوسرے کو اُس کی تردید کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، کیوں کہ ہماری ہر تحریر میں تردید کے لیے داخلی شواہد موجود ہوتے ہیں۔ ایسا ہم جان بوجھ کر نہیں کرتے۔ بدقسمتی سے کسی کی تعریف کرتے وقت ہمارا موقف ہی کمزور ہوتا ہے، لیکن محسن بھوپالی کے سلسلے میں ہمارا موقف کمزور نہیں ہے۔ ہاں دلائل جو ہم نے دیے ہیں وہ کمزور ہوں تو الگ بات ہے کیوں کہ دلائل کے ساتھ مثالیں تو بہر حال محسن کی شاعری ہی سے دی گئی تھیں۔

محسن نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کی طرف بھی بھرپور توجہ کی ہے۔ اُن کی ایک نثری تصنیف ''قومی یک جہتی میں ادب کا کردار'' کے نام سے چھپ کر اُن لوگوں میں مقبول ہو چکی ہے جن کے اس کتاب میں انٹرویو ہیں۔ اب دوسری کتاب ''حیرتوں کی سرزمین'' منظر عام پر آئی ہے جس کے بارے میں ہمیں اِس وقت کچھ عرض کرنا ہے۔

دیباچے میں محسن بھوپالی نے لکھا ہے کہ اس سفرنامے کو '' آپ عام سفرناموں سے ہٹ کر پائیں گے۔ اس میں آپ کو نہ تاریخی اور جغرافیائی معلومات ملیں گی، نہ تجارت و معاشیات کے اعداد و شمار کا گورکھ دھندا اور نہ ہی دورانِ سفر کسی نیلی آنکھوں والی دوشیزہ سے مکالمے اور بعد میں معاشقے کی داستان نظر آئے گی''۔

یہ سفرنامہ عام سفرناموں سے ہٹ کر ہی نہیں بلکہ بہت پرے ہٹ کر لکھا گیا ہے۔ اس میں واقعی کوئی گورکھ دھندا نہیں ہے۔ لیکن ایک خاص نوعیت کا دھندا ضرور ملتا ہے اور وہ ہے مشاعروں کا دھندا۔ ہر تیسرے صفحے پر کسی مشاعرے یا شعری نشست کی روداد نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں سوائے مشاعرے بازی کے اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ حیرت ہے کہ اس مشاعرے بازی کے باوجود امریکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گیا اور ہم نے اپنی ساری طاقت مشاعروں میں ضائع کر دی، بلکہ بہت سے شاعر بھی ضائع کر دیے کہ وہ سال میں آٹھ مہینے امریکہ میں مشاعرے پڑھتے ہیں اور ایسے سخن شناسوں کے مہمان بنتے ہیں جو ہمارے شاعروں کے ناموں سے بھی واقف نہیں۔

محسن بھوپالی نے بتایا ہے کہ امریکہ کے ایک مشاعرے میں جمیل الدین عالی کو

Marfat.com

جمیل الدین عالی کہہ کر ڈائس پر بلایا گیا۔ عالی صاحب جیسے بڑے شاعر کے ساتھ امریکہ میں یہ سلوک ہوسکتا ہے تو اِس سے اندازہ کرنا چاہیے کہ عام شاعروں کی کیا کیا عزت افزائیاں نہ ہوتی ہوں گی۔

کراچی سے نیویارک پہنچ کر محسن بھوپالی کو جو سب سے پہلا خوش گوار تجربہ ہوا وہ بیک وقت حیرت اور خوشی کے جذبات کا آئینہ دار تھا۔ حیرت اِس بات پر کہ تقریباً ۲۴ گھنٹے سفر کرنے کے بعد بھی تاریخ نہیں بدلی اور خوشی اِس بات کی کہ عمرِ عزیز کو مفت میں ایک دن زاید مل گیا۔ ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ اِس قسم کی حیرت اور خوشی سے دوچار ہونے کے لیے کراچی سے نیویارک تک سفر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنے گھر میں مقید ہو کر مشاعرہ باز شاعروں کا کلام پڑھتے ہیں تو تاریخ تو کیا، صدی بھی نہیں بدلتی، بیسویں صدی میں انیسویں صدی کا رنگِ سخن مزہ دے جاتا ہے۔

محسن بھوپالی بتاتے ہیں کہ امریکہ میں مقیم پاکستانی اپنے ہم وطن شاعروں کو بڑے اشتیاق سے مدعو کرتے تھے، اُنھیں خوب کھلاتے پلاتے تھے، کلام سنتے تھے اور پھر چلتے وقت گیارہ گیارہ ڈالر نقد یا کوئی تحفہ پیش کرتے تھے۔ اور تو سب اِس صورت حال سے خوش تھے، مگر جون ایلیا کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی کہ کھانے کے بعد گانا بھی ہو۔ جون شاعری کے لیے ''گانے'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں حالاں کہ وہ اپنا کلام تحت اللفظ سناتے ہیں۔ ایک محفل میں تو اُنھوں نے صاف صاف کہہ دیا ''ایسی محفلیں عام ہوگئی ہیں کہ شعرا کو کھانا کھلایا جاتا ہے اور پھر کہا جاتا ہے کہ شعر سنائیں، ہمیں کھانے اور گانے کے اِس رجحان کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔''

جون ایلیا کی یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آئی، جو لوگ ہزاروں روپے خرچ کر کے شاعروں کو امریکہ بلاتے ہیں، وہ صرف کھانا کھلانے کے لیے نہیں بلاتے۔ دنیا میں ہر شخص روزی کے لیے محنت کرتا ہے۔ شاعروں سے بھی اِس کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ محنت کر کے روح وتن کا رشتہ برقرار رکھیں گے، اِسی لیے کھانا اور گانا لازم و ملزوم ہیں۔ گانے کے بغیر کھانا نہیں مل سکتا اور کھانے کے بغیر گانا ممکن نہیں ہے۔

محسن بھوپالی نے بتایا ہے کہ دورانِ سفر جون ایلیا کی وجہ سے ایک اور مسئلہ بھی پیدا ہوگیا۔ مشاعرہ گردوں کی ٹولی جہاں بھی جاتی تھی، جون ایلیا کو اُن کے لمبے بالوں کی وجہ سے خاتون سمجھا جاتا تھا، کئی مرتبہ ہوٹل کے بیروں نے انھیں ''میڈم'' کہہ کر مخاطب کیا اور ایک مرتبہ تو یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ جب وہ ایک جگہ باتھ روم میں داخل ہونے لگے تو کسی اہل کار نے انھیں روک کر کہا: ''خواتین کا باتھ روم دوسری طرف ہے''۔

Marfat.com

اِس دلچسپ صورتِ حال کی وجہ سے جون ایلیا کو امریکہ اتنا پسند آیا کہ مشاعروں کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد اُنھوں نے اپنے ہم سفر شاعروں کے سامنے یہ تجویز رکھی: ''کیوں نہ ہم لوگ ایک بینجو خرید لیں اور ہم سب مل کر ایک منڈلی بنالیں''۔ سب نے اِس تجویز سے اتفاق کیا۔ امریکہ میں اِس قسم کے گروپ عام تھے جو گا بجا کر اپنی ضروریات پوری کرتے تھے۔ جون ایلیا کے مجوزہ گروپ کا نام ''کھسکے ہوئے لوگ'' رکھا گیا۔ محسن بھوپالی نے یہ واقعہ یہیں تک بیان کیا ہے۔ سفرنامے میں گروپ کی سرگرمیوں کی تفصیلات نہیں دیں، شاید اِس موضوع پر الگ کتاب لکھنے کا ارادہ ہوگا کیوں کہ کھسکنے والے قرطاس وقلم کے حوالے سے بھی کھسک سکتے ہیں۔

محسن بھوپالی نے جون ایلیا کا ایک اور واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک تفریح گاہ میں دو سیاح طالبات نظر آئیں تو مشاعرہ گردوں نے اُن کے ساتھ تصویر کھنچوائی تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ جب یہ طالبات رخصت ہوگئیں تو جون ایلیا نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا: ''اِن طالبات سے اِن کے نام اور پتے تو پوچھے ہی نہیں''۔ اِس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موصوف کی شاعری میں جو سوز و گداز ملتا ہے اُس کا ماخذ کس قسم کی محرومیاں ہیں۔

تصویروں کی بات چلی ہے تو یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ محسن کا سفرنامہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ دیکھنے کی بھی چیز ہے۔ اِس میں امریکہ کے بے شمار مناظر اور اہم عمارات کی تصویریں ہیں مگر کوئی تصویر اصلی حالت میں نہیں ہے، ہر عمارت کے سامنے اور ہر منظر کے درمیان جنابِ مصنّف اپنے شرکائے سفر کے ساتھ موجود نظر آتے ہیں۔ لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جنابِ مصنّف کو اپنی تصویریں چھپوانے کا شوق ہے۔ پوری کتاب میں اُن کی صرف تین درجن تصویریں شامل ہیں۔ صفحاتِ کتاب کی تعداد کے مقابلے میں تصویروں کی تعداد بہرحال بہت کم ہے۔

اِس سفرنامے کی تعریف کے لیے اگر صرف ایک لفظ استعمال کرنے کی پابندی لگا دی جائے تو وہ سوائے ''لذیذ'' کے کوئی اور لفظ نہیں ہوسکتا۔ دعوتوں اور انواع و اقسام کے کھانوں کا ذکر اِس کثرت سے کیا گیا ہے کہ مصنّف کے حافظے اور ہاضمے دونوں کی داد دینی پڑتی ہے۔ اُنھوں نے امریکہ میں قیام کے دوران جس دسترخوان سے جو فیض اٹھایا، اُس کی تفصیل کتاب میں موجود ہے۔ جن کھانوں کا ذکر کیا گیا ہے، اگر میزبانوں سے پوچھ کر اُن کے پکانے کی ترکیبیں بھی لکھ دی جاتیں تو یہ سفرنامہ گھریلو خواتین کے کام بھی آسکتا تھا۔

ساری دعوتوں کو ''گانے'' کا محنتانہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ کم از کم ایک دعوت ایسی ضرور نظر آتی ہے جس کے بعد شاعروں نے کلام نہیں سنایا۔ اِس دعوت کی تفصیل یہ ہے: ''کھانوں

Marfat.com

کی ورائٹی اور مختلف ڈشوں نے واضح کردیا کہ یہ نشست کلام سننے کے مطلب سے منعقد نہیں کی گئی تھی بلکہ اصل میں شعرا کو کھانوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے کی گئی تھی اور یہ بات اس وقت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی جب کھانے کے بعد فرح (میزبان) نے مہمانوں کے سامنے صرف پانچ مختلف پڈنگ کی ڈشیں لاکر رکھیں''۔

اِس دعوت کے بعد شعرا سے کلام نہ سننے کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ اتنا کچھ کھانے کے بعد شعرا کے لیے کلام سنانا ناممکن نہ رہا ہوگا یا پھر میزبانوں نے سوچا ہوگا کہ اتنی اچھی دعوت کے بعد کلام سن کر منھ کا مزہ خراب کیوں کیا جائے۔

محسن بھوپالی نے اگرچہ دیباچے میں یہ کہا ہے کہ اُنھوں نے سفرنامے میں کسی قسم کی معلومات پیش نہیں کیں، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ سفرنامے کے مطالعے سے قاری کی معلومات میں اضافہ نہ ہوتا ہو، بعض جگہ تو اُنھوں نے ایسے ایسے انکشافات کیے ہیں جن کا ذکر اِس سفرنامے سے پہلے تو کیا بعد میں بھی کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ مثلاً ایک جگہ یہ انکشاف کیا ہے: ''امریکہ میں ہر مقام پر قطار ضرور نظر آتی ہے، وہ بھی مخلوط، اگر دو آدمی بھی کسی دروازے، کسی کاؤنٹر یا کسی کھڑکی پر دیکھے ہیں تو برابر نہیں، آگے پیچھے''۔ اِس قسم کی معلومات کی بنا پر اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا، محسن بھوپالی نے اُسے از سرِ نو دریافت کیا ہے۔ دوسرے کارنامے کی اہمیت پہلے کارنامے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اِس سفرنامے کو پڑھنا ایک خوش گوار تجربہ ہے۔ محسن بھوپالی اُسی آسانی سے نثر لکھ لیتے ہیں جس آسانی سے وہ نظم لکھنے پر قادر ہیں۔ بلکہ نثر پر اُنھیں کچھ زیادہ ہی قدرت حاصل ہے، اِسی لیے وہ بعض لفظوں کے استعمال میں عام روش کی پیروی نہیں کرتے۔ مثلاً عام لوگ جہاں صرف ''مٹرگشت'' سے اپنا مفہوم ادا کر لیتے ہیں، وہاں محسن ''پیدل مٹرگشت'' لکھتے ہیں۔ اِسی طرح وہ اپنے لیے احترام کے الفاظ لکھنے سے بھی دریغ نہیں کرتے، اُنھوں نے جہاں کہیں اپنا اور اپنے ہم سفر شاعروں کا ذکر کیا ہے، وہاں ''ہم شعرائے کرام'' کے الفاظ استعمال کر کے عبارت کی معنویت میں اضافہ کیا ہے۔

ساقی فاروقی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے محسن بھوپالی نے بعض الفاظ کا املا بھی تبدیل کردیا ہے۔ ''بحث و تمحیص'' کو ''بحث و تمحیث'' لکھ کر ''ص'' کے غیر ضروری استعمال سے نجات حاصل کرلی ہے۔ دونوں لفظ ''ث'' سے لکھے جائیں تو اچھے لگتے ہیں۔ جن لوگوں کو ''ث'' ناپسند ہو وہ محسن کے وضع کردہ اصول کے مطابق ''بحص و تمحیص'' بھی لکھ سکتے ہیں۔

(۲ مئی ۱۹۹۶ء)

Marfat.com

سوختنی نہ فروختنی

پانچویں دہائی کے ابتدائی تین چار برسوں میں جب فیض کی کوئی نظم یا غزل جیل سے اسمگل ہو کر ادبی حلقوں میں بطور سوغات تقسیم ہوتی تھی تو ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا تھا۔ ''منھ سے نکلی کوٹھوں چڑھی'' کا صحیح مفہوم اُسی زمانے میں سمجھ میں آیا کہ ہر ادب دوست کی زبان پر فیض کی کسی نظم کا کوئی مصرع یا غزل کا کوئی شعر ہوتا۔ آج کل تو شاعر اور شاعری دونوں کی مقبولیت و شہرت کا انحصار گانے والوں پر ہوتا ہے لیکن اُس زمانے میں گانے والے شاعر کو شاعر نہیں بناتے تھے۔ شاعر جو کچھ بنتا تھا اپنے ہی زورِ سخن سے بنتا تھا۔ اُنھیں دنوں کی بات ہے کہ جیل سے ایک غزل ایسی بھی آئی جو فیض کی نہیں تھی مگر جس کا ایک شعر فیض کے شعروں ہی کی طرح دلوں میں گھر کر گیا۔ شعر یہ تھا:

کچھ عجب بوئے نفس آتی ہے دیواروں سے
ہائے زنداں میں بھی کیا لوگ تھے ہم سے پہلے

یہ شعر حسن عابدی کا ہے جو اُن دنوں فیض اور سجاد ظہیر سے ارادت مندی کی بنا پر داخلِ زنداں تھے۔ سجاد ظہیر سے ارادت مندی کچھ زیادہ ہی تھی اور یہی ارادت مندی سجاد ظہیر کی گرفتاری کا سبب بنی۔ ہوا یہ کہ جب حسن عابدی کو گرفتار کر کے تشدد کیا گیا اور اُن سے سجاد ظہیر کی قیام گاہ کا پتا پوچھا گیا تو اُنھوں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے قیام گاہ کی نشان دہی کر دی۔ حسن عابدی کو معلوم تھا کہ سجاد ظہیر کسی بھی خفیہ ٹھکانے پر دو تین روز سے زیادہ نہیں ٹھہرتے، لہٰذا پولیس جب نشان زد خفیہ ٹھکانے پر جائے گی تو سجاد ظہیر وہاں سے کہیں اور منتقل ہو چکے ہوں گے۔ مگر یہ اندازہ غلط نکلا۔ پولیس اُس ٹھکانے پر پہنچی تو گویا اپنی منزل مراد پر پہنچ

Marfat.com

گئی۔ ممکن ہے بعض لوگ سجاد ظہیر کی گرفتاری کو حسن عابدی کے نامۂ اعمال کی سیاہی سے تعبیر کریں اور خود حسن عابدی بھی اِس صورتِ حال سے خوش نہیں تھے۔ وہ اپنے ''جرمِ بے گناہی'' پر بے حد نادم تھے۔ سجاد ظہیر کی گرفتاری کی خبر سن کر اُن کا جو حال ہوا، اُسے اُنھوں نے ایک جگہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے: ''اُن کی گرفتاری میرے لیے ایک کرب ناک سانحہ تھا جس نے میری روح کو بری طرح پامال اور زخموں سے چور چور کر دیا''۔ لیکن ہمارے نزدیک سجاد ظہیر کی گرفتاری اردو ادب پر ایک بہت بڑا احسان تھا۔ اگر سجاد ظہیر پابندِ سلاسل نہ ہوتے تو اردو زبان ''روشنائی'' ''ذکر حافظ'' اور ''نقوش زنداں'' جیسی فکر انگیز کتابوں سے محروم رہ جاتی۔ ہمارا بس چلے تو مچھ (بلوچستان) کے سینٹرل جیل کی جس کال کوٹھری میں بیٹھ کر سجاد ظہیر نے یہ کتابیں لکھیں، اُس کی دیوار پر ایک یادگاری لوح نصب کرا دیں جس پر یہ عبارت لکھی ہو: ''حسن عابدی کا بے حد شکریہ کہ اُن کی وجہ سے سجاد ظہیر اِس کوٹھری تک پہنچے اور یہاں اُنھوں نے ایسی کتابیں لکھیں جو اردو ادب کا لازوال سرمایہ ہیں''۔

ہم معذرت خواہ ہیں کہ سجاد ظہیر سے متعلق جملۂ معترضہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا ہے۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی حسن عابدی کے اُس شعر کی جو زنداں کی چہار دیواری سے نکل کر پورے ملک میں خوش بو کی طرح پھیل گیا۔ یہ حسن عابدی کا پہلا بھرپور ادبی تعارف تھا اور یہ اِسی شعر کا کمال تھا کہ جیل جانے سے پہلے حسن عابدی کمیونسٹ پارٹی کے ایک غیر معروف کارکن تھے لیکن پونے تین سال بعد جیل سے باہر آئے تو وہ ایک ادبی شخصیت بن چکے تھے۔ مگر المیہ یہ ہوا کہ وہ ایک قید خانے سے رہا ہونے کے بعد ایک دوسرے قید خانے میں داخل ہو گئے اور یہ صحافت کا قید خانہ تھا۔ صحافت کا کمال یہ ہے کہ وہ ادیب کے تخلیقی جوہر کے لیے زہر ہلاہل کا کام کرتی ہے۔ صحافی بن کر کیسے کیسے ادیب ادبی دنیا میں نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئے! حسن عابدی اِس کان نمک میں پہنچ تو گئے لیکن خوش قسمتی سے پوری طرح نمک نہ بن سکے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے اندر کے شاعر نے صحافت کے ہاتھوں اپنی شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ شعر کہتے رہے اور گاہے گاہے اُن کی تخلیقات ادبی رسالوں میں شائع بھی ہوتی رہیں لیکن وہ صحافی ہی کی حیثیت سے پہچانے جاتے رہے۔ اُن کی شاعری کی شہرت ایک خاص حلقے تک محدود رہی۔

پاکستان میں صحافت اور پولیس دو شعبے ایسے ہیں جو اپنی خوش عنوانیوں کی وجہ سے خاصا رعب اور دبدبہ رکھتے ہیں۔ صحافت کو البتہ پولیس پر اِس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ پولیس والوں سے عام شہری ڈرتے ہیں اور صحافیوں کے سامنے پولیس والے بھی کچھ پینڈیے بن

Marfat.com

جاتے ہیں۔ پولیس پر اِس پیشہ ورانہ برتری کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض صحافی صحافت کے پردے میں بادشاہی کرتے ہیں اور کچھ شاعری سے بھی شوق فرمانے لگتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن کے ہر دوسرے مصرعے کا پہلے مصرعے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اِن دو مصرعوں میں سے بھی ایک ناموزوں ہوتا ہے۔ یہ صحافی شاعر دیکھتے ہی دیکھتے ''ممتاز شعرا'' میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ کوئی اُنھیں اِس خوش فعلی پر ٹوکتا نہیں۔ ٹوک بھی کیسے سکتا ہے۔ دریا اور مگرمچھ والی ضرب المثل ہونٹوں پر مہرِ خاموشی ثبت کر دیتی ہے۔

حسن عابدی اگر چاہتے تو اپنی صحافیانہ حیثیت کو اپنی شاعری کے ''فروغ'' کے لیے استعمال کر سکتے تھے لیکن اُنھوں نے صحافت کی بیساکھیوں سے کام لینے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اِس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ بیساکھیاں صرف معذوروں کے استعمال کے لیے ہوتی ہیں۔

جس ملک میں لوگ شاعری شروع کرنے سے پہلے ہی مجموعۂ کلام شائع کر دیتے ہوں، وہاں حسن عابدی جیسے خوش نوا شاعر کا نصف صدی کی مشقِ سخن کے بعد بھی مجموعہ شائع کرنے سے گریزاں رہنا بڑے حوصلے اور ہمت کی بات ہے۔ خدا بھلا کرے سحر انصاری اور بعض دوسرے دوستوں کا جن کے پیہم اصرار سے ریزہ ریزہ بکھرا ہوا شاعر ''نوشتِ نے'' کی صورت میں سامنے آیا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی گم شدہ دولت ہاتھ آ گئی ہو۔

ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ہم جب بھی کسی شاعر کی یا اُس کی شاعری کی تعریف کرتے ہیں تو بیمار پڑ جاتے ہیں اور یوں جھوٹ بولنے کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے لیکن اس وقت ہمیں سچ بولنے کی بھی سزا مل رہی ہے کہ حسن عابدی کی شاعری کی تعریف کے لیے مناسب الفاظ دستیاب نہیں ہو رہے۔ بہرحال ہم اِس قدر تو ضرور کہیں گے کہ پاکستان میں جو بے مزہ اور روایتی قسم کی شاعری ہو رہی ہے، حسن عابدی نے ''نوشتِ نے'' کی صورت میں اُس کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ بہت دنوں بعد ایک ایسا مجموعہ شائع ہوا ہے جسے جدید اردو شاعری کے چند نمایندہ مجموعوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

ترقی پسندوں کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ اُن کی شاعری میں نظریہ تو ہوتا ہے، نظر نہیں ہوتی۔ حسن عابدی نے اِس الزام کو بڑی خوب صورتی سے مسترد کر دیا ہے اور وہ اس طرح کہ اُن کے ہاں نظریہ شاعری کو مسخ نہیں کرتا بلکہ بین السطور میں اپنا جادو جگاتا ہے۔ حسن عابدی کی غزلیں ہوں یا نظمیں دونوں میں اردو شاعری کی روایات کی مکمل پاس داری ملتی ہے اور ساتھ ہی نئے حالات اور نئے تقاضوں کے پیشِ نظر پرانے لفظوں اور شعری پیکروں کو

Marfat.com

نئے مفاہیم و مطالب عطا کرنے کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ عام ترقی پسندوں کی طرح وہ نعروں سے سمع خراشی نہیں کرتے، دل و دماغ دونوں کو نہایت شایستہ پیرائے میں متاثر کرتے ہیں۔ اِس اعتبار سے وہ واحد ترقی پسند شاعر ہیں جن کا نام فیض کے نام کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ اِس دعوے کی دلیل کے طور پر حسن عابدی کی کچھ غزلوں اور نظموں کے حوالے سے گفتگو کی جائے لیکن اِس طرح یہ کالم نظیر صدیقی کا تنقیدی مقالہ بن جائے گا۔ تاہم ایک ایسی غزل کے چند اشعار سنائے بغیر نہیں رہا جاسکتا جو آج ہی کے دور میں لکھی جاسکتی تھی اور جسے حسن عابدی ہی لکھ سکتے تھے:

شہرِ ناپرساں میں کچھ اپنا پتا ملتا نہیں
بام و در روشن ہیں لیکن راستا ملتا نہیں
حاکموں نے شہر کے اندر فصیلیں کھینچ دیں
دن میں بھی اب کوئی دروازہ کھلا ملتا نہیں
آشنا چہروں سے رنگِ آشنائی اُڑ گیا
ہم زباں اب خشک پتوں کے سوا ملتا نہیں

حسن عابدی نثر بھی اچھی لکھتے ہیں۔ اُن کی صحافیانہ نثر تو ہم نے نہیں پڑھی لیکن ادبی تحریریں جو اِدھر اُدھر شائع ہوتی رہتی ہیں نظر سے گزری ہیں۔ سجاد ظہیر کا شخصی خاکہ اُنھوں نے بہت اچھا لکھا تھا۔ رسالہ ''افکار'' میں بطور مہمان مدیر وہ کبھی کبھی اداریے لکھتے رہتے ہیں جو خاصے فکر انگیز ہوتے ہیں۔ ایک ایسا ہی اداریہ جو گزشتہ مہینے کے افکار میں شائع ہوا ہے اِس وقت ہمارے سامنے ہے جس میں اُنھوں ادب کی مقبولیت کے مسئلے پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اِسی اداریے پر کالم لکھنے کا ارادہ تھا لیکن موصوف کی شاعری نے گمراہ کردیا اور آدھے سے زیادہ کالم مقدمۂ شعر و شاعری بن کر رہ گیا۔ خیر کالم میں جو تھوڑی سی جگہ رہ گئی ہے اُس میں مذکورہ اداریے سے استفادے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اِس اداریے کا آغاز اِس پریشان کن جملے سے ہوتا ہے کہ شاعر کو سخن شناس اور ادب کو اپنا قاری نہیں ملتا۔ اِس کے بعد کتابوں کے فروخت نہ ہونے، کتابوں کی دکانوں کے بند ہونے اور اُن کی جگہ جوتوں کی دکانیں کھل جانے پر اظہار افسوس کیا گیا ہے۔ اِس افسوس میں ہم برابر کے شریک ہیں لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر صورتِ حال وہ نہیں جو عابدی صاحب نے بیان کی ہے۔ سخن شناس اور ادب کے قاری تو موجود ہیں مگر خود ادب منظر سے غائب ہے، یہ جو رسالوں میں اور کتابی صورت میں طوامیرِ اغلاط شائع ہوتے رہتے ہیں، اگر اُنھیں کو آپ ادب

Marfat.com

کہتے ہیں تو پھر کتابوں کی دکانوں کی جگہ جوتوں کی دکانیں کھلنے پر خوش ہونا چاہیے کہ جوتے بہرحال انسانوں کی ایک بنیادی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ پہننے کے کام بھی آتے ہیں اور چلانے کے بھی۔ اِس کے برعکس ادب کا یہ حال ہے کہ سوختنی نہ فروختنی۔ ادب کے معیار کا اندازہ اِس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ کاغذ جو بازار میں سونے کے بھاؤ بکتا ہے جب اُس پر شاعری یا افسانے چھپ جاتے ہیں تو ردی کے بھاؤ بھی نہیں بکتا۔ یہاں تک کہ لوگ اعزازی نسخے لینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ ایسا بھی کیا اعزاز جو حاصل کرنے والے کے لیے شرمندگی کا باعث ہو۔

پچھلے دنوں طرح دار (نہ کہ مصرع طرح بردار) شاعر ظفر اقبال نے کہا تھا کہ موجودہ ادب کو دریا برد کر کے ہمیں نئی ادبی روایات قائم کرنی چاہییں۔ حسن عابدی نے اس خیال سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ ایسا کرنا بے نتیجہ عمل ہوگا۔ ہمیں ظفر اقبال اور حسن عابدی دونوں سے اتفاق نہیں ہے۔ ادب کو دریا برد کرنے کا نتیجہ نہایت نقصان دہ ہوگا۔ ساری دنیا میں یہ مہم چل رہی ہے کہ سمندروں اور دریاؤں کو آلایشوں سے پاک رکھا جائے۔ ہم اگر اس کے برعکس عمل کریں گے تو دنیا کیا کہے گی؟

حسن عابدی نے اِس رائے کا اظہار بھی کیا ہے: ''وہ ادیب جو ادب میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتے، اُن کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ میر اور غالب کے زمانوں میں بہت سے ایسے شاعر تھے جن کی بدولت ایسی چہل پہل اور تہذیبی سطح پر ایسی گہما گہمی پیدا ہوئی جس میں بڑے شاعروں کی تخلیقی امنگ اور اُپج بروئے کار آئی۔ وہ اربابِ فن جن کے نام آج یاد نہیں، خود تو کھاد بن گئے لیکن اس کھاد سے وہ قد آور درخت نمو پاسکے جن کے سائے شام ابد تک پھیلے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور جن کے پھلوں کی حلاوت خوش ذوق لوگوں کو ہمیشہ شاد کام رکھے گی''۔

حسن عابدی نے اپنا موقف ایسی خوب صورت نثر میں بیان کیا ہے کہ اُن کی بات مان لینے کو جی چاہتا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ دور کے بیشتر ادیب کسی آنے والے میر اور کسی آنے والے غالب کے لیے کھاد کا کام کر رہے ہیں اور ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اکادمی ادبیات ہمارے ملک کا کھاد بنانے والا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔

حسن عابدی کو اس پر بھی اصرار ہے کہ ادب کو اچھے اور برے کے درمیان تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی ادب اچھا یا برا نہیں ہوتا، بس ادب ہوتا ہے۔ ''تخلیقی عمل کے مرحلے میں تخلیق کار کو یہ کب یاد رہتا ہے کہ وہ کس درجے کا شعر یا ادب تخلیق کر رہا ہے، اُسے تو اپنے دل کا خون

Marfat.com

ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے''۔

حسن عابدی صاحب ! آپ کو تخلیق کار کا خون ہوتا ہوا دل تو نظر آ گیا۔ کبھی فرصت ملے تو سخن شناسوں اور ادب کے قارئین کے دلوں پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہاں بھی آپ کو خون کے سوا کچھ اور نظر نہیں آئے گا۔

(۱۹ر مئی ۱۹۹۶ء)

Marfat.com

خوفِ فسادِ خلق

ادارۂ یادگار غالب کراچی نے رسالہ ''غالب'' کا ایک ضخیم خصوصی شمارہ حال ہی میں شائع کیا ہے۔ جس میں انواع و اقسام کی تحریریں شامل ہیں۔ سب سے بڑا حصہ بزرگ (اور اب آں جہانی) ناول نویس اور افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک کے بارے میں ہے۔ اِس میں اشک کی شخصیت اور فن پر متعدد مضامین اور خود اشک کی ایسی تحریریں شامل ہیں جو پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ایک طویل مضمون اشک نے ن م راشد کے بارے میں لکھا ہے۔ کسی زمانے میں اشک نے سعادت حسن منٹو کا خاکہ ''منٹو میرا دشمن'' لکھا تھا۔ راشد کا خاکہ بھی ایسا ہی ہے جس میں دوستی سے زیادہ دشمنی کی روداد بیان کی گئی ہے۔

اشک عجیب و غریب مجموعۂ اضداد تھے۔ ہمیشہ سچ لکھتے تھے لیکن یہ سچ اُن کی شخصیت کا کوئی اچھا تاثر قائم کرنے میں مدد نہیں دیتا۔ بلکہ یہ بات یوں کہی جائے تو بہتر ہوگا کہ اُن کا سچ اُن کی شخصیت کے کسی نہ کسی تاریک گوشے سے پردہ اٹھاتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستگی کے زمانے میں اشک اور راشد میں ابتداءً خوش گوار تعلقات تھے لیکن رفتہ رفتہ معاملات خراب ہوتے چلے گئے اور دوستی کی بجائے دشمنی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ اشک نے راشد کو نقصان پہنچانے کے لیے طرح طرح کی سازشیں کیں، یہاں تک کہ اُن کے خلاف فرقہ وارانہ جذبات ابھارنے کی بھی کوشش کی۔ اِن سب باتوں کی تفصیلات پڑھتے ہوئے قاری کے دل میں راشد کے لیے ہم دردی کے اور اشک کے لیے نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ مگر قاری اس بات کی داد بھی دیتا ہے کہ اشک نے اپنی مکروہ حرکتوں کے بیان میں جس جرأت کا مظاہرہ کیا ہے، وہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ یہ شخصی خاکہ اُن لوگوں کو ضرور پڑھنا چاہیے جو یہ جاننا

Marfat.com

چاہتے ہیں کہ اہلِ ادب ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرنے اور نفرت پھیلانے کے لیے کس حد تک سرگرمِ عمل ہو سکتے ہیں۔ وہ ادیب جو ذاتی دشمنیوں اور گروہ بندیوں کا کاروبار کرتے ہیں، اُنھیں تو یہ خاکہ بطور ایک نصابی کتاب کے حفظ کرلینا چاہیے۔

''غالب'' میں دوسرا گوشہ انتظار حسین کا ہے۔ اِس میں انتظار حسین کا ایک انٹرویو اور دو مضامین ہیں۔ ایک مضمون ''تیرے بعد تیری بتیاں'' نہایت دلچسپ ہے۔ اِس میں انتظار حسین نے اپنا کچا چٹھا اِس طرح بیان کیا ہے جیسے (خدانخواستہ) ان کے انتقال کے بعد کوئی دوسرا اُن کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہا ہو۔ اِس مضمون کا آغاز یوں ہوتا ہے: ''انتظار حسین چل بسا۔ سن کر افسوس ہوا۔ اب یار لوگ کہہ رہے ہیں کہ تم اُسے جانتے تھے، اُس کے بارے میں کچھ کہو۔ میں کیا کہوں۔ یہ لوگ اُسے کہانی کار سمجھتے ہیں۔ میں دل ہی دل میں ہنستا ہوں کہ اللہ تیری قدرت، وہ کیا تھا لیکن لوگ اُسے کیا سمجھتے ہیں۔ اگر ہاپوڑ سے نہ نکلتا تو پاپڑ بیچتا۔ ڈبائی میں رہتا تو چلمیں بناتا۔ ہاپوڑ اور ڈبائی کے نام میں نے اِس لیے کہ وہ اِن دو بستیوں سے اپنا ناتا جوڑتا تھا۔ ڈبائی کو اپنی جنم بھومی بتاتا تھا۔ ہاپوڑ میں آکر چھوٹے سے بڑا ہوا۔ مگر اِن دو بستیوں سے اس نے سیکھا کیا؟ ڈبائی کے کمہار جتنی نفیس چلمیں بناتے ہیں، اتنی ہی کڈھب اُس نے کہانیاں لکھیں اور ہاپوڑ کے پاپڑ جتنے خستہ ہوتے ہیں، اتنی ہی کرخت اُس نے زبان لکھی۔ ڈبائی کے کمہاروں کا اُس پر پرچھانواں بھی پڑ جاتا تو اس کی کہانیوں کی کایا بدل جاتی''۔

انیس ناگی برسوں سے انتظار حسین کے خلاف لکھ رہے ہیں لیکن خود انتظار حسین نے اپنے خلاف جتنا اور جیسا لکھ دیا ہے، ویسا انیس ناگی کبھی نہیں لکھ سکے۔ اِس میں انیس ناگی کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا اُن کی زبان کا ہے جو اردو ہوتے ہوئے بھی عبرانی سے مشابہت رکھتی ہے۔ پچھلے دنوں انتظار حسین کراچی آئے تو ایک محفل میں اُن سے پوچھا گیا: ''انیس ناگی آپ کے خلاف لکھتے رہتے ہیں، اِس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے''۔ انتظار حسین نے کہا: ''موصوف کی تحریروں کے بارے میں آج تک کسی نے کوئی رائے قائم نہیں کی تو میں کون ہوتا ہوں رائے دینے والا۔ میرے خلاف کوئی لکھتا ہے تو بڑے شوق سے لکھے مگر غلط اردو میں نہ لکھے۔ اِس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے''۔ اِس پر کسی نے کہا: ''وہ ویسی ہی اردو لکھیں گے جیسی انھیں آتی ہے''۔ انتظار حسین نے جواب دیا: ''تو پھر میرے خلاف مضامین وہ مجھ سے لکھوا لیا کریں''۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ نظر مضمون شاید انتظار حسین نے انیس ناگی کے نام سے شائع ہونے کے لیے لکھا تھا جو غلطی سے خود اُن کے نام سے شائع ہوگیا۔ اِس غلطی کے ازالے

Marfat.com

کی اب ایک ہی صورت ہے کہ انیس ناگی اِس مضمون کے شروع اور آخر میں واوین استعمال کر کے اپنے نام سے چھپوالیں۔ جب واوین کے استعمال سے پی ایچ ڈی کے ضخیم مقالے تیار کیے جاسکتے ہیں تو ایک چھوٹے سے مضمون کا حقِ تصنیف اپنے نام منتقل کرنا کون سی مشکل بات ہے۔

انتظار حسین نے انیس ناگی کے خیالات کو اپنی زبان میں جس طرح پیش کیا ہے، اُس کی ایک چھوٹی سی مثال پیش کیے بغیر بات مکمل نہیں ہوگی۔ لکھتے ہیں: ''جس زمانے میں وہ ڈبائی میں تھا اُس زمانے میں اُس قصبے کی سڑکوں کی حالت بہت خستہ تھی۔ اُن پر یکے اِس طرح چلتے تھے کہ سواریوں کے جوڑ جوڑ ہل جاتے تھے۔ وہ وہاں رہتا تو ایسے ہی کسی یکے کا کوچوان ہوتا۔ لاہور آکر اس نے کہانیاں لکھنا شروع کردیں۔ کہانیاں کیا لکھتا تھا یکہ چلاتا تھا۔ ڈبائی کے یکوں کی طرح اُس کی کہانیوں کے بھی سارے انجر پنجر ڈھیلے ہیں''۔

''غالب'' میں ایک دلچسپ مضمون افسانہ نگار فردوس حیدر کا بھی ہے جس کا موضوع کشور ناہید کی آپ بیتی ''بُری عورت کی کتھا'' ہے۔ فردوس حیدر اور کشور ناہید میں طالب علمی کے زمانے سے گہری دوستی ہے۔ اتنی گہری کہ یوسف کامران سے کشور کی شادی کرانے میں فردوس حیدر نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ کشور نے اپنی کتاب میں اپنی اِس دوست کا ذکر نام لیے بغیر کیا ہے اور وہ بھی اِن الفاظ میں ''ایک دوست جو سائیکل چلاتی تھی''۔ فردوس حیدر کا مضمون اِسی جملے سے متاثر ہوکر لکھا گیا ہے اور نہایت عمدگی سے بتا دیا گیا ہے کہ سائیکل چلانے والی قلم چلانا بھی جانتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں: ''کشور کا اِس کتاب کے حوالے سے یہ مسئلہ بنتا ہے کہ اُس نے آج تک کسی کو اپنا دوست سمجھا ہی نہیں۔ زندگی میں جو کچھ حاصل کیا، مان لیا کہ اُس نے اپنے زورِ بازو سے کمایا، لیکن جو دوست وسیلہ بنے، جنھوں نے سکھ میں نہیں تو دکھ میں اُس کا ساتھ دیا، وہ بھی اُس کی تاریک زندگی میں مارے گئے۔ کہیں تو دوستی کا بھرم رکھتی ... میں لہولہان ہوکر سوچتی ہوں۔ ہم نے اپنی اپنی کہانیاں سنا کر ایک دوسرے کے آنسو پونچھے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ روئے ہیں۔ صرف اتنا ہی لکھ دیتی کہ فردوس ہر دکھ میں میرے ساتھ رہی ہے یا پھر سرے سے تذکرہ نہ کرتی۔ میں سمجھ لیتی مصلحتاً ایسا کیا ہے۔ میری شناخت سائیکل تو نہیں''۔

فردوس حیدر نے اپنی ممدوحہ کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو بڑے فن کارانہ انداز میں اُجاگر کیا ہے، ایک جگہ لکھتی ہیں: ''یوسف نے اگر اپنی سیکریٹری سے فلرٹ کیا تو کشور نے اُسے برابر کی چوٹ دی۔ وہ رو دھو کر بیٹھ جانے والی عورتوں میں سے نہیں، یہی اُس کی خوبی ہے جسے سب خواتین سراہتی ہیں اور جس سے ڈر کر ایک شاعر نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں اپنی بیوی کو کشور سے پردہ کراؤں گا۔ کشور کے پاس سب ادیبوں، شاعروں کے راز اس لیے ہوتے ہیں کہ وہ

Marfat.com

مردانہ وار اُن کی مدد کرتی ہے، لیکن وہ اِس اصول پر کاربند نہیں رہ سکتی کہ دائیں ہاتھ سے کسی کو اِس طرح دو کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو، اِس لیے سب اُس سے خوف زدہ رہتے ہیں''۔

فردوس حیدر نے اِس مضمون میں بہت سے ایسے سنسنی خیز واقعات بیان کیے ہیں، جنھیں کشور ناہید نے اپنی آپ بیتی میں نظر انداز کردیا تھا۔ اِس اعتبار سے اگر اِس مضمون کو ''بُری عورت کی کتھا'' کا تکملہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر کتاب کے اگلے ایڈیشن میں فردوس حیدر کے مضمون کو بطور ضمیمہ شامل کرلیا جائے تاکہ کشور ناہید کی زندگی کے وہ واقعات جو خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے تھے، مناسب طریقے سے محفوظ ہو جائیں۔

اِس رسالے کا ایک حصہ نادر اور غیر مطبوعہ خطوط کے لیے وقف ہے۔ یہ خطوط جوش ملیح آبادی، فراق گورکھ پوری، عصمت چغتائی، عزیز احمد، قدرت اللّٰہ شہاب اور ابن انشا جیسے مشاہیرِ ادب کے ہیں۔ بیشتر خط لاہور کے مشہور ناشر چوہدری نذیر احمد کے نام ہیں۔ اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے پچاس پچپن سال پہلے ہمارے ناشر، ادیبوں کی کیسی کیسی ناز برداریاں کرتے تھے اور کتابوں کے شائع ہونے سے پہلے اُن کا معاوضہ ادا کر دیتے تھے۔ وہ آج کل کے ناشروں جیسے نہیں تھے جو کتابوں کی طباعت کے اخراجات ادیبوں سے وصول کرتے ہیں اور پھر نقصان کا گوشوارہ دکھا کر، معاوضہ ادا کرنا تو کجا، ادیبوں سے لی ہوئی رقوم بھی ضبط کر لیتے ہیں۔ ذرا دیکھیے اُس زمانے کے ادیب ناشروں کے ساتھ کس لہجے میں گفتگو کرتے تھے۔ ایک کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں جوش ملیح آبادی سے معاملہ طے ہو رہا تھا کہ چوہدری نذیر احمد نے کتاب کا مسودہ دیکھنے کے لیے طلب کیا۔ جوش صاحب یہ گستاخی کس طرح برداشت کر سکتے تھے، جواب میں لکھتے ہیں: ''اگر آپ اِس بنا پر میرا مسودہ طلب فرما رہے ہیں کہ اِس کا اندازہ لگائیں کہ میرا کلام قابلِ اشاعت ہے کہ نہیں یا آپ کا یہ ارادہ ہو کہ آپ میرے کلام پر اصلاح دیں، تو بندہ پرور اگر آپ تمام کرۂ ارض کی تمام دولت میرے قدموں پر لا کر ڈال دیں اور قطبین کے درمیان پھیلی ہوئی زمین کی تمام و کمال جوانیاں میرے آغوش کے سپرد فرما دیں تو بھی میں اپنے مسودے کا ایک ورق تک نہیں روانہ کروں گا''۔

اِس رسالے میں اور بھی بہت سی اہم اور دلچسپ تحریریں ہیں، مگر اُن سب کے تعارف کی اس کالم میں گنجایش نہیں ہے، تاہم ڈاکٹر آفتاب احمد نے فیض کا جو شخصی خاکہ لکھا ہے، اُس کا ذکر کیے بغیر بات مکمل نہیں ہوگی۔ فیض کے بارے میں شخصی نوعیت کے مضامین بے شمار لکھے گئے ہیں، ڈاکٹر آفتاب احمد کا خاکہ اُن میں گلِ سر سبد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب، فیض کے قریبی دوستوں میں سے ہیں اور اُنھیں ایسی بہت سی باتیں معلوم ہیں جن تک کسی

Marfat.com

دوسرے کی رسائی نہیں۔ یہ فیض کا پہلا شخصی خاکہ ہے جس میں مکمل فیض نظر آتا ہے، ورنہ اب تک لکھنے والوں نے اپنے آپ کو فیض کی شخصیت کے کسی ایک پہلو تک محدود رکھا ہے اور وہ پہلو بھی مجلسی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ فیض کی ذاتی زندگی، یہاں تک کہ معاملاتِ دل ونظر سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر آفتاب احمد کا مضمون پڑھنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے فیض کی بعض نظموں کے واقعاتی پس منظر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً فیض کی مشہور نظم ''کوئی عاشق کسی محبوبہ سے'' کا پس منظر انھوں نے یہ بیان کیا ہے: ''ایک دن سہ پہر کے قریب میرے ہاں آئے اور تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد کہنے لگے تم ذرا مجھے قریب ہی ایک جگہ پہنچا دو۔ میرے ساتھ کار میں بیٹھے... ایک کوٹھی کے پچھواڑے کی طرف لے گئے جہاں نوکروں کے کوارٹر تھے اور دھوبیوں کی الگنیاں لگی ہوئی تھیں، وہیں اتر گئے اور یہ کہہ کر اندر چلے گئے کہ میں خود ہی واپس آجاؤں گا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک کار انھیں میرے گھر کے دروازے تک چھوڑ گئی۔ بہت خوش نظر آتے تھے، مجھے بتایا کہ آج بڑی مدت کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ اُن خاتون سے نوجوانی میں لائل پور میں رسم و راہ پیدا ہوئی تھی جو جلد ہی ایک شدید جذباتی لگاؤ میں تبدیل ہوگئی۔ پھر بوجوہ اُسے فراموش کرنا پڑا، مگر اِس کا اثر طبیعت پر بہت دیر رہا۔ فیض کی نظم ''کوئی عاشق کسی محبوبہ سے'' اگرچہ اِس واقعے کے کوئی سترہ برس بعد ۱۹۷۸ء میں لندن میں لکھی گئی مگر میرا قیاس ہے کہ اِس میں اِنھیں خاتون سے خطاب ہے''۔

فیض صاحب کتنے خوش معاملہ تھے۔ سترہ برس بعد سہی، قرضِ فن مع سود کے بالآخر ادا کردیا!

(۲۳رمئی ۱۹۹۶ء)

Marfat.com

شگفتہ بیانی یا آشفتہ بیانی

ایک زمانے میں ہمارے ادب میں انسانی عمر کے چودھویں، پندرھویں اور سولھویں سال کی بڑی اہمیت تھی۔ میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کا یہ شعر تو ضرب المثل بن چکا ہے:

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
مرادوں کی راتیں جوانی کے دن

کسی پرانے شاعر کا یہ شعر ایک زمانے میں زبان زدِ خاص و عام تھا۔ اِس کا دوسرا مصرع ایک فلمی گانے میں شامل ہو کر زیادہ شہرت پا گیا:

چودھویں منزل پہ ظالم آ گیا
چاند میرے چاند سے شرما گیا

اکبر الٰہ آبادی کی ابتدائی شاعری کا یہ نمونہ بھی پرانے زمانے کے عشاق کے دلوں کی دھڑکنیں تیز کر دیتا ہے:

چودھواں سال اُن کا ہے نامِ خدا
عمر آفت تھی، قیامت ہو گئی

ایک بزرگ شاعر کی اپنے کم سن محبوب کے لیے یہ دعائے نیم شبی بھی کچھ کم معنی خیز نہیں:

چودہ برس کے سن میں وہ لاکھوں برس رہے

لیکن بیسویں صدی میں سائنس اور طب کی ترقی کی وجہ سے انسان کی اوسط عمر بڑھ گئی ہے، اِس لیے اب چودھویں سال کی بجائے پچاسواں سال اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوںھی کوئی ادیب پچاس برس پورے کرتا ہے تو اُس کا طلائی جشن منایا جاتا ہے اور

Marfat.com

اُس کی شخصیت اور فن پر ایک عدد کتاب شائع کی جاتی ہے۔ ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان میں اِس دل خوش کن رسم کا چلن کچھ زیادہ ہی ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے ادیب وقت سے پہلے یعنی خاصی کم عمری ہی میں پچاس برس کے ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اب تک تین درجن سے زیادہ زندہ ادیبوں کو اُن کی شخصیت اور فن کے حوالے سے کتابیں شائع کر کے رسوا کیا جا چکا ہے۔ پاکستان ابھی اِس حد تک ترقی یافتہ نہیں ہوا، اِس لیے اِس قسم کی کتابوں کی تعداد نصف درجن سے زیادہ نہیں ہے۔ اِس تعداد کے بھی ایک تہائی حصے پر ڈاکٹر سلیم اختر قابض ہیں۔ اُن کی شخصیت اور فن کے بارے میں دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ شخصیت بڑی ہو اور فن کی جہات کثیر ہوں تو اُن کا احاطہ کرنے کے لیے ایک کتاب کم پڑ جاتی ہے۔ وہ زمانہ گیا جب کوزے میں دریا سمیٹ لیے جاتے تھے، اب کوزے سے دریا بہائے جاتے ہیں۔ بہر حال اِس قسم کی کتابوں سے یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ ہمارے ادیبوں کی ایک عدد شخصیت بھی ہوتی ہے جو اُن کے پاس ہو نہ ہو، اُن سے متعلق کتابوں میں لازماً دکھائی دیتی ہے۔

اِس سلسلے کی تازہ ترین کتاب امجد اسلام امجد کے بارے میں شائع ہوئی ہے۔ امجد ہمارے دور کے اُن معدودے چند اہلِ قلم میں سے ہیں جن کا شمار ادبی معجزات میں کرنا چاہیے۔ شاعری، ڈراما، تنقید اور سفرنگاری میں اُنھوں نے نام ہی نہیں کمایا، کمال بھی دکھایا ہے۔ پچھلے پچیس برسوں میں اُبھرنے والے شاعروں کے ہجوم میں وہ سب سے مختلف اور منفرد دکھائی دیتے ہیں۔ اُنھوں نے بقول فیض احمد فیض، آہنگ و اظہار کے نئے پیرائے دریافت کیے ہیں۔ یہی نہیں، اُنھوں نے اپنے عہد کے کرب کو جس اعلیٰ تخلیقی سطح پر پیش کیا ہے، اُس کی مثالیں اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ نقاد کی حیثیت سے امجد نے ہمارے کئی کلاسیکی شاعروں کو ازسرِ نو دریافت کیا ہے اور موجودہ عہد میں اُن کی شاعری کی معنویت اجاگر کی ہے۔ ڈراما نگاری میں اُن کا کارنامہ یہ ہے کہ ٹی وی کے لیے اُنھوں نے بیسیوں ایسے ڈرامے لکھے ہیں جن کی مقبولیت کی پہلے سے کوئی مثال نہیں ملتی۔ اُن میں سے بعض ڈرامے کتابی صورت میں شائع ہوئے تو ادبی سطح پر بھی اُنھیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ سفرنامے امجد نے ایسے لکھے ہیں کہ اُنھیں پڑھ کر بے اختیار غالب کا یہ مصرع زبان پر آتا ہے: زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گزرد۔ امجد کے سفرناموں میں عمر کی روانی کے ساتھ ساتھ نثر کی روانی بھی دیدنی ہے۔ شاعری کی طرح نثر میں بھی اُن کا ایک اپنا انداز ہے جو عام شعرا کی نثر کی طرح آشفتہ بیانی کا نہیں، شگفتہ بیانی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ عام شعرا جب نثر لکھتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے بے انتہا غصے میں کسی رقیب روسیاہ کے نام کھلی چٹھی لکھ رہے ہوں۔ امجد اپنی نثر میں رقیبوں کا ذکر بھی احمد فراز کے

Marfat.com

''جاناں جاناں'' والے لہجے میں کرتے ہیں۔

امجد کو بھی عام انسانوں کی طرح ایک دن پچاس برس کا ہونا ہی تھا، سو یہ لمحہ بھی آیا اور اُن کے ایک عقیدت مند زاہد حسن نے اِس مبارک لمحے کے استقبال کے لیے امجد کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب مرتب کردی جس میں موجودہ دور کے بہت سے اہم لکھنے والوں کے مضامین شامل ہیں۔ امجد خوش قسمت ہیں کہ اُن کے مداحوں میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، مشتاق احمد یوسفی، ڈاکٹر وحید قریشی، میرزا ادیب، اشفاق احمد، اعجاز بٹالوی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور سید ضمیر جعفری جیسے اکابرِ ادب شامل ہیں۔ اِن سب نے اور دوسرے بہت سے ادیبوں نے بڑی محبت سے امجد کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

مرتب نے بقولِ خود ''اپنی تمام تر توتیں صرف کر کے'' کتاب کے لیے مواد اکٹھا کیا ہے لیکن وہ امجد کے فن اور شخصیت کے مطالعے میں توازن برقرار نہیں رکھ سکے۔ فن پر ۲۷ مضامین ہیں اور شخصیت پر صرف تین۔ اِس سے مترشح ہوتا ہے کہ فن کے مقابلے پر شخصیت چھوٹی پڑگئی ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ امجد کی شخصیت بھی اُن کے فن کی طرح وسیع و عمیق ہے اور اس کی تائید مشتاق احمد یوسفی کے اِس بیان سے ہوتی ہے: ''برادرم امجد اسلام امجد پچاس سال کے ہو گئے۔ خوشی اِس بات کی ہے کہ خدا خدا کر کے سنِ بلوغت کو تو پہنچے اور تعجب اِس پر کہ کسی طرف سے بھی پچاس کے نہیں لگتے۔ اگر میرے اور امجد کے حلیے سے عینک، پیشانی اور بالوں سے بے نیاز سر کو خارج کردیا جائے تو بھی جو کچھ بچ رہے گا، وہ ہمارے استحقاق سے زیادہ مگر آرزو سے کم تر نکلے گا''۔

جس شخصیت سے اتنا بہت کچھ خارج کردینے کے بعد بھی بہت کچھ بچ جائے، اُس پر کتاب میں چھوٹے چھوٹے تین مضمون شامل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مرتب نے اپنی ''تمام تر توتوں'' کو صحیح طور پر استعمال نہیں کیا۔ بہرحال شخصیت پر مضامین کی کمی کی تلافی اُن نو عدد انٹرویوز سے ہو جاتی ہے جو کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ اِن سے امجد کی باغ و بہار شخصیت کے کئی گوشے سامنے آتے ہیں۔ سوالوں کے جواب دیتے ہوئے وہ مشکل سے مشکل مقام سے بھی بڑی آسانی سے گزر جاتے ہیں۔ بعض انٹرویو لینے والوں نے اُن پر جنرل ضیاء الحق کی مداحی اور ذاتی تعلقات سے ادبی فوائد اٹھانے کے الزامات لگائے۔ کوئی اور ہوتا تو یہ باتیں سن کر پریشان ہو جاتا لیکن امجد نے سوال کرنے والوں کو پریشان کردیا۔ اُنھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں کسی گھٹیا آدمی کو خوش کرنے کے لیے ضیاء الحق کو برا نہیں کہہ سکتا۔ ایک ایسے دور میں جب ضیاء الحق کو برا کہہ کر لوگ طرح طرح کے فائدے اٹھا رہے ہیں، امجد کا یہ

Marfat.com

رویہ ''وفاداری بشرطِ استواری'' کی بہترین مثال ہے۔

امجد نے ادبی معاملات میں بھی رائے دیتے ہوئے کسی مصلحت سے کام نہیں لیا۔ جو لوگ ناموزونیِ طبع کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں، وہ مزاحمتی شاعری کرتے ہیں یا پھر نثری نظموں سے دل بہلاتے ہیں۔ امجد اِس قسم کی خوش فعلیوں کو پسند نہیں کرتے۔ مزاحمتی شاعری کے بارے میں وہ کہتے ہیں: ''اِس کا مفہوم ہمارے ہاں عام طور پر غلط لیا جاتا ہے۔ برصغیر کے حوالے سے مزاحمتی شاعری انگریز کی ہندوستان میں موجودگی تک تھی۔ آزادی کے بعد کون کس سے مزاحمت کر رہا ہے''؟ ہمیں امجد کی اِس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی ادبی اصطلاح کا مفہوم ہر زمانے میں یکساں رہے۔ آزادی سے پہلے مزاحمتی شاعری ظالم و جابر حکمرانوں کے خلاف ہوتی تھی اور اب خود شاعری کے خلاف ہوتی ہے۔ یعنی مزاحمتی شاعری وہ ہے جس میں کوئی شاعرانہ خوبی نہ ہو اور اِس کے باوجود اُسے شاعری کا نام دیا جائے۔

نثری نظم کے بارے میں امجد کی رائے خاصی انتہا پسندانہ ہے۔ فرماتے ہیں: ''کچھ لوگ بنیادی طور پر شاعر نہیں ہوتے لیکن شاعر بننا چاہتے ہیں۔ چوں کہ اُن کے اندر شاعری کی بنیادی صلاحیت نہیں ہوتی تو وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ شاعرانہ خیال ہی شاعری ہے... ایک شخص نثر لکھتا ہے، شاعری نہیں کر سکتا تو وہ نثری نظم لکھ دے تو اُس کو میں شاعری نہیں مانتا''۔ اِس معاملے میں بھی ہمیں امجد سے اتفاق نہیں ہے۔ جن لوگوں کے اندر شاعری کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ شاعری کر کے اِس صلاحیت کو زائل کر لیتے ہیں لیکن جن میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی اُنھیں بھی تو بہرحال کچھ نہ کچھ کرنا ہوتا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھے، نثری شاعری کر لی۔ اِس میں کسی دوسرے کی گرہ سے کیا جاتا ہے۔ نثری شاعری کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو پڑھنے کی عادت نہیں ہے، وہ اپنی اِس عادت کے جواز میں نثری شاعری کو پیش کر کے نہایت خوش اسلوبی سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ پڑھنے سے نہ پڑھنا بدرجہا بہتر ہے۔

اِس کتاب میں امجد کے ادبی کالموں پر ایک سے ایک عمدہ مضمون شامل ہے لیکن سفرنامے کی داد جس طرح مشتاق احمد یوسفی نے دی ہے، وہ بے مثال ہے۔ یوسفی صاحب کا مضمون عطاء الحق قاسمی کے نام ایک خط کی صورت میں ہے، اُس میں وہ لکھتے ہیں: ''چند سال پہلے امجد اور آپ لندن آئے تھے تو میں نے اُن سے کہا تھا کہ بھائی میرے! وطن جا کر جو جی چاہے سو کرنا، بس سفرنامہ نہ لکھنا کہ سفرناموں کی صورت میں فکشن پڑھتے پڑھتے طبیعت اوب گئی ہے۔ اِس نصیحت کا اُن کے حساس دل پر ایسا اثر ہوا کہ گھر پہنچتے ہی سب کام دھندے چھوڑ کر سفرنامے میں جٹ گئے اور یہ ثابت کر دیا کہ: دیکھیں اِس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا۔

Marfat.com

سفرنامے میں ہماری نصیحت کا بطور خاص ذکر کیا، سب نے سفرنامے کی داد دی اور ہمیں آیندہ نصیحت کرنے سے باز رہنے کی تلقین کی"۔

یوسفی صاحب نے سفرنامہ نہ لکھنے کا مشورہ دینے کی جو وجہ بیان کی ہے، وہ درست ہو گی، لیکن اصل وجہ کچھ اور ہے جو ہم نے بہت دنوں پہلے امجد کے سفرنامے پر کالم آرائی کرتے ہوئے بیان کی تھی۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ جب یوسفی صاحب سفرنامہ نہ لکھنے پر امجد کو آمادہ کر لیتے تو اُس کے بعد شاعری ترک کرنے کا مشورہ بھی دیتے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی بزرگ کا ایک مشورہ مان لیا جائے تو دوسرے مشورے کے لیے زمین ہموار ہو جاتی ہے۔ امجد کو اگر بزرگوں کے مشوروں پر ہی عمل کرنا ہوتا تو وہ ادب کی بجائے کوئی بہتر شغل اختیار کرتے۔

زیرِ نظر کتاب کا ایک حصہ اُن خطوط پر مشتمل ہے جو تین درجن کے قریب ادیبوں نے امجد کے نام لکھے ہیں۔ اِن میں سے بعض خطوط بے حد دلچسپ ہیں۔ مشہور نقاد اور قائداعظم اکیڈمی کے ڈائریکٹر محمد علی صدیقی اپنے خط میں لکھتے ہیں: "کاش ہم سب ایک ہی شہر میں رہتے۔ اِس سلسلے میں میری choice لاہور ہوگی کہ یہ شہر حقیقتاً میرے دل سے بہت قریب ہے۔ میرے خاندان نے تقسیم سے قبل بھی راوی کا پانی پیا اور جب میں دوآبہ گنگ وجمن میں تھا، اُس وقت بھی میری بود و باش کے لیے سارا سامان اِسی شہر سے مہیا ہوتا تھا"۔

محمد علی صدیقی کی یہ خواہش کہ وہ کراچی چھوڑ کر لاہور چلے جائیں، ہمیں پسند نہیں آئی۔ کراچی کی ہر اچھی چیز کو لاہور یا اُس کے قرب و جوار میں منتقل کر دینے کا کام ایک عرصے سے جاری ہے۔ سب سے پہلے دارالحکومت پر ہاتھ صاف کیا گیا اور اُسے اسلام آباد منتقل کر کے کراچی کی اہمیت کم کی گئی۔ پھر اقبال اکیڈمی کو کراچی بدر کر کے سپردِ لاہور کر دیا گیا حالاں کہ اِس کی ضرورت نہیں تھی۔ اِس شہر میں علامہ اقبال کا مزار پہلے سے موجود تھا۔ اقبال اکیڈمی کی وجہ سے ایک ہی شہر میں علامہ کے دو مزار بن گئے۔ یہی سلوک مقتدرہ قومی زبان کے ساتھ کیا گیا اور یہ ادارہ کراچی سے اسلام آباد پہنچا دیا گیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اردو بولنے والے تو کراچی میں ہوں اور اردو کا مزار اسلام آباد میں بنایا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ غاصبوں کا بس نہیں چلتا ورنہ وہ کراچی کے سمندر کو بھی لاہور کے مضافات کالا شاہ کاکو یا چھانگا مانگا میں منتقل کر دیتے۔

حیف صد حیف کہ حالات اِس حد تک خراب ہو چکے ہیں کہ کراچی میں علم کا جو سمندر موجزن ہے، وہ ازخود لاہور منتقل ہونے کے لیے پر تول رہا ہے۔ محمد علی صدیقی کو کراچی کے مفاد میں ہم مشورہ دیں گے کہ وہ لاہور منتقل ہونے کی خواہش کو دل سے اُسی طرح نکال دیں جس طرح مقتدرہ اور اقبال اکیڈمی کو کراچی سے نکالا گیا تھا۔ اگر غاصبوں کو اِس خواہش کا علم ہو گیا تو

Marfat.com

وہ سب سے پہلے قائد اعظم اکیڈمی کو اُس کے ڈائریکٹر کی خواہش کے احترام میں لاہور منتقل کردیں گے۔ اس طرح کراچی کو ایک اور قومی ادارے سے محروم کردیا جائے گا۔ خود صدیقی صاحب کا مفاد بھی اِسی میں ہے کہ وہ کراچی میں رہیں۔ لاہور میں جن لوگوں کے درمیان رہنے کی اُنھیں خواہش ہے، وہ بہت اچھے لوگ ہیں لیکن اُن کے ساتھ رہنے سے تلفظ خراب ہو جائے گا۔ کیا صدیقی صاحب نے یہ چینی کہاوت نہیں سنی کہ جس کا تلفظ درست نہ ہو، اُس کا اخلاق بھی درست نہیں ہوتا۔

آخر میں ہم کتاب کے مرتّب کو اُن کی محنت کی داد دیتے ہوئے یہ عرض کریں گے کہ آپ نے کتاب کے آخر میں امجد کی تصانیف کی جو فہرست دی ہے، اُس میں ۲۸ ویں نمبر پر زیرِ نظر کتاب کا نام بھی شامل ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ یہ کتاب آپ نے مرتّب کی ہے، اِسے امجد کی تصانیف میں شامل کرنا بڑی زیادتی ہے کیوں کہ اُن کے نام سے اب تک خاصی معیاری کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں۔

دوسری کوتاہی یہ ہے کہ دیباچے میں آپ نے لکھا ہے کہ کتاب میں ۸۵ تصویریں ہیں حالاں کہ سرورق کی تصویر سمیت کتاب ایک سو پانچ تصویروں سے مزین ہے۔ ایک تو آپ نے کتاب میں اتنی کم تصویریں چھاپی ہیں اور اس پر ستم یہ کہ دیباچے میں اُن کی تعداد اور بھی کم کر کے بتائی ہے۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اِس کوتاہی کی تلافی لازماً ہونی چاہیے اور وہ اِس طرح کہ تصویروں کی تعداد بڑھا دی جائے اور دیباچے میں اِس سلسلے میں کوئی غلط بیانی نہ کی جائے۔ یہ صحیح ہے کہ کتابوں کے دیباچوں میں غلط بیانیوں کا عام رواج ہے لیکن جس غلط بیانی سے آپ کو یا امجد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، اُس کی ضرورت ہی کیا ہے!

(۱۳رجون ۱۹۹۶ء)

Marfat.com

تماشائے اہلِ قلم

میر تقی میر کے ۷۲ نشتر مشہور ہیں۔ ۷۳ واں ہم نے دریافت کیا ہے جو اُن کے دیوانِ اول میں ہے اور یہ ہے:

قیامت کو جرمانۂ شاعری پر
مرے سر سے میرا ہی دیوان مارا

میر صاحب کا معاملہ تو قیامت تک کے لیے ملتوی ہوگیا کہ وہ بڑے شاعر تھے لیکن ہمارے ننانوے فی صد ادیب اپنے حسنِ عمل کا نتیجہ اِسی دنیا میں دیکھ لیتے ہیں۔ اُن کی کتابیں کوئی نہیں پڑھتا۔ جب کوئی پڑھتا نہیں تو کتابوں کے فروخت ہونے کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ بس شرمندگی کی دولت ہاتھ لگتی ہے اور یہی دولتِ بیدار کتاب لکھنے والے کا خالص منافع ہوتی ہے۔

بیشتر ادیب اپنی کتابیں خود ہی چھاپتے ہیں، خود اِس لیے نہیں پڑھتے کہ اُن کا پڑھنے کا معیار لکھنے کے معیار سے نسبتاً بہتر ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ کتابیں ڈھیروں کی صورت میں پڑی رہتی ہیں اور دیمک کی شرحِ خواندگی میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔ جن نسخوں کو دیمک بھی چاٹنا گوارا نہیں کرتی وہ احباب میں مفت تقسیم ہوکر باہمی تعلقات کی خرابی کا سبب بنتے ہیں۔ مفت تقسیم ہونے والی کتابوں کا حشر اور بھی خراب ہوتا ہے کہ اُن سے سڑے ہوئے پھلوں اور سبزیوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے کہ انھیں کوئی بھی اپنے پاس رکھنا گوارا نہیں کرتا۔ ممکن ہے بعض لوگ ہماری یہ بات سن کر کہیں کہ تشبیہ ناقص ہے، پھل اور سبزیاں سڑنے سے پہلے تر و تازہ بھی رہ چکی ہوتی ہیں، جب کہ بیشتر کتابیں اِس مرحلے سے نہیں گزرتیں۔ معترضین کی خدمت میں

Marfat.com

عرض ہے کہ ہم اِس وقت شاعری نہیں کر رہے کہ کسی تشبیہ کے ناقص ہونے نہ ہونے کا خیال رکھیں، ہم کالم لکھ رہے ہیں، جیسا ناقص ہمارا کالم ہوتا ہے، اُس کی مناسبت سے ناقص تشبیہیں ہی سوجھ سکتی ہیں۔

پچھلے دنوں ایک مشہور نقاد سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا: ''میں نے پانچ برس تک ایک انگریزی اخبار میں اردو کتابوں پر تبصرے لکھے، اِس سارے عرصے میں ایک بھی ڈھنگ کی کتاب پڑھنے کو نہ ملی، افسوس کہ میرے پانچ سال ضائع ہوگئے''۔ ہم نے عرض کیا: ''آپ کو اپنے پانچ برسوں کے ضائع ہونے کا ملال ہے جب کہ ہمارے مصنفین اپنی پوری زندگیاں ضائع کر دیتے ہیں پھر بھی خوش رہتے ہیں''۔ جناب نقاد نے فرمایا: ''وہ اس لیے خوش رہتے ہیں کہ وہ کتابیں لکھتے ہیں اور میرے ملال کا سبب یہ ہے کہ میں اُنھیں پڑھتا ہوں''۔

اِن نقادِ محترم کے مقابلے پر ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے اکٹھے پانچ برس کبھی ضائع نہیں ہوئے۔ ہر دوسرے تیسرے سال ایک آدھ ایسی کتاب پڑھنے کو ضرور مل جاتی ہے جو بے شمار ''نانوشتہ بہ'' کتابوں کے ذریعے پہنچنے والے صدمے کے اثرات کو زائل کر دیتی ہے۔ اس وقت ایک ایسی ہی کتاب ''تماشائے اہلِ قلم'' ہمارے سامنے ہے جس کے مصنف محمد لطف اللہ خان ہیں۔ خان صاحب اگرچہ پیشہ ور مصنف نہیں ہیں لیکن ادبی حلقوں میں اُن کی شہرت پیشہ ور ادیبوں سے زیادہ ہے کیوں کہ اُنھوں نے ایک ایسا کام اپنے ذمے لے رکھا ہے جس کا ادب سے بہت گہرا تعلق ہے۔

خان صاحب گزشتہ نصف صدی سے آوازیں جمع کر رہے ہیں۔ آوازیں جمع کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے جس کے پاس بھی ایک ٹیپ ریکارڈر اور دس بیس ٹیپ ہوں، وہ آوازیں جمع کر سکتا ہے۔ لیکن خان صاحب نے جس بڑے پیمانے پر اور جیسی اعلیٰ مہارت سے یہ کام انجام دیا ہے، اُس کی پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں ہے اور شاید آیندہ بھی اس وادیِ پُر خار میں اُن جیسا کوئی آبلہ پا نہ آسکے کیوں کہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے، اپنی تہذیب و ثقافت سے ہماری دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اب ہم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو اجتماعی فائدے کا ہو۔ ہم ہر کام کرنے سے پہلے یہ سوچتے ہیں کہ اس سے ہمیں ذاتی فائدہ کیا ہوگا۔

خان صاحب کے کام کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے جتنی آوازیں جمع کی ہیں، اگر اُنھیں بغیر کسی وقفے کے مسلسل ۲۴ گھنٹے سنا جائے تو اس کے لیے تقریباً سوا سال کی مدت درکار ہوگی۔ اِن آوازوں کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بڑے شعبے

Marfat.com

مذہب، ادب، موسیقی اور سیاست سے متعلق ہیں۔ آپ اِن شعبوں سے متعلق کسی بھی ممتاز شخصیت کا تصور کیجیے اُس کی آواز خان صاحب کے پاس موجود ہوگی۔ مثلاً ادب ہی کے شعبے کو لیجیے۔ اِس میں کیا کچھ ہے، اِس کا اندازہ ایک واقعے سے کیجیے۔ ایک مرتبہ خان صاحب کے صدا خانے میں کچھ ادیب جمع تھے، ایک صاحب نے اُن کا امتحان لینے کے لیے کہا: ''آپ کے پاس مشہور ترقی پسند نقاد احتشام حسین کی آواز تو ہوگی''؟ یہ سوال اُنھوں نے اِس لیے کیا کہ احتشام حسین کبھی پاکستان نہیں آئے اور خان صاحب ہندوستان جا کر احتشام حسین کو ریکارڈ کرنے سے رہے۔ اِس کے جواب میں خان صاحب نے بمشکل دس سیکنڈ صرف کیے اور ایک ٹیپ چلا دیا۔ احتشام حسین ایک مشاعرے میں ترنم سے غزل سنا رہے تھے۔ سوال کرنے والے صاحب حیران رہ گئے۔ اُنھیں خود معلوم نہیں تھا کہ احتشام حسین صرف نقاد نہیں تھے، شاعر بھی تھے اور کسی زمانے میں مشاعروں میں ترنم سے غزلیں پڑھا کرتے تھے۔

خان صاحب کے پاس فیض کا پورا کلام اُن کی آواز میں موجود ہے جو فیض نے تقریباً ۲۵ برسوں میں قسط وار ریکارڈ کرایا تھا۔ فیض جب بھی کوئی نظم یا غزل لکھتے تھے، اُسے خان صاحب کے ہاں ضرور ریکارڈ کرا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ خان صاحب نے اُن سے کہا کہ آپ کا سارا کلام میرے پاس آپ کی آواز میں محفوظ ہے۔ میری خواہش ہے کہ اب ایک آدھ شعر ایسا بھی ریکارڈ کرا دیجیے جو کبھی شائع نہ ہوا ہو اور صرف میرے پاس محفوظ ہو۔ فیض نے اِس خواہش کو یوں پورا کیا کہ فی البدیہہ دو شعر کہے اور ریکارڈ کرا دیے وہ شعر یہ ہیں:

ذکر پھر کیجیے اُس گوشۂ تنہائی کا
جس میں ہر لحظہ بپا رہتی ہے اک محفلِ لطف
منزلِ نغمہ گراں، خانۂ شیریں سخناں
سربسر منبعِ سو لطف ہے یہ منزلِ لطف

یہ شعر فیض کی آواز میں صرف لطف اللہ خان کے پاس ہیں، اور کاغذ پر بھی یہ دوسری مرتبہ منتقل ہوئے ہیں۔ پہلی مرتبہ ''تماشائے اہلِ قلم'' میں درج ہوئے تھے۔ ممکن ہے بعض لوگ اِس پر حیرت کریں کہ فیض نے ''منبع صد لطف'' کی جگہ ''منبعِ سو لطف'' نظم کیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، اسلوبِ زندگی کی طرح فیض کا اسلوبِ سخن بھی خاصا بے تکلفانہ تھا۔ وہ لفظوں کو نگینوں کی طرح جڑتے تھے۔ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ نگینہ انگوٹھی میں جڑا جا رہا ہے یا انگوٹھے میں۔

خان صاحب کے صدا خانے کے شعبۂ ادب میں ادیبوں کی آوازوں میں اُن کی

Marfat.com

تخلیقات بہت بڑی تعداد میں محفوظ کی گئی ہیں۔ مگر سب سے اہم چیز یہ ہے کہ درجنوں ادیبوں نے بہت سی ایسی باتیں ریکارڈ کرائی ہیں جو کسی دوسری جگہ موجود نہیں۔ اِن میں سرفہرست ادیبوں کے ذاتی حالات ہیں۔ بہت سے ادیبوں کے مستند حالاتِ زندگی صرف خان صاحب کے صداخانے میں ملیں گے۔ اِسی طرح غیر مطبوعہ تخلیقات کا بہت بڑا ذخیرہ بھی اِس صدا خانے میں محفوظ ہے۔ موجودہ عہد کے ادیبوں کے بارے میں آیندہ زمانے میں جب تحقیق ہوگی تو محقق صرف کتابوں سے استفادہ کر کے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے، اُنھیں خان صاحب کے صدا خانے میں بھی کچھ وقت گزارنا ہوگا کہ یہاں وہ سب کچھ موجود ہے جو کتابوں میں دستیاب نہیں۔

خان صاحب نصف صدی تک ادیبوں اور شاعروں سے ملتے رہے ہیں، اِس کے باوجود اُن کا اخلاق خراب ہوا ہے نہ زبان۔ حسنِ اخلاق کا تو یہ حال ہے کہ وہ تیسرے اور چوتھے درجے کے شاعروں کو بھی اپنے اسٹوڈیو میں بلا کر اُن کا کلام ریکارڈ کر لیتے ہیں۔ اِسی لیے ہم خان صاحب کو چھیڑا کرتے ہیں کہ جن شاعروں کو ادب کی تاریخ یاد نہیں رکھے گی، وہ بھی آپ کے صدا خانے کے کسی گوشے میں دستیاب ہو جائیں گے۔ یہ ادب دوستی نہیں کھلی ادب دشمنی ہے۔ اِس کے جواب میں وہ بڑی معصومیت سے یہ کہتے ہیں: ''میرا مزاج ہی ایسا ہے کہ میں اُن چیزوں کی بھی قدر کرتا ہوں جن کی دوسرے ناقدری کرتے ہیں''۔

شاعروں ادیبوں سے اتنی میل ملاقات کے بعد بھی خان صاحب کی زبان کے خراب نہ ہونے کا ثبوت اُن کی زیرِنظر کتاب سے ملتا ہے۔ ایسی شگفتہ نثر ہماری نظر سے بہت کم گزری ہے۔ خان صاحب لکھتے نہیں تصویر کشی کرتے ہیں۔ ویسے تصویر کشی سے اُنھیں عملی دلچسپی بھی ہے۔ وہ فوٹو گرافر بھی ہیں اور مصور بھی۔ اُن کے صداخانے سے متصل اُن کا نگارخانہ ہے۔ گویا اُنھوں نے جنّتِ نگاہ اور فردوسِ گوش دونوں کا اہتمام کر رکھا ہے۔

''تماشائے اہلِ قلم'' میں جوش، جگر، فیض، راشد، حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیار پوری، استاد قمر جلالوی، عصمت چغتائی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور ذوالفقار علی بخاری کو زیب عنوان بنا کر مضامین لکھے گئے ہیں۔ ان سب سے مصنف کے تعارف کی بنیاد اُن کا صدا بندی کا شوق ہے۔ اِسی شوق نے ذاتی مراسم کی راہ ہموار کی اور بعض ادیبوں سے خان صاحب کے زندگی بھر کے لیے گہرے اور مخلصانہ تعلقات قائم ہوگئے۔ خان صاحب نے اپنی کتاب میں انھیں تعلقات کی روداد بیان کی ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ اِن مضامین میں صرف یہی کچھ ہو۔ مذکورہ ادیبوں سے تعلقات کی روداد کے علاوہ اور بہت کچھ بھی ہے اور یہی ''بہت کچھ'' اس کتاب کو

Marfat.com

مجموعۂ مضامین کی بجائے ایک آپ بیتی کی صورت عطا کردیتا ہے۔ اِس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ خان صاحب نے اپنے شوقِ صدا بندی کی داستان بیان کرتے ہوئے مذکورہ ادیبوں کے بارے میں اپنی یادداشتوں کو بھی سپردِ قلم کردیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب کسی عنوان پر مضمون لکھتے ہیں تو اُسی عنوان تک محدود نہیں رہتے، اُس عنوان کے حوالے سے یاد آنے والی غیر متعلق باتوں کو بھی مضمون کے دامن میں سمیٹتے چلے جاتے ہیں۔ خان صاحب کا انداز ایک ایسے قصہ گو کا سا ہے جو اصل قصے کے درمیان ضمنی قصے بھی سناتا جاتا ہے اور یہ ضمنی قصے اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ سننے والوں کا دھیان اصل قصے کی تکمیل کی طرف نہیں جاتا اور جاتا بھی ہے تو اُس وقت جب خان صاحب اپنے قاری سے معذرت کرتے ہیں کہ وہ اصل موضوع سے ہٹ کر بات کر رہے ہیں۔ یہ معذرت غیر ضروری ہے کہ کتاب کا حسن اصل موضوع سے ہٹ کر بات کرنے ہی سے نکھرتا ہے۔

ضمنی قصوں کی طرح کتاب میں درجنوں ضمنی شخصیات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اِن شخصیات کے ذکر سے خان صاحب نے اپنی یادوں کے چراغ روشن کیے ہیں اور ایک ایسی محفلِ خوش نفساں ترتیب دی ہے جس میں مشاہیر کے ساتھ ساتھ بہت سی ایسی شخصیات بھی نظر آتی ہیں جو ہماری ادبی و ثقافتی زندگی میں کبھی بہت فعال تھیں مگر اب زمانے نے اُنھیں فراموش کردیا ہے۔ ایسی ہی فراموش شدہ شخصیتوں میں مظفر حسین شمیم بھی ہیں۔ ایک زمانے میں اُن کی شاعری اور مضمون نگاری کا بڑا چرچا تھا۔ اردو کے کئی ادبی رسالوں میں اُن کا کلام اور مضامین چھپتے تھے۔ مگر آج اُن کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں۔ شہرت کا یہ عبرت ناک انجام دیکھ کر اُن ادیبوں سے ہم دردی پیدا ہوتی ہے جو صرف نام و نمود کی خاطر لکھتے ہیں اور لکھتے ہی چلے جارہے ہیں۔

فنی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو زیرِ نظر کتاب میں صرف تین مضامین ایسے ہیں جنھیں شخصی خاکوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہ مضامین حفیظ جالندھری، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور ذوالفقار علی بخاری سے متعلق ہیں۔ اِن تینوں کو خان صاحب نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور اِن کے بارے میں بعض ایسی معلومات فراہم کی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ خصوصاً حفیظ جاندھری کی شخصیت کے تو بعض ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور ناقابلِ یقین بھی۔ مثلاً حفیظ نے خان صاحب کے صداخانے میں اپنے جو حالاتِ زندگی ریکارڈ کرائے ہیں، اُن میں ایک یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ علامہ اقبال نے حفیظ سے کہا: ''تمھارا کلام سن کر جتنا سکون حاصل ہوتا ہے، اتنا اپنا کلام سن کر حاصل نہیں ہوتا''۔ علامہ کی یہ خواہش

Marfat.com

بھی تھی کہ جیسی شاعری حفیظ نے کی ہے، ویسی ہی وہ بھی کر سکیں۔ اچھا ہی ہوا کہ علامہ کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی، ورنہ حفیظ تو ہمارے پاس دو ہو جاتے اور اقبال ایک بھی نہ ہوتا۔

ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ جس زمانے میں حفیظ محکمۂ دفاع سے منسلک تھے، اُن دنوں اِس محکمے کے سیکریٹری اسکندر مرزا تھے۔ ایک مرتبہ حفیظ نے دفتری ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سیکریٹری کی اجازت کے بغیر وزیرِ دفاع سے ملاقات کی۔ اسکندر مرزا کو اِس کا علم ہوا تو اُنھوں نے جواب طلبی کے لیے حفیظ کو بلایا اور اہتمام یہ کیا کہ اپنے کمرے سے سب کرسیاں اٹھوا دیں تا کہ حفیظ آئیں تو کھڑے ہو کر بات کریں۔ حفیظ نے جب کمرے میں کوئی کرسی نہ دیکھی تو وہ اسکندر مرزا کے سامنے رکھی ہوئی میز پر بیٹھ گئے۔ اسکندر مرزا غصے میں آ گئے اور رولر اٹھا کر حفیظ کو مارنا چاہا۔ آگے کا واقعہ بزبانِ حفیظ یہ ہے: ''میں نے بڑھ کر پہلے تو پکڑا اُس کا رولر اور آگے بڑھ کر ایک تھپڑ اُس کے منھ پر دیا۔ میرے پاس پتھر پڑا ہوا تھا۔ پیپر ویٹ۔ میں نے اٹھا کر زور سے مارا جو اُس کی چھاتی پر پڑا''۔ اِس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ نرے شاعر نہیں تھے، ناسخ کی طرح زور آزمائی بھی کرتے تھے۔

''تماشائے اہل قلم'' اسم با مسمّیٰ کتاب ہے۔ محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' کی طرح کی ایسی ''تماشا گاہ'' ہے جس میں ادیبوں کے بے شمار کھیل تماشے دکھائے گئے ہیں۔

(۳ر اکتوبر ۱۹۹۶ء)

Marfat.com

جانِ عالم کا پری خانہ اور ریڈیو پاکستان

پچھلے دنوں کرکٹ کے نام ور کھلاڑی جاوید میاں داد نے غصے میں آکر کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کیا تو اُس پر ایک ادب دوست نے ہم سے پوچھا، اِس قسم کا غصہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو کیوں نہیں آتا۔ ہم نے عرض کیا، ہمارے ادیب اور شاعر اپنا سارا غصہ ادب پر ہی نکال لیتے ہیں اور خود اِس سے محفوظ رہتے ہیں۔ وہ کہنے لگے، صورت حال نہایت تشویش ناک ہے، ادیبوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن معیاری ادبی تخلیقات کا قحط ہے۔ اِس کا ایک ہی علاج ہے کہ جو ادیب غیر معیاری تحریروں کے انبار لگا رہے ہیں، وہ ادب سے تائب ہو کر کوئی آبرو مندانہ پیشہ اختیار کریں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جس طرح سرکاری ملازموں کو ناکارکردگی کی بنا پر جبری طور پر ریٹائر کردیا جاتا ہے، اُسی طرح ادب میں بھی جبری ریٹائرمنٹ کا سلسلہ شروع کردیا جائے۔

اِس کے جواب میں ہم نے عرض کیا، ادیب کسی کے ملازم تو ہوتے نہیں جو اُنھیں جبری طور پر ریٹائر کیا جاسکے۔ ادب ایک خود اختیاری شغل ہے اور خود کردہ را علاجے نیست۔ موصوف ہمارے اِس جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور کہنے لگے، کم از کم یہ تو ہوسکتا ہے جو ادیب سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوں، وہ ساتھ ہی ادب سے بھی ریٹائرمنٹ کا اعلان کردیں۔ ہمارے اظہارِ تعجب پر اُنھوں نے اپنی بات کی وضاحت یوں کی عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بعض سرکاری ملازم جنھیں ادب سے دلچسپی ہوتی ہے، دورانِ ملازمت اِس خوف سے کتابیں نہیں لکھتے کہ کہیں اُن کے اس کام کو بھی اُن کی ناقص کارکردگی میں شمار نہ کرلیا جائے، لہٰذا وہ ریٹائر ہوتے ہی کتابوں کے انبار لگا دیتے ہیں، اِس سے انھیں تو شہرت ملتی ہے لیکن ادب کی شہرت

Marfat.com

خراب ہوتی ہے۔

ہمیں معلوم نہیں ہمارے ادب دوست کرم فرما کا اشارہ کن ادیبوں کی طرف ہے، لیکن جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، ہم کم از کم ایک ایسے ادیب کو جانتے ہیں جو سرکاری ملازمت کے دوران ہی نہیں، ریٹائر ہونے کے بعد بھی ادب کی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ہمارا اشارہ جمیل زبیری کی طرف ہے جو بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور غیر بنیادی طور پر بھی بہت کچھ لکھتے رہتے ہیں، یعنی ایسے کام کرتے ہیں جو ادب کی تخلیق سے زیادہ مفید ہیں۔ جیسے انھوں نے برٹرینڈرسل کی شہرۂ آفاق کتاب Conquest of Happiness کا اردو ترجمہ ''دائمی مسرّت کا حصول'' کے نام سے کیا ہے۔ یہ ایک نہایت عمدہ کام ہے۔ ترجمہ ایسا سلیس اور رواں دواں ہے کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ کتاب اصلاً اردو میں لکھی گئی ہو اور بعد میں اِسے انگریزی میں منتقل کیا گیا ہو۔ اردو میں ایسی مفید کتابوں کو منتقل کرنا طبع زاد افسانے لکھنے اور شعر کہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اِس سے ہمارا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ جمیل زبیری کو طبع زاد افسانے لکھنے کی بجائے غیر ملکی زبانوں کے اچھے افسانوں کا ترجمہ کرنا چاہیے، اُنھیں دونوں کام کرنے چاہییں تاکہ اُنھیں معلوم ہوتا رہے کہ آج کے اردو افسانے کو عالمی افسانے کی سطح تک پہنچنے کے لیے کتنی صدیاں درکار ہوں گی۔

جمیل زبیری کا تازہ ترین کارنامہ اُن کی کتاب ''یادخزانہ'' ہے جس میں اُنھوں نے ریڈیو پاکستان سے اپنی وابستگی کے ۲۵ برسوں کی یادوں کو بڑی خوش اسلوبی سے کاغذ پر منتقل کیا ہے۔ یہ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ہم نے اِسے دو مرتبہ پڑھا۔ پہلی مرتبہ یہ جاننے کے لیے کہ کتاب کیوں لکھی گئی ہے اور دوسری مرتبہ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کس کے لیے لکھی گئی ہے۔ پہلے سوال کا جواب یہ ملا کہ ہر آدمی کی اپنے ماضی سے دلچسپی ہوتی ہے، اس لیے جب وہ ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اُس کے پاس صرف ماضی ہوتا ہے تو وہ اپنے زمانۂ حال اور بچے کھچے مستقبل کو خوش گوار بنانے کے لیے ماضی کی یادوں سے دل بہلاتا ہے۔ جمیل زبیری نے اپنے گزرے ہوئے لمحوں کی خوش گوار یادوں سے اپنے حال و مستقبل کو خوش گوار بنانے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ملا کہ یہ کتاب اُن لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے جنھیں یہ معلوم نہیں کہ راجہ اندر اپنے اکھاڑے کے لیے اور جانِ عالم واجد علی شاہ اپنے پری خانے کے لیے خواہ مخواہ بدنام ہیں، ایسے کئی اکھاڑے اور کئی پری خانے تو ریڈیو پاکستان کے ایک گوشے میں سما سکتے ہیں۔

اس کتاب کا نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں خواتین کا تذکرہ بڑی کثرت اور

Marfat.com

فراخ دلی سے کیا گیا ہے۔ ہر دوسرے صفحے پر کوئی نہ کوئی خاتون جلوہ گر نظر آتی ہے۔ کہیں کوئی ڈراما آرٹسٹ ''صدا بہار'' نظر آ رہی ہے اور کہیں کوئی گلوکارہ آواز کا جادو جگا رہی ہے۔ کہیں کوئی شاعرہ شاعری کا موضوع بنی ہوئی ہے اور کہیں کوئی افسانہ نگار حقیقتوں کو افسانہ بنا رہی ہے۔ اِن سب کے بارے میں جمیل زبیری نے دلچسپ تفصیلات فراہم کی ہیں اور اُن کے فن اور ناک نقشے پر فکر انگیز تبصرے بھی کیے ہیں۔ اِس مناسبت سے کتاب کا نام ''یاد خزانہ'' کی بجائے ''تذکرۃ الخواتین'' بھی ہو سکتا ہے کہ پرانے زمانے میں ایسی کتابیں ایسے ہی ناموں سے لکھی جاتی تھیں۔ ہم نے یہ بات اعتراضاً نہیں، جذبۂ ممنونیت کے تحت کہی ہے کیوں کہ کتاب کے مطالعے سے پہلے کئی معروف ''خواتین'' کے بارے میں بہت سی غیر معروف تفصیلات کا ہمیں علم نہ تھا۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جنابِ مصنف کے ماضی کی یادیں، پڑھنے والوں کے مستقبل کو بھی خوش گوار بناتی رہیں گی۔

اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ریڈیو پاکستان میں یوں تو ایک سے ایک قابل آدمی موجود تھا، لیکن اِس ادارے کی رونق ''اہلِ دل'' کی وجہ سے تھی۔ اِن اہلِ دل سے متعلق جو داستانیں کتاب کے صفحات پر بکھری ہوئی ہیں، اُنھیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ریڈیو والے ڈرامے نشر ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ اُن کی اپنی زندگیاں بھی ڈرامائی انداز سے گزرتی تھیں۔ حقیقی زندگی کے عشقیہ ڈرامے، المیہ اور طربیہ دونوں طرح کے ہوتے تھے۔ مثلاً کہیں کوئی اناؤنسر کسی گلوکارہ کے لیے افیون کھا کر خودکشی کر رہا ہے تو کہیں کوئی پروڈیوسر اپنے ''محبوبِ نظر'' کے ہاتھوں افیون کی بجائے کچھ اور کھا کر نفس کشی کر رہا ہے۔ ''کچھ اور'' کی توضیح جنابِ مصنف کی زبانی بہتر رہے گی۔ ایک پروڈیوسر کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ''ان کی بڑی کم زوری عورت تھی ... ایک مرتبہ انھوں نے ریڈیو کی ایک اناؤنسر (جو بے چاری بیوہ ہو گئی تھی) سے اظہارِ عشق کر کے شادی کا اظہار کر دیا، سنا ہے کہ اس نے فوراً جوتا اتار لیا تھا''.... اِسی ایک پروڈیوسر پر کیا موقوف، زیرِ نظر کتاب میں ریڈیو کے تقریباً ہر کارکن کی ''بڑی کم زوری'' یکساں دکھائی دیتی ہے۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اِس کتاب کے ہر دوسرے صفحے پر کسی خاتون کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ اِسی طرح ہر تیسرے صفحے پر کسی نہ کسی شادی کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ کہیں شادی چوری چھپے ہو رہی ہے اور کہیں برسرِ عام کہیں مرد کسی عورت کو ورغلا کے اور کہیں عورت کسی مرد کو ''اغوا'' کر کے شادی کر رہی ہے۔ کہیں شادی کے خلاف فریقین کے بزرگ شور مچا رہے ہیں۔ کہیں کسی ریڈیائی شادی کی خوشی میں جنابِ مصنف اپنے دستِ مبارک سے مٹھائی تقسیم کر رہے

Marfat.com

ہیں۔ غرض کہ کتاب کیا ہے کسی نکاح خواں کا رجسٹر معلوم ہوتی ہے، جس میں بے شمار نکاحوں کے کوائف درج ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ ریڈیو پاکستان ایک نشریاتی ادارہ ہے، اب معلوم ہوا کہ یہ اچھا خاصا میرج بیورو ہے۔

جمیل زبیری شادی بیاہ کے معاملات میں حتی المقدور دوسروں کی مدد کرتے تھے۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے کئی دلچسپ واقعات بھی لکھے ہیں۔ اِس قسم کا ایک دلچسپ واقعہ سنائے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ لکھتے ہیں: ''... میرے کمرے میں آئیں، چہرے پر پریشانی کے کچھ آثار تھے، میں نے جیسے ہی اُن سے وجہ پوچھنے کی کوشش کی، وہ ایک دم رونے لگیں اور اُن کے لمبے لمبے آنسو اُن کے چہرے پر ڈھلکنے لگے۔ میں ایک دم پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور اُن سے کہا کہ بھئی کیا بات ہوگئی۔ آخر آپ اِس طرح کیوں رو رہی ہیں، نہ روئیں اور مجھے وجہ بتائیں۔ دفتر میں آپ کو اِس طرح نہیں رونا چاہیے کوئی آئے گا تو کیا سمجھے گا۔ لوگوں کو میرے متعلق بھی غلط فہمی ہوسکتی ہے۔ پھر اُنھوں نے دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھے اور کہنے لگیں: ''میں نے وہ جو ایک ڈاکٹر آتے ہیں، اُن سے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے''۔

اِس واقعے کی جان یہ جملہ ہے کہ ''لوگوں کو میرے متعلق بھی غلط فہمی ہوسکتی ہے''۔ اِس پر ہم تبصرہ نہیں کریں گے، البتہ اِس پر تعجب ضرور کریں گے کہ اکثر خواتین جنابِ مصنف کے پاس آتے ہی رونے لگتی تھیں۔ مذکورہ خاتون تو اس لیے روئی تھیں کہ وہ شادی کے لیے پریشان تھیں، ایک اور خاتون کے رونے کا سبب شادی میں ناکامی تھا۔ اُن کا قصہ بھی سن لیجیے: ''ایک روز ایک خاتون میرے پاس آئیں، سخت پریشان چہرے پر ہوائیاں اُڑتی ہوئیں... میں نے پوچھا، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔ ہمدردی کے یہ دو بول سن کر رونے لگیں اور لمبے لمبے آنسو اُن کے گالوں پر بہنے لگے۔ میں ایک دم پریشان ہوگیا۔ میں نے اُن سے کہا آپ روئیں نہیں اور مجھے بتائیں کہ کیا بات ہے۔ پھر اُنھوں نے اپنا پورا حال بتایا کہ کس طرح اُن کے شوہر نے انھیں طلاق دے کر گھر سے نکال دیا...''۔

مذکورہ دونوں واقعات میں خواتین کے لمبے لمبے آنسو ایک ہی انداز سے بہے، البتہ جمیل زبیری کی پریشانی کا اظہار قدرے مختلف انداز سے ہوا۔ پہلے واقعے میں وہ پریشانی میں اُٹھ کر کھڑے ہوگئے، مگر دوسرے واقعے میں وہ کرسی پر بیٹھے رہے۔ خیر یہ جملہ تو معترضہ تھا جو بات کہنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ موصوف کے پاس ضرور کوئی باطنی کمال ہوگا جس کی وجہ سے وہ خواتین کے مسائل حل کر دیتے تھے، ورنہ کوئی خاتون شادی کے لیے یا طلاق حاصل کرنے کے فوراً بعد کسی وکیل کی بجائے ریڈیو پاکستان کے ایک افسر کے پاس کیوں جاتی!

Marfat.com

ریڈیو پاکستان میں کیسے کیسے لوگ ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے، اِس کا اندازہ اِس سے کیجیے کہ ایک اسٹیشن ڈائریکٹر کھانے پینے کے اتنے شوقین تھے کہ وہ بیشتر وقت کھانے میں اور موقع مل جائے تو پینے میں صرف کرتے تھے۔ عملے کے ساتھ میٹنگ کے دوران سکھوں کے لطیفے سنایا کرتے تھے اور جو وقت بچ جاتا تھا، اُس میں دوسروں کی برائیاں کیا کرتے تھے۔ ایک افسر نے بڑی مزاحیہ طبیعت پائی تھی لیکن اُن کے مزاح کا معیار بقولِ مصنف یہ تھا: ''ایک مرتبہ ایک ڈراما آرٹسٹ اُن کے کمرے میں بیٹھی تھی، میں بھی اتفاق سے وہاں کسی کام سے گیا، میرے سامنے ہی اُنھوں نے اپنے موزے اتارے اور اُس کی ناک کے سامنے لے جا کر زور زور سے ہنسے اور کہنے لگے ''لو سونگھو'' ... جس ادارے میں اِس ذہنی سطح کے لوگ کام کرتے ہوں، وہاں جمیل زبیری جیسے شایستہ اور نستعلیق انسان کا ۲۵ برس گزار لینا بڑی ہمت کی بات ہے۔

اِس کتاب کا خاصا بڑا حصہ ادیبوں کے بارے میں ہے۔ ریڈیو کے ملازم ادیبوں کا ذکر تو برمحل ہے کہ کتاب ریڈیو کے حوالے سے لکھی گئی ہے اور ایسے ادیبوں میں سے بعض کے بارے میں نادر معلومات ملتی ہیں۔ مثلاً بعض اخبارات میں سیاسی مضامین لکھنے پر سلیم احمد مرحوم سے جواب طلبی کی گئی تو جمیل زبیری کو انکوائری آفیسر مقرر کیا گیا۔ اِس واقعے کی جو تفصیل جمیل زبیری نے بیان کی ہے وہ سلیم احمد کے سوانح نگار کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن عام ادیبوں شاعروں کے تذکرے سے کتاب کو گراں بار کرنے کی بلاوجہ کوشش کی گئی ہے۔ اِس سلسلے میں مصنف نے یہ طریقِ کار اختیار کیا ہے کہ پہلے شاعر یا شاعرہ سے اپنی سرسری ملاقات کا ذکر کیا ہے، پھر اُس کے کلام پر رائے دی ہے، آخر میں دو چار شعروں کی صورت میں نمونۂ کلام پیش کردیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کلام پر جو رائے دی ہے وہ متعلقہ شاعر کے مجموعۂ کلام کے فلیپ سے نقل کرلی ہے۔ اقتباس واوین میں ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ رائے کس کی ہے۔ ان سب باتوں کا ریڈیو سے کوئی تعلق ہے نہ مصنف کی یادداشتوں سے مگر اِس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کام کی بھی اپنی جگہ ایک اہمیت ہے۔ کراچی کے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں اگر کوئی پچاس سال بعد تحقیق کرنا چاہے گا تو یہ کتاب اُس کی بڑی مدد کرے گی۔ محقق کو بہت سے ادیبوں شاعروں کے نام اس کتاب کے علاوہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آئیں گے۔

جمیل زبیری چوں کہ افسانہ نگار ہیں، اس لیے اُنھوں نے بعض افراد کا ذکر کرتے ہوئے ادب تخلیق کیا ہے۔ مثلاً ایک خاتون کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مجھے وہ دیگر فن کاروں سے مختلف نظر آئیں۔ وہ ایک خوش شکل، خوش لباس اور خوش وضع خاتون ہیں، اُن کی

Marfat.com

آنکھوں میں سیاہی کے علاوہ گہرائی بھی ہے، چہرے کے نقوش بردباری سے مل کر بتاتے ہیں جیسے اُنھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔''

جمیل زبیری آنکھوں کی سیاہی اور گہرائی کو خوب سمجھتے ہیں، اِس لیے انھوں نے جا بجا آنکھوں کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں۔ مثلاً ''عینک کے شیشوں کے پیچھے اُس کی بڑی بڑی سرگیں آنکھیں نظر آ رہی تھیں، اُسے دیکھ کر پہلی بات جو ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ اُس کے چہرے پر اُس کی عینک کا فریم کچھ زیادہ ہی بڑا تھا''۔ اب ایک شاعرہ کی آنکھوں کا قصیدہ بھی سن لیجیے: ''خوابوں کی شاعرہ ہیں، وہ اپنی جاگتی اور سوتی آنکھوں سے خوابوں کے جتنے ذائقے چکھتی ہیں پہلے اُن کا بین السطور اظہار کرتی ہیں، مگر اب اِن ذائقوں کو بلاکم و کاست الفاظ کے گجرے پہنا کر اپنے قاری کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ اُن کی پلکوں کی منڈیر پر دیکھے اور اَن دیکھے خوابوں کی قطاریں جلتی ہیں تو اُن سے ہفت رنگ کرنیں پھوٹتی ہیں اور انھی کرنوں کا عکس جب اُن کی شاعری پر پڑتا ہے تو دھنک کے سارے رنگ مجسم ہو کر الفاظ کی بانھوں میں سمٹ آتے ہیں''۔

واضح رہے کہ پلکوں کی منڈیر پر خوابوں کے دیے جلانے والی اِن شاعرہ کا ریڈیو پاکستان سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا، اِس کے باوجود وہ ریڈیو سے متعلق ۲۵ سالہ یادوں کا حصہ بن گئیں۔ معلوم نہیں یہ شاعرہ کا کمال ہے یا مصنف کا۔ بہرحال مصنف کے اس کمال کا اعتراف تو کرنا ہی پڑے گا کہ اُنھوں نے ایک شاعرہ کی تعریف شاعری ہی کی زبان میں کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اچھی نثر ہی نہیں، اچھی نثری نظم لکھنے پر بھی قادر ہیں۔

(۵ رمئی ۱۹۹۴ء)

Marfat.com

مشاہیر یا مساکین

منظر علی خاں منظر نے عجب ذہنِ رسا پایا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بینکار ہیں لیکن ایک کھاتہ دنیائے ادب میں بھی کھول رکھا ہے جس میں وہ کتابیں لکھ لکھ کر جمع کراتے ہیں، اور اصل سے کئی گنا زیادہ منافع ادبی شہرت کی صورت میں وصول کرتے رہتے ہیں۔ نثر اور نظم دونوں میں اُن کے کمالات کا اظہار ہوا ہے۔ نثر لکھتے ہیں تو انیسویں صدی کے ''اودھ پنچ'' کے اسلوب میں اور شعر کہتے ہیں تو بیسویں صدی کے نوح ناروی کے رنگ میں۔ ان جیسے ادیب کم ہوں گے جو پوری دو صدیوں پر حاوی ہوں۔

منظر علی خاں خود ہی نہیں لکھتے بلکہ اُنھوں نے بے شمار لوگوں کو بھی لکھنے کے کام پر لگا رکھا ہے۔ خود لکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ اِس کے لیے صرف کاغذ، قلم اور ارادے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن دوسروں سے لکھوانا بہت مشکل کام ہے اور یہ مشکل اُس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب موضوع ٹیڑھا ہو۔ منظر صاحب اپنی نصف درجن تصانیف پر ایک سو سے زیادہ لوگوں سے مقدمے، دیباچے، فلیپ کی آرا اور توصیفی خطوط لکھوا چکے ہیں۔ اِن لکھنے والوں میں متعدد ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں منظر صاحب ہی کی وجہ سے زندگی میں پہلی اور آخری بار قلم اور کاغذ کے استعمال کا موقع ملا ہے۔

اِسی لکھنے لکھانے کے شغل کی بنا پر منظر صاحب کا ذاتی شعبۂ تعلقاتِ عامہ خاصا وسیع اور فعال ہے۔ غزلیں اور مضامین لکھنے سے جو وقت بچتا ہے، وہ اُسے خط کتابت میں صرف کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ لوگ خط پڑھ کر ضائع کر دیتے ہیں، مگر منظر صاحب نے نہ صرف یہ کہ دوسروں کے خط ضائع نہیں کیے بلکہ اپنے خطوط کی نقلیں بھی سنبھال کر رکھیں۔

Marfat.com

جب خطوں کا خاصا ڈھیر جمع ہو گیا تو اُسے ٹھکانے لگا دیا یعنی کتابی صورت میں شائع کر دیا۔

کتاب کا نام ہے ''اگر نامہ بر ملے''۔ سرورق پر نام کی تشریح اِن الفاظ میں کی گئی ہے: ''مجموعۂ خطوطِ مشاہیر بنام منظر علی خاں۔ منظر علی خاں بنام مشاہیر'' اگرچہ منظر صاحب نے بربنائے انکسار اپنے آپ کو مشاہیر میں شامل نہیں کیا لیکن ازرہِ کشادہ دلی جن لوگوں کو مشاہیر کی صف میں بٹھایا ہے، اُن میں سے اسّی فیصد وہ ہیں جو ''مساکین'' میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ منظر صاحب چوں کہ طنز و مزاح نگار ہیں، اِس لیے ممکن ہے انھوں نے لفظ ''مشاہیر'' کو اِس کے متضاد معنوں میں استعمال کیا ہو۔ اگر ہمارا خیال درست ہے تو پھر منظر صاحب کو اُن کے ''حسنِ خیال'' کی داد ملنی چاہیے اور اِس کی بہترین صورت یہ ہے کہ اُنھیں بھی مشاہیر کی صف میں بٹھا دیا جائے۔

اِس کتاب میں چار سو کے قریب خط ہیں۔ اِن میں سے تقریباً آدھے منظر صاحب نے اور باقی آدھے دوسروں نے لکھے ہیں۔ یہ ''دوسرے'' جن کی تعداد اسّی کے قریب ہے، وہ لوگ ہیں جنھیں منظر صاحب نے خط کتابت کے لائق سمجھا۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب اکیاسی مصنفین کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ استاد لاغر مراد آبادی فرماتے ہیں کہ ایسا بے نتیجہ زورِ قلم کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہمیں اِس سے اتفاق نہیں ہے۔ کم از کم منظر صاحب کے خطوں کے بارے میں یہ بات درست نہیں ہوسکتی۔ اپنے اس کمزور موقف پر ہم آگے چل کر زورِ قلم صرف کریں گے۔

اگر اِس مجموعے میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم اختر اور زاہدہ حنا کے خطوط شامل نہ ہوتے تو ہم یہ کہتے کہ دوسروں کے خطوط شائع کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، منظر صاحب صرف اپنے خط شائع کر دیتے تو اچھا تھا۔ آخر غالب کے خطوں کے مجموعوں میں بھی تو صرف اُنھیں کے خط ہیں۔ کسی دوسرے کا کوئی خط شامل نہیں کیا گیا۔

غالب کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی سن لیجیے کہ کتاب کے مرتب ڈاکٹر قنبر علی خاں کو غالب اور منظر علی خاں کی خطوط نویسی میں بہت سی ''مشترک اقدار'' نظر آئی ہیں۔ شاید اُنھیں اقدار کی تلاش میں بے حد مصروف رہنے کی وجہ سے وہ کتاب کی ترتیب کی طرف توجہ نہیں کر سکے۔ خطوں کی تاریخی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی۔ جس خط کو جہاں چاہا ٹانک دیا ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ جواب طلب خط سے پہلے اُس کا جواب پڑھنے میں آرہا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوں کے درمیان چند غیر متعلق خطوط بھی شامل کر دیے ہیں۔ ایک خط تو ایسا ہے کہ اِس سے غلط فہمیوں کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ اِس میں لکھا ہے: ''آغا صاحب کی ساری فلاسفی دھری کی دھری رہ

Marfat.com

گئی''۔ یہ خط دراصل بی بی سی کے آغا حسن عابدی کے بارے میں ہے۔ مرتب نے اِسے ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوں میں شامل کردیا، یہ بھی نہ سوچا کہ ''آغا صاحب'' سے مراد کون سے آغا صاحب ہیں۔ جنابِ مرتب، احمد کی پگڑی محمود کے سر رکھنے کے بھی شائق ہیں۔ منظر صاحب کے ایک خط کو ڈاکٹر انور سدید کا خط بنا دیا ہے، موصوف نے اتنی زحمت بھی نہیں کی کہ بعض مکتوب نگاروں کے بارے میں ایک دو تعارفی سطریں ہی لکھ دیتے تاکہ یہ تو معلوم ہو جاتا کہ اِن ''مشاہیر'' کے غیر معروف رہ جانے کی وجہ کیا ہے۔

خیر یہ سب ضمنی باتیں ہیں، اصل بات یہ ہے کہ منظر علی خاں کے خطوں میں جو ادبی چاشنی ملتی ہے، وہ حاصلِ کتاب ہے۔ اُن کے خطوں سے ایک باغ و بہار شخصیت سامنے آتی ہے۔ وہ بغیر کسی سابقہ تعارف کے پہلے ہی خط میں اپنے مکتوب الیہ سے اتنے بے تکلف ہو جاتے ہیں جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ موقع و محل کی مناسبت سے طنز و مزاح سے بھی کام لیتے ہیں۔ اُن کا مزاح مہذب اور شایستہ ہوتا ہے اور طنز ایسا لطیف، جس کو ہدف بنایا جائے وہ بھی محظوظ ہوتا ہے کہ وار خالی گیا۔

منظر صاحب اپنے خطوں میں ایک خوش اخلاق اور مخیّر انسان کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ خوش اخلاق وہ اتنے ہیں کہ ہر عید پر لوگوں کو عید کارڈ بھیجتے ہیں۔ شادیوں پر مبارک باد کے اور اموات پر تعزیت کے خط لکھتے ہیں۔ کسی کو کوئی عہدہ یا اعزاز ملے تو اُس پر خوشی کا اظہار اِس طرح کرتے ہیں جیسے یہ عہدہ یا اعزاز خود اُنھیں ملا ہو۔ کوئی بیمار پڑ جائے تو اُس کی مزاج پرسی ایسے خلوص سے کرتے ہیں کہ بیمار کا صحت مند ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ اُن کے مخیّر ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ ہر خط کے ساتھ اپنی کوئی نہ کوئی تصنیف ضرور بھیجتے ہیں۔ نئے سال کی ڈائریاں تقسیم کرتے ہیں اور بعض خوش قسمت لوگوں کو مٹھائی اور قلم وغیرہ پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وا دریغا! کہ منظر صاحب نے ہمیں کبھی اِس سلوک کے لائق نہیں سمجھا۔ زیرِ نظر کتاب کی بجائے اگر وہ کوئی ڈائری بھیج دیتے تو اچھا تھا۔ ہم کالم لکھنے کی مشقت سے بچ جاتے اور ڈائری میں کوئی ڈھنگ کی چیز لکھتے۔ مثلاً اُن لوگوں کے حالات زندگی لکھتے جو ادیب نہ ہونے کے باوجود ادب میں نام پیدا کر لیتے ہیں۔

منظر صاحب کے خطوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مزاح اُن کی تحریروں ہی کا خاصہ نہیں، عملی زندگی میں بھی وہ اِس سے خوب کام لیتے ہیں۔ اِس مجموعے میں رسالوں کے ایڈیٹروں کے بھی بہت سے خط ہیں جن میں سے اکثر میں یہ لکھا ہے کہ آپ جس بینک میں کام کرتے ہیں، اُس کا اشتہار دلوایئے۔ ایسے خطوں کے جواب میں منظر صاحب عموماً اپنا کلام بھیج

Marfat.com

دیتے ہیں۔ ایڈیٹروں کے ساتھ ایسا مذاق کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اشتہار کی امید میں غزلیں چھاپنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کوئی دل جلا ایڈیٹر غزل کو اشتہار سمجھ کر اُس کے چھاپنے کا معاوضہ طلب کر سکتا ہے۔ ویسے یہ کوئی معیوب بات بھی نہیں۔ آج کل یورپ، امریکہ اور خلیج کی ریاستوں کے اردو ادیبوں کی نگارشات رسالوں میں اشتہارات ہی کی صورت میں شائع ہوتی ہیں۔

مشاہیر کے جو خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں، اُن میں سے بیشتر کو اگر خطوط کی بجائے رسائد کہا جائے تو بہتر ہوگا کیوں کہ اِن میں ڈائریوں، کتابوں اور عید کارڈوں کی وصولی کی اطلاع دی گئی ہے اور تہ دل سے شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ رسائد کے علاوہ کتاب میں کچھ ٹیلی گرام بھی شامل ہیں۔ یعنی کچھ خط اتنے مختصر ہیں کہ اُن پر ٹیلی گرام کا شبہہ ہوتا ہے۔ مثلاً شان الحق حقی کا ایک مکمل خط یہاں نقل کیا جاتا ہے:

محبی۔ تسلیم

پیش لفظ کتابت کے بعد ایک نظر دکھا دیں تو ممنون ہوں گا۔

مخلص۔ شان الحق حقی

معلوم نہیں منظر صاحب نے شان صاحب کو ممنون کیا یا نہیں، ہم مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے بے حد ممنون ہیں کہ ہمیں ایک ادبی شاہ کار سے استفادے کا موقع دیا گیا۔

اس مجموعے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل خطوں سے منظر صاحب اور مشاہیر کے درمیان خلوص و محبت کے گہرے رشتے کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض مشاہیر نے اظہارِ خلوص کے نئے نئے پیرائے اختیار کیے ہیں۔ مثلاً جوگندر پال لکھتے ہیں: ''آپ بے ضرر معلوم ہوتے ہیں''۔ زاہدہ حنا لکھتی ہیں: ''میں اگر آپ کو بانکے بہاری کہتی ہوں تو کیا غلط کہتی ہوں۔ واقعی بانکے بہاری کی طرح معصوم ہیں آپ''۔

اس کتاب میں ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوط خاصی تعداد میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اور بھی بہت سے مطبوعہ خطوط ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ وہ مکتوب نگاری میں ایک خاص انداز رکھتے ہیں۔ اُن کے خطوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مکتوب الیہ کے مزاج اور ذہنی سطح کو پیش نظر رکھتے ہوئے خط لکھتے ہیں۔ منظر صاحب کے نام سارے خطوط ہلکے پھلکے موضوعات پر ہیں۔ کہیں کسی علمی مسئلے پر اظہارِ خیال نہیں کیا گیا، کہیں کوئی ادبی بحث نہیں چھیڑی گئی۔ بس ادھر اُدھر کی دلچسپ باتیں کی ہیں۔ مثلاً ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: ''اگر آپ اپنے

Marfat.com

مضمون کے نیچے دستخط نہ بھی کریں تو قاری فی الفور پہچان لے گا کہ مضمون منظر علی خان کا لکھا ہوا ہے''۔ اِس پر ہمیں استاد اختر انصاری اکبر آبادی مرحوم کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک مرتبہ اُن کی ایک غزل بغیر نام کے رسالہ ''ساقی'' میں چھپ گئی۔ اُنھوں نے ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی مرحوم سے شکایت کی۔ اُنھوں نے کہا: ''میاں تمھاری غزل تمھارے نام کے بغیر چھپ گئی تو کیا ہوا۔ ہر شخص سمجھ لے گا کہ یہ تمھاری غزل ہے''۔ استاد نے اِس کا سبب پوچھا تو شاہد صاحب نے کہا: ''تمھارا ہر تیسرا شعر بحر سے خارج ہوتا ہے۔ ایسی غزل تمھارے سوا کون لکھ سکتا''۔

کالم ختم ہوا اور ہم یہ بتانا بھول گئے کہ کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا ہے۔ یہ دیباچہ بھی ایک خط کی صورت میں ہے۔ اس میں قمر رئیس فرماتے ہیں کہ منظر صاحب کے خطوط پڑھ کر مولانا حالی اور مولوی عبدالحق کی تحریریں یاد آ جاتی ہیں۔ ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے، البتہ قمر رئیس صاحب کی خدمت میں یہ عرض کریں گے کہ مولانا حالی اور مولوی عبدالحق ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، ہماری روایت یہ ہے کہ مرحومین کو ہمیشہ اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے۔

(۲۳ر جون ۱۹۹۴ء)

Marfat.com

مطالعہ اور بلڈ پریشر

جب سے ہم نے کالم نگاری شروع کی ہے، ڈاکٹر انور سدید نے کتابیں لکھنے کی رفتار تیز تر کردی ہے۔ شاید وہ زود نویسی میں ہمارا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کیا اور ہماری بساط کیا کہ ہم اُن کے مقابلے پر آئیں۔ ہم جتنی دیر میں ایک کالم لکھتے ہیں، وہ اتنے وقت میں تین چار سو صفحات کی کتاب لکھ ہی نہیں لیتے، زیورِ طبع سے آراستہ بھی کر لیتے ہیں۔ حالاں کہ نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں میں اتنی خوبیاں ہوتی ہیں کہ اُنھیں کسی قسم کے زیور کی، حتیٰ کہ زیورِ طبع کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

ہم زود نویسی کے میدان میں اپنی شکست تسلیم کرتے ہیں کیوں کہ ہم ہفتے میں ایک سے زیادہ کالم نہیں لکھ سکتے۔ ہم چاہیں بھی تو ایسا نہیں کر سکتے اور ڈاکٹر انور سدید چاہتے ہیں کہ ہم اُن کی ہر کتاب نہ صرف پڑھیں بلکہ اُس پر کالم بھی لکھیں۔ کالم لکھنا نسبتاً آسان ہے کہ اس میں ہماری گرہ سے کچھ نہیں جاتا، جس پر ہم لکھتے ہیں اُسی کے دل میں گرہ پڑ جاتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر انور سدید کے دل میں ہماری وجہ سے کبھی کوئی گرہ نہیں پڑی، وجہ ظاہر ہے، دبستانِ فنون کی عنایت سے اُن کے دل میں اتنی گرہیں پڑ چکی ہیں کہ مزید کسی گرہ کی گنجایش نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تصانیف پڑھنے کا کام خوش گوار ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا خطرناک بھی ہے۔ اِس کی وجہ ہم ایک مرتبہ پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اب پھر عرض کرتے ہیں کہ اِس میں کوئی شبہہ نہیں ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پڑھنے سے علم میں اضافہ ہوتا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ علم کے ساتھ بلڈ پریشر بھی بڑھ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کے ذریعے حاصل کردہ علم تو بے ضرر ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب بھی اِسے اپنے پاس رکھنا پسند نہیں کرتے اور

Marfat.com

قارئین میں تقسیم کر دیتے ہیں لیکن بلڈ پریشر کے نقصانات سے بچنا ممکن نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پڑھنے سے بلڈ پریشر میں اضافہ کیوں ہوتا ہے؟ اِس کی تفصیل میں جانے کی بجائے ہم یہ بتائے دیتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی تازہ ترین تصنیف ''دلّی دور نہیں'' پڑھنے کے دوران ہم پر کیا گزری۔ بلڈ پریشر بڑھنے کی وجہ خود بخود سامنے آجائے گی۔

اردو والوں پر غالب کے بے شمار احسانات ہیں۔ کوئی غالب کی وجہ سے نقاد بن گیا اور کوئی محقق۔ جن کی قسمت میں نقاد بننا لکھا تھا نہ محقق، وہ ماہرینِ غالبیات بن گئے۔ غالب کے نام پر ادارے قائم ہوئے تو بہت سے بے روزگار کام سے لگ گئے۔ ملکوں ملکوں غالب سے می نار ہونے لگے تو یاروں کو سیر و سیاحت کے مواقع ملنے لگے۔ ڈاکٹر انور سدید بھی فیضانِ غالب سے محروم نہیں رہے۔ اُنھوں نے غالب پر دو کتابیں لکھی ہیں۔ یہ اتنی اچھی کتابیں ہیں کہ غالب کی روح خوش ہوگئی اور خوش ہو کر یہ انعام دیا کہ ڈاکٹر صاحب کو غالب کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لیے دلی طلب کرلیا۔ حالاں کہ کتابیں لکھ کر غالب پر وہ پہلے ہی فاتحہ پڑھ چکے تھے۔

۱۹۸۸ء میں دلّی میں غالب سے می نار ہوا جس میں چند پاکستانی ادیبوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ ادیبوں کے اِس چھوٹے سے گروہ کے میرِ کارواں ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ ظاہر ہے کہ جس کارواں کے میر، آغا صاحب ہوں گے اُس میں ڈاکٹر انور سدید کا شامل ہونا لازمی ہے کہ جرسِ کارواں کے بغیر کارواں مکمل نہیں ہوتا۔ ویسے بھی ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید اِس حد تک لازم و ملزوم ہو چکے ہیں کہ ایک کا دوسرے کے بغیر تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اردو ادب کی تاریخ میں دوستی کی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ فریقین نفع و نقصان میں برابر کے شریک ہوں۔ دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے یہ شراکت فی الحال نقصان تک محدود ہے، ان شاء اللہ آیندہ نفع بھی ہوگا۔

ڈاکٹر انور سدید نے دلّی میں چند روزہ قیام کی خوش گوار یادوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے ایک اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ یہ روداد پہلے ماہ نامہ ''تخلیق'' لاہور میں قسط وار شائع ہوئی تھی اور اب ''دلّی دور نہیں'' کے نام سے کتابی صورت میں منظر عام پر آئی ہے۔ بلاشبہہ یہ ایک دلچسپ کتاب ہے جسے مصنّف کے باغ و بہار اسلوب نے ایک اہم ادبی تخلیق بنا دیا ہے۔ جس وقت ڈاکٹر صاحب کو غالب سے می نار کا دعوت نامہ ملا تھا، اُسی وقت اُنھوں نے سفر نامہ لکھنے کے لیے چند قلم اور کاغذ کا پورا ایک ریم خرید لیا تھا اور سفر شروع ہونے سے پہلے ہی سفرنامے کے چالیس پچاس صفحات لکھ لیے تھے۔ اِن صفحات میں سفر کی نیت باندھنے اور سفر

Marfat.com

کے شروع ہونے کی درمیانی مدت کے کوائف ہیں۔ یہ کوائف اتنے دلچسپ ہیں کہ اگر خدانخواستہ سفر کا ارادہ فسخ ہو جاتا تو صرف تمہیدی صفحات کی اشاعت بھی فائدے سے خالی نہ ہوتی۔ ہاں یہ نقصان ہوتا کہ ایک ریم کاغذ کا بڑا حصہ خالی رہ جاتا۔

اصل سفرنامہ دلی ایئرپورٹ سے شروع ہوتا ہے جہاں کئی ہندوستانی ادیب ڈاکٹر صاحب کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ مہمان اور میزبان ایک دوسرے سے گلے ملے اور ادبی گفتگو شروع ہوگئی۔ جتنے عرصے ڈاکٹر صاحب نے دلّی میں قیام کیا، یہ گفتگو جاری رہی۔ گویا یہ سفرنامہ ادبی مکالمات کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے جس میں واقعات آٹے میں نمک کے برابر نظر آتے ہیں اور وہ بھی مزید ادبی گفتگوؤں کا وسیلہ بننے کے لیے۔

ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے بھانت بھانت کے ادیبوں سے ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے اور غالب سے می نار کے اجلاسوں کی تفصیل پیش کی ہے۔ یہ سب کچھ پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بھی ڈاکٹر صاحب کے ہم رکاب ہیں اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اپنے کانوں سے سن رہے ہیں۔ اس سفرنامے کو پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ ۱۹۸۸ء میں ہمارا ادب کس حال میں تھا، غالب ادبی رجحانات کیا تھے، ادیب ایک دوسرے کی عدم موجودگی میں کس قسم کی رایوں کا اظہار کرتے تھے اور کن مسائل پر سوچتے اور گفتگو کرتے تھے۔ البتہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ گفتگو سے پہلے سوچتے تھے یا بعد میں۔

دلّی کے بارے میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بہت سے سیاحوں نے اس شہرِ بے مثال کے سفرنامے لکھے ہیں اور بہت سے محققوں اور مورخوں نے دلی کی تاریخ، ثقافت اور آثارِ قدیمہ کو موضوع بنا کر دادِ تحقیق دی ہے لیکن دلّی کے بارے میں جیسی کتاب ڈاکٹر انور سدید نے لکھی ہے، ہمارا دعویٰ ہے کہ ایسی کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے جس میں دلّی دور نہ ہونے کے باوجود دور دور تک نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر انور سدید کو دلّی سے ہم کلام ہونے کے لیے جو چند روز ملے تھے، وہ اُنھوں نے اپنی قیام گاہ رنجیت ہوٹل اور ایوانِ غالب کی نذر کر دیے یا پھر کچھ وقت دو تین علمی و تعلیمی اداروں میں اور اشتہا انگیز دعوتیں کرنے والے دوستوں کے گھروں میں گزار دیا۔ ہمیں اُن سے توقع تھی کہ وہ یہ بتائیں گے کہ دلّی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کا کیا حال ہے، یہ تہذیبی مرکز پہلے کی طرح اب بھی آباد ہے یا اجڑ چکا ہے۔ پرانا قلعہ، لال قلعہ، قطب مینار اور مقبرۂ ہمایوں اب بھی اپنی جگہ موجود ہیں یا اُن کی جگہ جدید طرز کی عمارتیں بن چکی ہیں۔ چاندنی چوک کی چہل پہل ویسی ہی ہے جیسی بارگاہ قلی خان نے اٹھارویں صدی کی چوتھی دہائی میں دیکھی تھی اور جس کی تفصیل اس کی کتاب

Marfat.com

''مرقعِ دہلی'' میں ملتی ہے، یا اِس رونق میں کچھ فرق آگیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے دلّی میں رہ کر اردو کے بزرگ شاعر آنند نراین ملّا سے بھی ملاقات کی ضرورت محسوس نہیں کی، یہ وہی تاریخی بزرگ ہیں جنھوں نے اعلان کیا تھا کہ میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن اردو کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ڈاکٹر انور سدید نے دلّی میں جن ادیبوں سے ملاقات کی، اُن میں سے اکثر وہ تھے جن سے وہ پاکستان میں مل چکے تھے یا پھر وہ ''ادیب'' تھے جن کے دلّی میں موجود ہونے کا خود دلّی والوں کو بھی علم نہیں تھا۔

دلّی میں رہ کر دلّی سے ایسی بے نیازی کی ڈاکٹر انور سدید سے توقع نہیں تھی۔ ایسی بے نیازی استاد لاغر مراد آبادی ہی کو زیب دیتی ہے جنھوں نے قیامِ پاکستان سے پہلے برسوں آگرے کے مشاعروں میں شرکت کی مگر کبھی اُنھیں تاج محل دیکھنے کا خیال نہیں آیا اور اب بھی اُنھیں اِس کا ملال نہیں ہے۔ ملال ہے تو اِس کا کہ اب آگرے والے مشاعروں میں نہیں بلاتے۔ ڈاکٹر صاحب سے ہم گزارش کریں گے کہ اُن کے سفرنامے کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو تو اِس کے نام میں تھوڑی سی ترمیم کردیں۔ ''ابھی دلی دور ہے'' مناسب ترین نام ہوگا۔

خیر یہ تو مذاق کی باتیں تھیں اور سچی باتیں مذاق ہی میں اچھی لگتی ہیں لیکن اصل بات جو ہمیں کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کا سفرنامہ اُس خرافات نگاری سے پاک ہے جو خواتین کے حوالے سے ہمارے سفرنگاروں کا معمول ہے۔ جہاں کہیں خواتین کا ذکر آیا ہے ڈاکٹر صاحب نے حدِ ادب کو ملحوظ رکھا ہے۔ ہاں ایک مرتبہ ایک خاتون نے خود ہی ادب کی حد کو پھلانگنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر صاحب نے بات آگے نہ بڑھنے دی۔ ہوا یوں کہ بھری محفل میں ایک خاتون نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے اپنی دائیں ہتھیلی پھیلا کر آٹوگراف مانگا۔ ڈاکٹر صاحب نے صاف انکار کردیا اور کہا کہ اُن کے پاس ایسا قلم نہیں ہے جس سے ہتھیلی پر دستخط کیے جاسکیں۔ بات معقول تھی کہ سفر کے دوران نہ چھٹنے والی روشنائی کہاں سے آتی جو ڈاکٹر صاحب ہتھیلی پر سرسوں جماتے۔ ویسے ڈاکٹر صاحب کو نہ چھٹنے والی روشنائی کے استعمال کا خاصا تجربہ ہے۔ اپنے مفروضہ دشمنوں کے بارے میں مضامین وہ اِسی روشنائی سے لکھتے ہیں۔ زیرِ نظر سفرنامے کے بعض حصے بھی انھوں نے اِسی روشنائی سے لکھے ہیں۔

محترم احمد ندیم قاسمی کا ذکر اِس سفرنامے میں ایک درجن سے زیادہ مرتبہ کیا گیا ہے اور ہر جگہ سخن گسترانہ انداز میں ہے۔ حیرت ہے کہ دلّی میں بھی ڈاکٹر انور سدید نے قاسمی صاحب کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جہاں موقع ملا ہے کچھ نہ کچھ ضرور لکھ دیا ہے۔ مثلاً ۱۹۸۸ء کے لاہور کے فیض میلے میں بعض سخن ناشناسوں نے قاسمی صاحب کو کلام نہیں سنانے دیا تھا۔ اِس واقعے کا

Marfat.com

دلّی یا دلّی کے سفرنامے سے کوئی تعلق نہیں لیکن داد دیجیے ڈاکٹر انور سدید کو کہ اُنھوں نے اِس واقعے کا کئی مرتبہ ذکر کیا ہے۔ انداز یہ اختیار کیا ہے جیسے سخن ناشناسوں کی حرکت اُنھیں ناگوار گزری ہو لیکن بین السطور سے دلی مسرت پھوٹی پڑتی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے فیض میلے میں سخن ناشناسوں کو اُنھیں نے بھیجا ہو۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں: ''خدا جانے اِس محفل میں فیض میلے کا ذکر کس نے چھیڑ دیا اور پھر وہ واقعہ کیوں زیرِ بحث آ گیا جو کشور ناہید کی گرفت سے نکل کر عوام کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور ہمارے ایک محترم معمر شاعر کی بزرگی کی دستارِ فضیلت سنبھالی نہ جاسکی''۔ (ص ۹۰) ایک اور جگہ اِس واقعے کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے: ''نہ جانے بات کا رخ کس طرح لاہور میں منعقد ہونے والے فیض میلے کے ایک ناخوش گوار واقعے کی طرف ہوگیا۔ اس واقعے پر ڈاکٹر قمر رئیس کا رویہ بہت جارحانہ تھا۔ سبط الحسن ضیغم تو خاموش رہے لیکن میں نے قاسمی صاحب کی حمایت میں اِس واقعے کی شدید مذمت کی''۔ (ص ۱۹۱) اور باتیں تو سب ٹھیک ہیں مگر قاسمی صاحب کی حمایت کرنے کا ذکر پڑھ کر تو ہم ہنسے بغیر نہ رہ سکے حالاں کہ سنجیدہ باتوں پر ہنسنا شایستگی کے منافی ہے۔

اِسی قسم کا سلوک ڈاکٹر سلیم اختر سے بھی کیا گیا ہے۔ اُن کا ذکر جہاں بھی آیا ہے، برنگِ دیگر آیا ہے۔ ایک جگہ تو ڈاکٹر انور سدید نے کمال ہی کر دیا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر دعا مانگتے ہوئے بھی اُنھیں قاسمی صاحب اور اُن کے حلقے کے لوگ یاد آئے۔ فرماتے ہیں: ''مجھے وہ دوست یاد آرہے تھے جنھوں نے ادبی اختلاف کو ذاتی اختلاف بنا لیا تھا اور حسنِ دشنام کا ایسا مظاہرہ کیا تھا کہ اپنی عمر بھر کی شہرت کو داغ دار کرلیا تھا۔ میں نے اُن کے لیے محبوبِ الٰہی سے درخواست کی کہ اُن کے دلوں کو کشادہ کر، اُن کے قلوبِ مردہ کو زندہ کر، سیاہی کی لگی ہوئی مہروں کو توڑ دے، اُنھیں افسروں کی غلامی سے نجات دلا اور اُنھیں لفظ کے داخلی اسرار سے آشنا کر۔ یہ تخلیق کے خدائی کام کے برعکس دو پیسے کا دنیاوی کام کر رہے ہیں، ان کی کاری گری کا بہتر حق الخدمت دلا، اُنھیں بینک بیلنس اور بنگلے کی آسایش دے... اس وقت میرے سامنے قاسمی صاحب کا چہرہ تھا۔ سلیم اختر، عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد سب لوگ موجود تھے''۔ (ص ۲۲۷)

کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کی تحریریں پڑھ کر ہمارے بلڈ پریشر میں اضافہ کیوں ہوتا ہے!

(۲۷ اکتوبر ۱۹۹۴ء)

Marfat.com

ادب اور ازدواجی مسائل

کسی ادیب سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے اگر اُس کے صاحبِ نظر ہونے کی گواہی دیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کوئی معمولی ادیب نہیں ہے۔ زاہدہ حنا جو کچھ لکھتی ہیں، وہ افسانہ ہو یا اخباری کالم، اُن کی بہت سی باتوں سے اتفاق کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہوتا، اِس کے باوجود ہماری رائے یہ ہے کہ وہ جب لکھتی ہیں تو لکھنے کا حق ادا کر دیتی ہیں۔ وہ جدید اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہیں۔ افسانہ نگاری کے لیے زندگی کا براہ راست مشاہدہ پہلی اور بنیادی شرط ہے۔ اگر اِس کے ساتھ لکھنے والے کا مطالعہ، خصوصاً اُس معاشرے کی تاریخ کا مطالعہ جس میں وہ سانس لے رہا ہے، وسیع ہے تو اُس کی نظر ساحل پر کھڑے ہوئے تماشائی کی نظر کی طرح سطح بیں نہ ہوگی بلکہ اُس غواص کی نظر بن جائے گی جو دریا کی تہ کی خبر لاتا ہے۔ مشاہدے اور مطالعے کی وسعت کے ساتھ اگر کوئی افسانہ نگار زبان و بیان پر بھی قدرت رکھتا ہو تو اسے قرۃ العین حیدر کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔ زاہدہ حنا بھی قرۃ العین حیدر کے آس پاس کہیں موجود نظر آتی ہیں۔

یہاں تک لکھنے کے بعد ہم نے اپنے لکھے پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا یہ ہمارے کالم کا عام انداز نہیں ہے۔ ہم کسی کی تعریف میں اتنی دریا دلی کا مظاہرہ اُس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ موضوع خود ہماری ذات نہ ہو۔ مندرجۂ بالا پیراگراف تو کسی ایسے مقالے کا حصہ نظر آتا ہے جیسا نظیر صدیقی نے پروین شاکر کی شاعری پر یا علی سردار جعفری نے عشرت آفریں کی کتاب پر لکھا تھا۔ خیر، اب تیر کمان سے نکل چکا ہے، ہم اپنے الفاظ واپس نہیں لے سکتے کہ ایسے ''آلودۂ توصیفِ غیر'' الفاظ ہمارے کس کام آئیں گے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ہم محترمہ

Marfat.com

قرۃ العین حیدر سے معذرت کرلیں کہ اُن کے آس پاس زاہدہ حنا کو ہم نے نہیں بھیجا، وہ خود اپنی مرضی سے وہاں موجود ہیں۔

زاہدہ حنا پر لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ لاہور کے روزنامہ ''پاکستان'' میں اُن کا ایک دلچسپ انٹرویو شائع ہوا ہے۔ جس میں اُنھوں نے پاکستان کی موجودہ ادبی صورت حال سے بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ''ہماری علمی و ادبی تقریبات کی مسند نشینی جاہل وزیروں اور اجہل مشیروں کے حصے میں آتی ہے۔ ایسی تقریبات کی اگلی صفوں میں کمشنر اور ڈپٹی کمشنر بٹھائے جاتے ہیں۔ انکم ٹیکس افسر اور اسمگلر بار پاتے ہیں۔ ہم نے اپنی نوکر شاہی کے معمولی اہل کاروں کو علم و دانش کا ہمالیہ پہاڑ ٹھہرایا۔ کوئی افسر غالب کے بیس شعر یاد کر کے آجائے تو ہم اُس سے اپنی ادبی محفلوں کی صدارت کراتے ہیں''۔

محترمہ نے واقعی بڑی دردناک تصویر کھینچی ہے۔ ایسی ہی دردناک تصویریں کھینچنے پر علامہ راشد الخیری کو ''مصورِ غم'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ زاہدہ حنا بھی مصورۂ غم کہلانے کی مستحق ہیں۔ اُنھوں نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ صد فی صد درست ہے لیکن اِس میں جاہل وزیروں اور اجہل مشیروں وغیرہ کا کوئی قصور نہیں۔ اُنھیں بلایا جاتا ہے تو وہ ادبی تقریبوں میں آتے ہیں، اُن سے درخواست کی جاتی ہے تو وہ مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہو جاتے ہیں۔ ہم نے تو آج تک یہ نہیں سنا کہ کسی وزیر یا کمشنر نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مدد سے زبردستی علمی و ادبی تقاریب کی صدارت کی ہو یا کسی تھانے دار نے سپاہی بھیج کر شاعروں کو تھانے بلایا ہو اور اپنی صدارت میں مشاعرہ منعقد کیا ہو۔ اِس صورتِ حال کی ساری ذمہ داری اُن ادیبوں پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے ادب کو کاسۂ گدائی بنا رکھا ہے۔ وزیر اور کمشنر بڑی چیز ہیں، ہمارے ادیب تو ٹی وی اسٹیشن کے دروازے پر کھڑے ہوئے چوکیدار سے بھی اُسی عقیدت سے ملتے ہیں جس عقیدت سے غالب اپنے محبوب کے پاسبان کے قدم لیتا تھا۔

محترمہ نے اُس سرکاری افسر کا ذکر بھی بڑی حقارت سے کیا ہے جو غالب کے بیس شعر یاد کر کے آجاتا ہے اور ادبی تقاریب کی صدارت کرتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ سرکاری افسر ستایش کا مستحق ہے کہ اُس نے غالب کے بیس شعر تو یاد کرلیے، اس کے برعکس ہمارے شاعروں کا یہ حال ہے اُنھیں سوائے اپنے شعروں کے کسی دوسرے کا کوئی شعر یاد نہیں ہوتا۔ یقین نہ آئے تو کسی بھی شاعر سے غالب کے صرف پانچ شعر سنانے کی فرمایش کر کے دیکھ لیجیے۔ وہ اپنے ہی پانچ شعر غالب کے نام سے سنا دے گا۔ سرکاری افسر غالب کو بے آبرو نہیں کرتا۔ اُس کے نام سے اُسی کے شعر سناتا ہے۔

Marfat.com

ایک سوال کے جواب میں محترمہ نے یہ فرمایا کہ ہمارے شاعروں کو شادی نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ اُن کے پاس اِس رشتے کو نبھانے کی فرصت ہوتی ہے نہ حوصلہ۔ اور اگر غلطی سے یہ لوگ شادی کر ہی لیں تو اُنھیں اِس رشتے کو نبھانے کا سلیقہ عوام سے سیکھنا چاہیے۔

پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ اِس بیان میں کتابت کی غلطی کی وجہ سے ''شاعری'' کی جگہ ''شادی'' کا لفظ چھپ گیا ہے۔ یعنی محترمہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ہمارے شاعروں کو شاعری نہیں کرنی چاہیے۔ بات معقول ہے کہ ہمارے شاعر آج کل جس طرح کی شاعری کر رہے ہیں، اُس سے نہ صرف خود اُن کی عزت میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا بلکہ شاعری کی آبرو بھی خطرے میں پڑ چکی ہے... لیکن جب بیان کو غور سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ محترمہ شاعروں کو شاعری سے نہیں، شادی ہی سے اجتناب کا مشورہ دے رہی ہیں۔

ہم شاعر نہیں ہیں لیکن شاعروں کے ہم درد ضرور ہیں۔ اِس لیے ہم محترمہ کے مشورے کو ناقابلِ قبول ہی نہیں، ادب کے لیے نقصان دہ بھی سمجھتے ہیں۔ اگر شعرا حضرات شادی نہ کرتے تو ہمارے بہت سے بڑے شاعر پیدا ہی نہ ہوتے کیوں کہ وہ خود شاعروں کی اولاد میں سے ہیں۔ مثلاً ماضی میں میر انیس کے خاندان میں سات پشتوں تک شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ اگر میر انیس کے جدِ امجد زاہدہ حنا کے مشورے پر عمل کرتے تو اردو شاعری میر انیس جیسے بڑے شاعر سے محروم رہ جاتی۔ اِسی طرح موجودہ زمانے میں جون ایلیا کے خاندان میں بھی چار پشتوں سے شاعری ہو رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ محترمہ زاہدہ حنا کے مشورے پر عمل نہیں ہوا ورنہ آج جون ایلیا جیسا طرح دار شاعر ہمارے درمیان موجود نہ ہوتا۔

محترمہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ شعرا حضرات اگر غلطی سے شادی کرلیں تو انھیں اِس رشتے کو نبھانے کا سلیقہ عوام سے سیکھنا چاہیے۔ محترمہ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ شادی کوئی شاعری نہیں ہے جو کسی غلطی کے نتیجے میں وجود میں آئے۔ آدمی خوب سوچ سمجھ کر اور خاصی رقم صرف کر کے شادی کرتا ہے اور پھر شادی مزاحمتی ادب جیسی کوئی چیز بھی نہیں ہے جو عوام کے مفاد میں اور عوام کے مشورے سے کی جائے۔ شعرا تو ہر معاملے میں عوام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں، شادی کے مسئلے میں وہ عوام کی رہنمائی کیوں کر قبول کر سکتے ہیں۔ محترمہ سے گزارش ہے کہ وہ اپنی افسانہ نگاری اور کالم نویسی کی حدود میں رہیں اور شاعروں کے ازدواجی معاملات کو اُنھیں پر چھوڑ دیں۔

جون ایلیا کا ذکر آیا ہے تو یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ زاہدہ حنا کے انٹرویو سے کچھ دن پہلے روزنامہ ''پاکستان'' میں موصوف کا بھی ایک انٹرویو چھپا تھا جس میں انھوں نے

Marfat.com

اپنی شادی کے حوالے سے بعض ایسی باتیں کہی ہیں جنھیں از راہ شائستگی نقل نہیں کیا جاسکتا۔ شاید ایسی ہی باتوں کی وجہ سے زاہدہ حنا نے شاعروں کو شادی نہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ جون ایلیا کے انٹرویو میں کئی اور دلچسپ باتیں بھی ہیں لہٰذا اگر ہم کچھ وقت اِس سریر آرائے اقلیم سخن کے ساتھ بھی گزار لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

جون ایلیا کی عادت ہے کہ اپنے ہر انٹرویو میں اپنے جدّ امجد کے بارے میں کوئی نہ کوئی چونکا دینے والی بات ضرور کہتے ہیں۔ چند ماہ پہلے انھوں نے ایک انٹرویو میں اپنے جدِ امجد کے لیے ''اوباش'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اِس پر ہم نے ٹوکا تو اخبار میں وضاحت کی کہ اُنھوں نے ''عشق باز'' کا لفظ استعمال کیا تھا جسے انٹرویو لینے والے نے ''اوباش'' سمجھا۔ اِس وضاحت سے معاملہ اور سنگین ہو گیا کیوں کہ نور اللغات جیسے مستند لغت میں ''عشق باز'' کے معنی ''حسن پرست، عاشق مزاج اور عیاش'' لکھے ہیں۔

تازہ انٹرویو میں جون ایلیا نے یہ مژدہ سنایا ہے کہ اُن کے جدِ امجد کے مزار پر بچھو نہیں کاٹتے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اِس کرۂ ارض پر ایک جگہ تو ایسی ہے جہاں بچھوؤں کے ڈنک بے ضرر ہو جاتے ہیں۔ تاہم جون ایلیا نے یہ نہیں بتایا کہ صاحبِ مزار نے آخر بچھو کیوں پال رکھے ہیں۔

جون ایلیا نے یہ بھی بتایا ہے کہ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو فلسفی ہوتے اور اگر فلسفی نہ ہوتے تو پہلوان ہوتے۔ پہلوانی سے موصوف کو بچپن سے دلچسپی ہے۔ اُنھوں نے امروہے کے نامی گرامی پہلوانوں سے یہ فن سیکھا ہے۔ فرماتے ہیں: ''ایک زمانے میں میں دودھ کا ایک گلاس پیتا تھا۔ ڈنڈ لگاتا تھا اور دیوار پر مکا مارتا تھا کہ اب تو یہ دیوار گر ہی جائے گی کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ بہت بڑا پہلوان بن گیا ہوں''۔

جون ایلیا پر ہمیں رشک آیا کہ اُنھوں نے وہ اچھا زمانہ دیکھا ہے جب آدمی دودھ کا ایک گلاس پی کر پہلوان بن جاتا تھا۔ اب تو کوئی بالٹی بھر دودھ بھی پی ڈالے تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اول تو دودھ خالص نہیں ملتا، دوسرے دودھ کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ اس کا صحت پر منفی اثر ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی پہلوان بننے کی بجائے جون ایلیا بن جاتا ہے۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں، اچھا ہوا کہ جون ایلیا پہلوان نہیں بنے ورنہ وہ مکے مار مار کر شہر کی ساری دیواریں گرا دیتے۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ موصوف پہلوان نہیں بنے تو کیا ہوا، پہلوانِ سخن تو وہ ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو اپنے زورِ سخن سے سارے عالم کو تہ و بالا کر سکتے ہیں لیکن آرام پسندی کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کرتے۔ آرام پسندی کا تو یہ عالم

Marfat.com

ہے کہ اُنھوں نے بقولِ خود ایک عرصے سے کنگھا نہیں کیا۔ استاد لاغر مراد آبادی کا بھی یہی حال ہے۔ ایک مدت سے اُن کی زلفیں بے نیازِ شانہ ہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے اِس کا سبب پوچھا تو انھوں نے فرمایا: ''آدمی کنگھا اُس وقت کرتا ہے جب وہ منہ دھوتا ہے۔ ہم کبھی پہلے مرحلے ہی سے نہیں گزرے تو دوسرے مرحلے تک کیسے پہنچ سکتے ہیں''۔

(۱۰ر نومبر ۱۹۹۴ء)

Marfat.com

اُردو ادب کے مہاراج کتھک

ڈاکٹر انور سجاد جیسی ہمہ جہت شخصیات اردو ادب میں کم ہی ہوں گی۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ڈاکٹر ہیں۔ اُن کے وقت کا خاصا حصہ مریضوں کی بیماریوں سے نبرد آزما ہونے میں گزرتا ہے۔ فرصت کا جو وقت ملتا ہے، اُس میں وہ خود بیمار پڑ جاتے ہیں۔ یعنی ادب اور فنون لطیفہ سے دلچسپی لیتے ہیں۔ اُنھوں نے ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی لیکن اس بھاری پتھر کو چومے بغیر ہی چھوڑ دیا کیوں کہ بہ حیثیت ڈاکٹر اُنھیں معلوم تھا کہ پتھر ہی کو نہیں، کسی بھی بے جان چیز کو چھوا جائے تو اُس کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوتا۔

شاعری پہ بس نہ چلا تو افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ اُس وقت سعادت حسن منٹو زندہ تھے، افسانہ لکھ کر اُنھیں دکھایا، اُنھوں نے بغیر دیکھے اپنے پاس رکھ لیا اور کہا، یہی افسانہ دوبارہ لکھ کر لاؤ۔ یہ دوبارہ لکھ کر لے گئے۔ منٹو نے پھر وہی سلوک کیا اور افسانہ تیسری مرتبہ لکھوایا۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور جب انور سجاد نے بائیسویں مرتبہ افسانہ لکھ کر پیش کیا تو منٹو نے کہا، میں تمھیں افسانہ نگاری سے باز رکھنے کے لیے ایک ہی افسانے کو بار بار لکھوا رہا تھا، مگر تم میرا مقصد نہیں سمجھے لہٰذا اب تمھاری سزا یہ ہے کہ افسانے لکھتے رہو۔ اور یوں انور سجاد کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوا اور اس میدان میں اُنھوں نے خاصی شہرت حاصل کی اور داد بھی سمیٹی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اُنھیں اردو افسانے کا معمارِ اعظم قرار دیا۔ لوگوں نے اس رائے کو فاروقی کی تنقیدی سخاوت سمجھا۔ انور سجاد نے بھی سخی کے خزانے سے ملی ہوئی دولت کو ''حوصلہ افزائی'' کا نام دے کر قبول کرلیا۔

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ فاروقی کی رائے اردو افسانے کی تنقید میں کتابت کی

Marfat.com

ایک سنگین غلطی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، مگر ہمیں اِس سے اتفاق نہیں ہے کیوں کہ بعض نقادوں کی تحریریں کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے بامعنی ہی نہیں، زیادہ بامعنی ہو جاتی ہیں۔

افسانہ نگاری سے انور سجاد کو جو شہرت ملی، وہ معاصر افسانہ نگاروں اور نقادوں تک محدود رہی۔ عام لوگوں سے ویسی ہی مغائرت رہی جیسی دو اجنبیوں کے درمیان ہوتی ہے لیکن مغائرت کا یہ پردہ اُس وقت ہٹ گیا جب انور سجاد نے ٹی وی ڈراموں میں اداکاری شروع کی۔

وہ ایک عرصے تک ٹی وی کے ڈراموں میں باقاعدگی سے حصہ لیتے رہے اور اُن کا شمار بہترین اداکاروں میں ہوتا تھا۔ پھر نہ جانے کیوں اِس کام سے اُن کا یا ٹی وی والوں کا دل بھر گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اداکاری کے ذریعے جس سرعت سے شہرت حاصل ہوئی تھی، اُسی سرعت سے زائل بھی ہوگئی۔ اداکاری کی دنیا میں شہرت صرف اُس وقت تک ساتھ دیتی ہے، جب تک اداکار سرگرمِ عمل رہتا ہے۔ جونھی وہ منظر سے ہٹتا ہے، شہرت داغِ مفارقت دے جاتی ہے۔

انور سجاد کو رقص اور مصوری سے بھی گہری دلچسپی رہی ہے، جن لوگوں نے اُنھیں بقول جوش، اعضا کی شاعری کرتے دیکھا ہے، اُن کا خیال ہے کہ اگر انور سجاد صرف اِسی فن کے ہو کر رہ جاتے تو وہ مہاراج غلام حسین کتھک سے بھی بڑے رقاص ہوتے۔ (یہ دوسری بات ہے کہ بعض اہلِ نظر کو خود مہاراج کے بڑے رقاص ہونے میں شبہہ ہے۔)

جنھوں نے انور سجاد کی پینٹنگز دیکھی ہیں، اُن کا خیال بھی کچھ اِسی قسم کا ہے، یعنی اگر موصوف اپنے آپ کو صرف مصوری کے لیے وقف کر دیتے تو اُن کے سامنے پکاسو کی وہی حیثیت ہوتی جو افسانے میں منٹو کے سامنے خود انور سجاد کی ہے۔

انور سجاد کو سیاست سے بھی دلچسپی رہی ہے اور اِس سلسلے میں وہ کچھ دنوں کے لیے قید و بند کی سختیاں بھی برداشت کر چکے ہیں۔ مگر ڈراموں میں سختیاں برداشت کرنے کی مشق عملی زندگی میں کام نہ آئی، اِس لیے اُنھوں نے بہت جلد کوچۂ سیاست سے راہِ فرار اختیار کرلی۔ عملی سیاست سے وہ تائب تو ہو گئے لیکن نظریاتی دلچسپی باقی رہی جس کا اظہار اُن کی ادبی تحریروں میں ہوتا رہا۔ اِس سلسلے میں اُن کا ناول ''جنم روپ'' بڑی اہمیت رکھتا ہے جو اُنھوں نے بھٹو کی پھانسی سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اِس ناول میں بھٹو تو پھانسی کے تختے پر نظر نہیں آتے، البتہ ناول نگاری کے فن کو پھانسی لگتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔

ہمیں اِس سنگ دلانہ رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اِس ناول میں انور سجاد نے علامتوں اور استعاروں میں بات کی ہے۔ علامتوں اور استعاروں سے مفہوم اخذ کرنے کے لیے خاص ذہنی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے جس سے اردو کے عام قارئین عموماً محروم ہوتے ہیں۔ جن

Marfat.com

معدودے چند افراد کے پاس یہ صلاحیت ہے، اُن کا خیال ہے کہ انور سجاد علامتیں اور استعارے نہایت ہنرمندانہ طریقے سے استعمال کرتے ہیں اور بسا اوقات اُن کا مفہوم اپنے ہی پاس رکھ لیتے ہیں تاکہ مطالعے کے دوران قاری محنت و مشقت سے کام لے کر یہ جاننے کی کوشش کرے کہ مصنف نے زحمتِ تحریر کیوں اٹھائی ہے۔ اردو کے تن آسان قاری کو محنت و مشقت کی طرف مائل کرنا، کتاب لکھنے سے زیادہ مفید کام ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور اُن کے مقلّد ساختیاتی نقادوں کے لیے انور سجاد کی تحریریں نعمتِ غیر مترقبہ کا درجہ رکھتی ہیں، کیوں کہ اِن سے حسب منشا معنی برآمد کیے جاسکتے ہیں۔ معنی برآمد نہ بھی ہوں، ساختیاتی تنقید کے اصولوں کو تو منطبق کیا ہی جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ کسی تحریر میں معنی کا پایا جانا ضروری نہیں ہوتا، اِس لیے نقاد کو پولیس والوں کی طرح بے گناہ لوگوں سے مالِ مسروقہ برآمد کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

ادب اور فنون لطیفہ کے اتنے بہت سے شعبوں میں نام پیدا کرنے والے انور سجاد گزشتہ کئی برسوں سے منقار زیرِ پر ہیں۔ اُن کی کوئی کتاب شائع ہوئی ہے اور نہ رسالوں ہی میں اُن کی تحریریں نظر آتی ہیں۔ اب وہ سابقہ شہرت کے حوالے سے نظروں میں رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ دنوں پہلے ٹی وی سے اُن کا ایک انٹرویو ٹیلی کاسٹ ہوا تھا اور ایک انٹرویو پچھلے ہفتے اخبار ''جنگ'' کراچی میں شائع ہوا ہے۔ اِسی انٹرویو کو پڑھ کر ہمیں کالم لکھنے کا خیال آیا ہے۔ انور سجاد ہمارے محبوب افسانہ نگار اور اداکار ہیں، اُنھیں خراج عقیدت پیش کرنا ہمارا حق بھی ہے اور فرض بھی۔

اِس انٹرویو میں انور سجاد نے اپنے بارے میں بہت سے دلچسپ اور سنسنی خیز انکشافات کیے ہیں۔ منٹو والے مذکورۂ بالا واقعے کا مرکزی خیال ہم نے اِسی انٹرویو سے اخذ کیا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ جب انور سجاد نے اپنی پہلی کہانی حلقۂ اربابِ ذوق میں سنائی تو اُن کا بہت مذاق اڑایا گیا۔ آگے کا قصہ انور سجاد ہی کی زبان میں یہ ہے: ''انیس ناگی اور افتخار جالب نے میری بڑی حمایت کی مگر یہ دونوں خود اُس زمانے میں معتبر قرار نہیں پائے تھے لہٰذا اُن کی حمایت پر کون متوجہ ہوتا، میں اِس تنقیدی رویے سے دل برداشتہ نہ ہوا بلکہ فیصلہ کرلیا کہ ایسے ہی لکھوں گا جس طرح جو بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں، اُسی طرح اظہار کروں گا۔ میرے اِس رویے پر مجھے پاگل کا خطاب دیا گیا''۔

جیالوں کو تو آج کل ستارۂ امتیاز قسم کے خطابات ملتے ہیں، حیرت ہے کہ انور سجاد جیسے بلند مرتبہ دانش ور کو ایسا نامعقول خطاب ملا۔ غیر شایستہ خطاب دینے والوں کی عقل کا ماتم

Marfat.com

کرنے کے ساتھ ساتھ ہم اِس بات پر بھی اظہارِ افسوس کریں گے کہ انور سجاد نے انیس ناگی اور افتخار جالب کو غیر معتبر قرار دیا۔ (اگرچہ انھوں نے ''اُس زمانے'' کی قید لگا دی مگر بڑے ادیب قیدِ زماں سے آزاد ہوتے ہیں)۔ کوئی دوسرا اِس خیال کا اظہار کرتا تو اور بات تھی لیکن کم از کم انور سجاد کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا کیوں کہ انیس ناگی اور افتخار جالب کے غیر معتبر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی اور ہے کہ اِن دونوں نے ہمیشہ انور سجاد کو ایک اہم افسانہ نگار کی حیثیت سے پیش کیا اور اُسے انتظار حسین سے بڑا افسانہ نگار ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اِن دونوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تو اِس کا سبب یہ ہے کہ اُن کا مقدمہ کمزور تھا لیکن ایسی کوششوں کو کامیابی یا ناکامی کے پیمانے سے نہیں ناپا جاتا، صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ کوشش کرنے والا اپنے مقصد سے کس حد تک مخلص تھا۔ افسوس کہ انور سجاد نے خلوص کی قدر نہ کی ! ایسی ہی باتوں کی وجہ سے چند برس پہلے انیس ناگی نے لاہور کے اخبارات میں انور سجاد کے نام ایک کھلا خط شائع کیا تھا جس میں اور بہت کچھ کہنے کے علاوہ یہ احسان بھی جتایا تھا: ''میں بیس برسوں سے تمھارا قلم دان اٹھائے پھرتا رہا ہوں اور تمھارے اُن ادبی حریفوں کو پچھاڑتا رہا ہوں جو تمھیں اداکار تو مانتے ہیں لیکن تمھاری ادبی حیثیت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں''۔

اب نہ ادبی حریف رہے نہ اداکاری، نہ ادبی حیثیت، بس شک کی نگاہ سے دیکھنے والے رہ گئے ہیں۔ خدا اِن کے دیدۂ مشکوک کو یقین کی روشنی عطا کرے!

انور سجاد نے اپنے انٹرویو میں بار بار اِس پر اصرار کیا ہے کہ اُنھیں عظیم بننے کا شوق نہیں ہے۔ یہ تبدیلی حیرت انگیز ہے۔ ورنہ اِس سے پہلے تو موصوف اپنے آپ کو عظیم سے بھی کچھ زیادہ ہی سمجھتے تھے، یعنی یہ کہتے تھے کہ میں عہد ساز ہوں۔ اِس کا دستاویزی ثبوت بھی موجود ہے۔ انور سجاد کے مجموعۂ مضامین ''تلاشِ وجود'' میں کشور ناہید پر جو مضمون ہے، اُس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں: ''ایک عرصے سے میری بڑی خواہش رہی ہے کہ میں اپنے عصر کی تین عہد ساز شخصیتوں پر ... ایک زبردست پُرمغز مضمون لکھوں۔ اُن کی ذاتی زندگی اور اُن کے فن کی تفصیلات و جزئیات کا ایسا زبردست تجزیہ کر کے احاطۂ تحریر میں لے آؤں کہ اُن کی ذاتی زندگی اور تخلیقات کے درمیان دوئی کے نقش مکمل طور پر مٹادوں یا مکمل طور پر واضح کردوں اور یوں اُن سے اپنی عقیدت کا اظہار کروں۔ اِن تین شخصیتوں میں ایک عہد ساز شخصیت تو میں خود ہوں لیکن اِس سلسلے میں جب بھی قلم اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں تو میری روایتی کسرِ نفسی آڑے آجاتی ہے۔ دوسری عہد ساز شخصیت میرا دوست بلراج مینرا ہے کہ جس کا میں نے ہمیشہ بھلا چاہا ہے۔ تیسری

Marfat.com

عہد ساز شخصیت کشور ناہید ہے کہ جس کا میں دوست ہوں اور جس نے ہمیشہ میرا بھلا چاہا ہے''۔

اپنے آپ کو عہد ساز کہنا اور عظیم بننے کا شوق نہ رکھنا، دو متضاد باتیں ہیں۔ یہ تضاد اُسی وقت دور ہو سکتا ہے جب یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ''عہد ساز'' کی ترکیب ''زمانہ ساز'' کے معنوں میں استعمال کی گئی ہے۔

(۷ر ستمبر ۱۹۹۵ء)

Marfat.com

ادیبوں کی جنگِ زرگری

کوئی کچھ بھی کہے لیکن یہ ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ آج دنیائے ادب میں انیس ناگی جیسا سچا اور کھرا کوئی دوسرا ادیب نہیں ہے۔ جو اُن کے دل میں ہوتا ہے، وہ زبان پر اور جو دماغ میں ہوتا ہے زبانِ قلم پر آجاتا ہے اور وہ بھی اِس خوب صورتی کے ساتھ کہ دل کے معاملات میں دماغ کو اور دماغ کے معاملات میں دل کو دخل دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ انیس ناگی سچے اور کھرے ہونے کے ساتھ ساتھ کھردرے بھی ہیں۔ دوسروں کے بارے میں رائے دیتے ہوئے وہ کسی مصلحت کو اور اپنے ادبی مقام کا تعین کرتے ہوئے کسی احتیاط کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ جانتے ہیں کہ مصلحتیں اور احتیاطیں خیالات کے فطری بہاؤ کی راہ میں غیر فطری رکاوٹیں بن جاتی ہیں۔

انیس ناگی ادب کے جس بلند مقام پر فائز ہیں، اُس کا اندازہ اُن کی کتابوں سے نہیں باتوں سے ہوتا ہے۔ اپنی کتابیں وہ خود چھاپتے ہیں، اِس لیے وہ اُنھیں کے پاس رہتی ہیں لیکن باتیں خوش بو کی طرح عام ہو جاتی ہیں کیوں کہ یہ اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔ لاہور کے اخبارات میں انیس ناگی کے انٹرویو اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے موصوف کی ادبی کارکردگی کا اور معاصر ادیبوں کی کارنا کردگی کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ گزشتہ مہینے کے آخری ہفتے میں لاہور کے روزنامہ ''نوائے وقت'' میں اُن کا جو انٹرویو شائع ہوا ہے، اِس وقت ہمارے سامنے ہے اور اِسی کو پڑھ کر ہم لکھنے کی مشق کر رہے ہیں۔

اِس انٹرویو کا آغاز انیس ناگی کے اِس بیان سے ہوتا ہے: ''میں نے لکھنے کی ابتدا شاعری سے کی ہے۔ انسان جب بچہ یا نابالغ ہوتا ہے تو اُس پر وفورِ جذبات کا غلبہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

شاعری اِسی جذبے کی پیداوار ہے''۔ کیا حکیمانہ بات ہے جسے سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نہ سمجھنے والے اِس بیان سے کوئی غلط نتیجہ نکال سکتے ہیں اور یہ سوال کر سکتے ہیں کہ شاعری اگر صرف بچوں اور نابالغوں کا کھیل ہے تو بچے بڑے اور بالغ ہو جانے کے بعد بھی شعر کیوں کہتے ہیں؟ انیس ناگی کو کہاں فرصت کہ وہ اِس سوال کا جواب دیں، ہمیں کچھ عرض کرتے ہیں۔ بعض بچے بڑے اور بالغ ہو جانے کے بعد بھی بچپن ہی کی فضا میں رہنا پسند کرتے ہیں، اِس لیے شعر کہنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اِسی لیے شاعروں کو معصوم ترین مخلوق کہا جاتا ہے۔ اردو کے تو ننانوے فی صد شعرا، اپنی شاعری کے اعتبار سے خاصے معصوم ہوتے ہیں۔ اُنھیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ شاعری ہے یا شاعری کی معذرت۔

انیس ناگی جس قسم کی شاعری کرتے ہیں، اُس کو تو اُنھوں نے کوئی نام نہیں دیا لیکن جس قسم کی شاعری وہ نہیں کرتے، اُسے وہ ''پابند شاعری'' سے موسوم کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:
''میرے نزدیک پابند شاعری تُک بندی کی مشق ہے جس میں قافیے سے قافیہ ملانے پر زور دیا جاتا ہے... سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کے شاعر پابند شاعری کیسے کر لیتے ہیں۔ غزل ایک متروک صنفِ سخن ہے۔ اِس میں لکھنا جھک مارنے کے مترادف ہے''۔

یہ باتیں ہمارے دل کو تو لگتی ہیں کیوں کہ میر، غالب اور اقبال وغیرہ نے پابند شاعری ہی میں قافیے سے قافیہ ملا کر تُک بندی کی مشق کی ہے یعنی جھک ماری ہے۔ لیکن استاد لاغر مراد آبادی کو انیس ناگی سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''جہاں تک جھک مارنے کا تعلق ہے، نثری نظم اِس کام کے لیے زیادہ موزوں ہے کیوں کہ غزل میں جھک مارنے کے لیے بھی تھوڑی بہت محنت تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ نثری نظم میں محنت قاری کرتا ہے اور محنت کے رائیگاں جانے کا غم بھی وہی سہتا ہے''۔

انیس ناگی نے اپنے انٹرویو میں صرف احمد ندیم قاسمی کا ذکر اچھے لفظوں میں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل قاسمی صاحب کا ستارہ عروج پر ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انیس ناگی، بادلِ ناخواستہ سہی، کبھی کبھی کسی کے بارے میں اچھی رائے قائم کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ورنہ زیرِ نظر انٹرویو میں اُن کے ناوکِ ناز نے زمانے میں کوئی صید نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ مولانا حالی اور فیض کو اوسط درجے کے شاعر قرار دیا ہے۔ قتیل شفائی کو فلمی شاعر کہہ کر اُن کے ادبی مقام کی نفی کی ہے۔ انتظار حسین کے بارے میں کہا ہے کہ وہ چالیس برس سے ایک ہی نقطے پر جمے ہوئے ہیں۔ افتخار جالب اور انور سجاد کے متعلق یہ اطلاع دی ہے کہ دونوں زر کی تلاش میں ادب کو چھوڑ گئے ہیں۔ مجید امجد کے مجموعہ کلام ''شبِ رفتہ'' کو بہت

Marfat.com

کمزور مجموعہ بتایا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی پر الزام لگایا ہے کہ وہ لغت پر انحصار کرتے ہیں۔ انیس ناگی یہی الزام انتظار حسین پر بھی لگا چکے ہیں۔ ہمیں تو اِس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی، اگر کوئی لکھنے والا ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کے معنی پڑھنے والے کو معلوم نہیں ہیں تو اُسے بھی لغت پر انحصار کرنا چاہیے۔ جس لفظ کے معنی معلوم نہ ہوں، لغت میں دیکھ لینے چاہییں۔ ویسے ہم مشتاق احمد یوسفی اور انتظار حسین کو مشورہ دیں گے کہ وہ آیندہ جب کوئی کتاب لکھیں تو اُس کے ساتھ فرہنگ بھی لگا دیا کریں تاکہ انیس ناگی کی شکایت رفع ہو جائے۔ شاید مشکل الفاظ ہی کی وجہ سے انیس ناگی کو میر کے ہاں بھرتی کے اشعار زیادہ نظر آتے ہیں۔ ''فرہنگِ میر'' کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں، شاید موصوف کی نظر سے نہیں گزری ورنہ بھرتی کے شعروں کی تعداد میں معقول حد تک کمی ہو سکتی تھی۔

انیس ناگی نے تنقید نگاروں کے بھی خوب لتے لیے ہیں۔ اِس پر انٹرویو لینے والے نے کہا: ''اِس کا مطلب یہ ہوا کہ سوائے انیس ناگی کے کوئی تنقید نہیں لکھ رہا''۔ موصوف نے اِس کا جواب یہ دیا: ''میں نے بھی تنقید لکھنی چھوڑ دی ہے، اِس لیے کہ جب میں اپنی غیر جانب دارانہ آرا کا اظہار کرتا ہوں تو لوگ مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ تنقید لکھنے پر کشور ناہید نے میرا تبادلہ لاہور سے ملتان کروا دیا تھا۔ آپ خود ہی بتائیں میں تنقید کیسے لکھوں، اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور دھمکیوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہی''۔

ہمیں یہ تکلیف دہ صورت حال معلوم نہیں تھی۔ ہم انیس ناگی کو مشورہ دیں گے کہ وہ تنقید سے ہمیشہ کے لیے تائب نہ ہوں، بس ذرا اتنی احتیاط کریں کہ پیپلز پارٹی کے دورِ اقتدار میں تنقید لکھنے سے پرہیز کریں تاکہ کشور ناہید اُن کو پریشان نہ کرسکیں۔ مسلم لیگ کا یا مارشل لا کا دور اِس کام کے لیے بہت موزوں ہے کیوں کہ اِن ادوار میں خود کشور ناہید کو پے در پے تبادلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ویسے سننے میں آیا ہے کہ اب کشور ناہید کسی سے ناخوش ہوتی ہیں تو اُس کا تبادلہ نہیں کرواتیں، بلکہ یہ دھمکی دیتی ہیں کہ اگر تم راہِ راست پر نہ آئے تو اپنی آپ بیتی کے اگلے ایڈیشن میں تمھارا ذکر بھی کردوں گی۔

انیس ناگی اکادمی ادبیات سے بھی ناخوش ہیں، اُنھیں شکایت ہے کہ ''اکادمی کی اہلِ قلم کانفرنس عجیب ہڑبونگ کا شکار تھی، شرکا کی آدھی تعداد سرے سے ادیب ہی نہ تھی، اِس کانفرنس کا مقصد محض اپنے دوستوں کو انعاموں سے نوازنا تھا اور یہ انعامات جی بھر کے غیر مستحقین کو دیے گئے اور اِس پر جو احتجاج کیا گیا اُسے بھی نظر انداز کر دیا گیا''۔

انیس ناگی نے اگرچہ یہ نہیں بتایا کہ وہ اہلِ قلم کانفرنس کے شرکا کی کس آدھی تعداد

Marfat.com

میں شامل تھے، مگر اُن کے اعتراضات بالکل درست ہیں۔ اکادمی کو اِن شکایات کا ازالہ کرنا چاہیے اور دوستوں سے انعامات واپس لے کر دشمنوں میں تقسیم کردینے چاہییں تاکہ دشمنوں کا شمار بھی دوستوں میں ہونے لگے۔ اب دوستی اور دشمنی کا انحصار ایسی ہی باتوں پر رہ گیا ہے۔

انیس ناگی نے اِس پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ اِس سال ایک ایسے ادیب کو پرائڈ آف پرفارمنس ملا ہے جس نے گزشتہ تیس برسوں سے کچھ نہیں لکھا۔ معلوم نہیں اِس میں افسوس کی کیا بات ہے، کیوں کہ یہ اعزاز تو ملا ہی نہ لکھنے کی وجہ سے ہے۔ اگر کوئی ادیب انیس ناگی کی طرح لکھ لکھ کر ڈھیر لگاتا رہے تو اُسے کون اعزاز کے لائق سمجھے گا۔

آخر میں انیس ناگی کا ایک دردناک بیان: ''بہت سے ناول نگار مجھے ناول نگار نہیں مانتے، اِسی طرح شاعر مجھے ناشاعر کہتے ہیں، آپ سے کس نے کہا کہ میں اہم ادیب ہوں، مجھے ابھی تک سرکار کی طرف سے کوئی انعام نہیں ملا، اکادمی ادبیات نے کبھی باہر کی سیر نہیں کرائی، حکومت نے کوئی اچھا عہدہ نہیں دیا، ہر قسم کی ادبی اور ثقافتی تنظیموں سے مجھے باہر رکھا گیا، اِن تمام باتوں کا مطلب یہ ہے کہ میں اہم ادیب نہیں ہوں۔ البتہ ناپسندیدہ ضرور ہوں، صرف اِس لیے کہ ایک خوشامد پرست عہد میں ایک نئے ضمیر کی داستان مرتب کر رہا ہوں... میں اپنے آپ کو ضلعی سطح کا ادیب سمجھتا ہوں۔''

شاید کسی ایسی ہی صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر منیر شکوہ آبادی نے کہا تھا:

میرے ہنر کا کوئی نہیں قدرداں منیؔر
شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

(۱۹/اکتوبر ۱۹۹۵ء)

Marfat.com

ردّیاتِ ادب کے سالانہ جائزے

اردو ادب کی تاریخ میں معرکہ آرائیوں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے۔ میر تقی میر سے لے کر ڈاکٹر انور سدید تک شاید ہی کوئی اہم ادیب ہوگا جس کی اپنے کسی معاصر سے ان بن نہ ہوئی ہو اور طرفین نے ایک دوسرے کے خلاف دل کا غبار صفحۂ قرطاس پر منتقل نہ کیا ہو۔ محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں کئی ادبی معرکہ آرائیوں کا ذکر نمک مرچ لگا کر کیا ہے اور آزاد سے تقریباً پچاس پچپن سال پہلے لکھنؤ کے ایک شاعر سعادت خان ناصر نے تو ''خوش معرکۂ زیبا'' کے نام سے ایک پورا تذکرہ ہی لکھ ڈالا تھا جس میں متعدد ادبی معرکہ آرائیوں کا چشم دید احوال ملتا ہے۔ اِس سلسلے میں اور بھی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور ''نقوش'' کا ادبی معرکہ نمبر تو اِس موضوع پر اِن سائیکلوپیڈیائی کام ہے۔ اِن سب چیزوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی ادبی جھگڑا سال دو سال سے زیادہ نہیں چلا۔ فریقین میں یا تو صلح کرا دی گئی یا پھر دونوں تھک ہار کر خاموش ہوگئے۔

اردو کا دلچسپ ترین ادبی معرکہ وہ ہے جو گزشتہ پچیس برسوں سے ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کے درمیان جاری ہے۔ دونوں شریف آدمی ہیں مگر شرافت کا الگ الگ معیار رکھتے ہیں۔ ہمیں اِن دونوں سے محبت ہے اور اِس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا معیارِ شرافت، اِن دونوں کے معیار سے جداگانہ نوعیت کا ہے۔ سنا ہے آج کل لاہور میں معرکۂ سدید و سلیم کی سلور جوبلی منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ دونوں ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ لکھا ہے، اُسے کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا اور پھر اِس کتاب کی تقریبِ رونمائی میں دونوں کو مدعو کیا جائے گا اور اُنھیں آمنے سامنے بٹھا کر اپنا اپنا موقف بیان کرنے کی درخواست

Marfat.com

کی جائے گی بشرطے کہ کوئی موقف ہو۔ یہ بات ہم نے اِس لیے لکھی ہے کہ اکثر جھگڑے اختلافِ رائے کی وجہ سے نہیں، افتادِ طبع کی بنا پر وجود میں آتے ہیں۔

کتاب کی اشاعت کی حد تک تو ہم اِس تجویز سے متفق ہیں کہ بہت سی نادر و نایاب، دلچسپ اور فکر انگیز تحریریں ایک مرتبہ پھر پڑھنے کو مل جائیں گی اور دونوں کے بہت سے ''محاسن'' جنھیں ہم بھول چکے ہیں، دوبارہ ذہن میں تازہ ہو جائیں گے لیکن دونوں کو آمنے سامنے بٹھانے کی بات ہمیں پسند نہیں آئی۔ کیوں؟ اِس سوال کا جواب دینے کی بجائے ہم ایک واقعہ بیان کیے دیتے ہیں۔

تیس بتیس سال پہلے کی بات ہے کہ مشہور شاعر مصطفیٰ زیدی نواب شاہ میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ اُنھوں نے ایک ادبی کانفرنس منعقد کی اور اُس میں جوش ملیح آبادی اور شاہد احمد دہلوی کو مدعو کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اِن دونوں میں زبردست معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔ مصطفیٰ زیدی نے اِن دونوں بزرگوں کو کراچی سے نواب شاہ لے جانے کا کام طفیل احمد جمالی کے سپرد کیا (افسوس کہ اب لوگ جمالی کو بھول گئے، ایک زمانے میں وہ اپنی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں کی وجہ سے بے حد مقبول تھے)۔ سفر ریل گاڑی سے کرنا تھا، اِس لیے جمالی نے ایک گاڑی سے جوش صاحب کو روانہ کیا اور دوسری سے شاہد صاحب کو لے کر وہ خود نواب شاہ پہنچے۔ مصطفیٰ زیدی نے جمالی سے کہا: ''اگر آپ اِن دونوں کو ایک ہی گاڑی سے لے کر آتے تو مجھے استقبال کے لیے دو مرتبہ ریلوے اسٹیشن پر آنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی''۔ جمالی نے جواب دیا: ''آپ کو اپنی زحمت کا تو خیال ہے لیکن اِس کا خیال نہیں کہ اگر یہ دونوں بزرگ ایک ساتھ سفر کرتے اور راستے میں اِن کے درمیان صلح ہو جاتی تو اِس حادثے کا کون ذمہ دار ہوتا''؟

اِس واقعے سے جو اخلاقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے، اُس کی بنا پر ہمارا یہ خیال ہے کہ ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کو کسی محفل میں یک جا نہیں ہونا چاہیے۔ آنکھ کی مروت بڑی ظالم چیز ہے جس کی وجہ سے آدمی غلط فیصلے کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر مجوزہ کتاب کی تقریبِ رونمائی میں آمنے سامنے بیٹھ کر ان دونوں نے کوئی غلط فیصلہ کر لیا تو اردو ادب کی تاریخ کا دلچسپ ترین ادبی معرکہ قبل از وقت اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔

اخبار ''جنگ'' لاہور کے ادبی صفحے کے نگراں حسن رضوی اس قسم کے معاملات کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اُنھوں نے ۲۴ر اکتوبر کے اخبار میں ہمارے ممدوحین کا ایک مشترکہ انٹرویو شائع کیا ہے۔ مشترکہ اِن معنوں میں کہ ایک ہی سوال نامہ دونوں کے سامنے رکھا گیا اور اُس

Marfat.com

کے جوابات الگ الگ حاصل کیے گئے۔ اِس انٹرویو کی تمہید میں حسن رضوی لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کے درمیان ہونے والا یہ مکالمہ خوفِ فساد کے پیشِ نظر دونوں کو کسی ایک جگہ آمنے سامنے بٹھا کر ریکارڈ کرنے کی بجائے الگ الگ جگہوں پر ریکارڈ کیا گیا ہے۔ تاہم ادب کے اِن دو ممتاز ناقدین کے انٹرویوز ایک ساتھ شائع کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ادب کے سنجیدہ حلقوں کو ادب کے پس منظر اور پیش منظر میں کام کرنے والے ادبی گروہوں اور ادبی مفادات نیز اُن کے تصادم سے پیدا ہونے والی صورت حال سے آگاہ کیا جاسکے''۔

اِن دونوں سے پہلا سوال یہ کیا گیا کہ آپ کیوں لکھتے ہیں؟ ڈاکٹر انور سدید نے اِس رسمی سوال کا جواب بھی رسمی سا دیا جو یہ ہے: ''پڑھتے وقت ذہن میں کچھ نئے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں، لکھتے وقت اِن سوالات کی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں''۔ ہمارا تجربہ ڈاکٹر انور سدید سے بالکل مختلف ہے۔ ہم خالی الذہن ہو کر پڑھتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ کوئی گرہ پیدا ہی نہیں ہوتی جسے کھولنے کے لیے لکھنے کی ضرورت پیش آئے۔ لکھتے ہم اِس لیے ہیں کہ ہمارے خالی الذہن ہونے کا دستاویزی ثبوت موجود رہے۔ ڈاکٹر انور سدید ہمارے مقابلے پر خاصے خوش قسمت ہیں کہ اُن کے پاس سوچنے والا ذہن ہے، ذہن میں سوالات ہیں، سوالات میں گرہیں ہیں، اور ہر گرہ کی گرہ میں بے شمار ادبی مسائل ہیں۔ یہ سب مسائل حل ہوتے چلے جاتے ہیں سوائے ایک مسئلے کے جس کا نام ہے ڈاکٹر سلیم اختر۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے مذکورہ سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے حریف کی طرح ادیبانہ تکلف سے کام نہیں لیا۔ جو اصل حقیقت تھی صاف صاف بیان کردی۔ فرمایا: ''لکھنا میرے لیے ایک طرح کا نشہ ہے''۔ ڈاکٹر صاحب کثیر التصانیف ادیب ہیں۔ اِس لیے کہا جاسکتا ہے کہ نشہ حدِ اعتدال سے بڑھ گیا ہے، تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اِس نشے سے اُنھیں کوئی نقصان پہنچا ہے۔ حالاں کہ نشہ اور نقصان لازم و ملزوم ہیں۔ ادب کا نشہ بھی کیا نشہ ہے کہ اِس میں چُور ہو کر لکھنے والا تو عالم سرور میں رہتا ہے اور سارے نقصان پڑھنے والوں کے حصے میں آتے ہیں۔

ایک سوال یہ تھا: ''موجودہ عہد میں تنقید کو خوشامد سے الگ کیسے کیا جاسکتا ہے؟ دونوں نے حیرت ناک حد تک اِس سوال کا یکساں جواب دیا ہے۔ دونوں کا خیال یہ ہے کہ اگر کتابوں کی تقاریب رونمائی پر پابندی لگا دی جائے اور ادیبوں کے ساتھ شامیں منانے کا سلسلہ بند کردیا جائے تو تنقید ہی نہیں پورا ادب صحت مند ہو جائے گا۔

ہم نہایت ادب کے ساتھ دونوں ڈاکٹروں سے اختلاف کی جرأت کریں گے۔ یہ صحیح ہے کہ تقریباتی تنقید نے ہمارے ادب کو ایک مضحکہ خیز صورتِ حال سے دوچار کردیا ہے لیکن

Marfat.com

اُس تنقید کے بارے میں کیا خیال ہے جو دوستوں کی کتابوں پر لکھی جاتی ہے اور جو جلسوں میں تو نہیں پڑھی جاتی لیکن رسالوں میں چھپوا دی جاتی ہے۔ دونوں ڈاکٹروں نے اپنے دوستوں اور اُن کی بے شمار کتابوں پر مضامین لکھے ہیں۔ اِن میں سے ایک بھی مضمون ایسا نہیں ہے جس میں دوستی کا خیال نہ رکھا گیا ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تعریف جلسوں میں ہو تو بری، رسالوں میں ہو تو مستحسن۔ اگر تقریباتی یا فرمایشی تنقید کی طرح دوستانہ تنقید پر بھی پابندی لگا دی جائے تو اِس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ بہت سے نقاد لکھنے سے دست بردار ہو کر شریفانہ مشاغل اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

دونوں ڈاکٹر ہر سال ادبی جائزے لکھتے ہیں جنھیں ڈاکٹر سلیم اختر ہماری خوشی کی خاطر ''ناجائزے'' کہنا پسند کرتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اِن سالانہ جائزوں کے حوالے سے جو سوال کیا گیا اُس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے اپنے حریف کی خدمات کا اعتراف کیا ہے، فرماتے ہیں: ''گارساں دتاسی کے بعد سب سے زیادہ سالانہ جائزے میں نے اور سلیم اختر نے لکھے ہیں''۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اگر ڈاکٹر انور سدید کو اپنی اور سلیم اختر کی تعریف ہی کرنی تھی تو بے چارے گارساں دتاسی کی روح کو شرمندہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ دتاسی نے اردو کے مراکز سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر جو معلومات فراہم کیں، وہ ہمارے ادب کی تاریخ کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِس کے برعکس ہمارے دونوں ڈاکٹروں کی فراہم کردہ معلومات پر اُس وقت تک اعتبار نہیں کیا جاسکتا جب تک دوسرے ذرائع سے اُن کی تصدیق نہ ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ڈاکٹروں کے سالانہ جائزے ادب سے زیادہ ردّیاتِ ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔

معترضین کی اِس سفاکانہ رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ گارساں دتاسی کی روح شرمندہ ہوتی ہے تو ہو، یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ڈاکٹروں نے جائزہ نگاری کو باقاعدہ ایک فن بنا دیا ہے۔ اِس فن کی قدر آج نہیں تو کل ضرور ہوگی۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ اِن جائزوں کا ''اصل فائدہ آج سے دس بیس برس بعد ظاہر ہوگا جب ان جائزوں کی مدد سے کتابوں کے سنین یا کوائف وغیرہ متعین کرنے میں مدد ملے گی''۔

بعض کج فہم معترض یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے اِس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اِن جائزوں میں جن کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ آیندہ دس بیس برسوں میں ضائع ہو چکی ہوں گی اور اُن کے بارے میں معلومات کا واحد ذریعہ یہ جائزے ہی رہ جائیں

Marfat.com

گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو کتابیں دس بیس برسوں بعد ضائع ہونے والی ہیں، اُن کے بارے میں جائزے لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے اور پھر اِس کی بھی کیا ضمانت ہے کہ دس بیس برس بعد یہ جائزے بھی ضائع نہیں ہو جائیں گے۔

معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ اِس دنیا میں ہر چیز فانی ہے۔ اگر بہت سے فانی انسانوں کی سوانح عمریاں لکھی جاسکتی ہیں تو آیندہ دس بیس برسوں میں فنا ہو جانے والی کتابوں کے سنین طباعت اور دیگر کوائف کیوں نہیں محفوظ کیے جاسکتے۔ اِس بات کو ہم ایک مثال سے واضح کریں گے۔ اگلے بیس برسوں میں ''بفرضِ محال'' نظیر صدیقی کی ساری کتابیں ضائع ہو جائیں تو ہم دونوں ڈاکٹروں کے سالانہ جائزوں کی مدد سے ضائع شدہ کتابوں کا سراغ لگا سکتے ہیں بشرطے کہ اِس کام سے پہلے خود جائزے ہی ضائع نہ ہوگئے ہوں۔

اِن جائزوں کے ذریعے ڈاکٹر سلیم اختر نے جو نقصانات اٹھائے ہیں، اُن کی تفصیل اُنھیں کے الفاظ میں یہ ہے: ''جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میری بہت سی مخالفتیں، دشمنیاں اور گالیاں صرف اِن سالانہ ادبی جائزوں کی وجہ سے ہیں، کتنی ہی کوشش کرو تمام کتابوں کا تذکرہ ناممکن ہوتا ہے، کیوں کہ کتابوں تک رسائی ہی ناممکن ہوتی ہے۔ اب جس کی کتاب کا ذکر رہ گیا وہ ساری عمر کے لیے دشمن بن گیا... اِس جائزہ نگاری میں میرے لیے سراسر خسارہ ہی خسارہ ہے''۔

ہماری دلی ہم دردیاں ڈاکٹر سلیم اختر کے ساتھ ہیں۔ افسوس کہ اُنھیں اُن کی محنت کا صلہ مخالفتوں، دشمنیوں اور گالیوں کی صورت میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر برا نہ مانیں تو ہم مشورہ دیں گے کہ اُنھیں قناعت سے کام لینا چاہیے۔ جتنا صلہ اب تک مل چکا ہے، آیندہ زندگی میں اُسی کو کام میں لائیں، مزید کی ہوس نہ کریں، صرف وہی ادبی کام کریں جسے آنے والے برسوں میں ناجائزوں کی وجہ سے نہیں اپنی ادبی قدر و قیمت کی وجہ سے یاد رکھا جائے۔

(۱۶/نومبر ۱۹۹۵ء)

Marfat.com

کتابت کی طبع زاد غلطیاں

کچھ لوگوں کو اس پر اعتراض ہے کہ ہم اپنے کالموں میں انیس ناگی کا تذکرہ کچھ زیادہ ہی کرنے لگے ہیں۔ استاد لاغر مراد آبادی' نے اپنی ناخوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا، ایک ہی مصرعِ طرح پر ہر تیسرے چوتھے ہفتے غزل لکھنا اگر کسی حکیم کے نسخے پر عمل کرنے کی وجہ سے ہے تو غزل لکھ کر براہ راست اپنے ممدوح کو بھیج دیا کیجیے، اگر اُن کی اصلاح مقصود ہے تو وہ غیر مطبوعہ کالم سے بھی ہوسکتی ہے۔ بصورت دیگر یہی سمجھا جائے گا کہ آپ کے پاس لکھنے کے لیے کوئی موضوع نہیں رہا۔

استادِ محترم نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ ہم تو خود محتاجِ دعا ہیں، کسی دوسرے کی اصلاح کیا کریں گے۔ انیس ناگی بھی خدا کے فضل سے اصلاح کی منزل سے بہت آگے نکل چکے ہیں اور اُس بلند مقام پر فائز ہیں جہاں انسان دوسروں کے لیے اصلاح وعبرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ہم موصوف کے بارے میں بار بار اس لیے لکھتے ہیں کہ اِس وقت پاکستان میں وہ واحد ادیب ہیں جو انفرادی فکر رکھتے ہیں اور تخلیقی سطح پر بے حد فعال ہیں۔ وہ پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ اتنا اور ایسا بوجھ کوئی دوسرا نہیں ڈھوسکتا۔ وہ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، نقاد، ناول نویس اور مترجم ہیں۔ ''دانش ور'' جیسے منفرد ادبی رسالے کے مدیر ہیں جس میں بیشتر تحریریں خود اُنھیں کی ہوتی ہیں۔ اگر حسن اتفاق سے کچھ جگہ بچ جائے تو اُسے اُن ادیبوں کی تحریروں سے پُر کیا جاتا ہے جنھیں کسی دوسرے رسالے میں جگہ نہیں ملتی۔

انیس ناگی اپنی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں خود کفیل ہیں۔ نہ صرف یہ کہ کتابیں وہ خود لکھتے ہیں بلکہ اُن کی کمپوزنگ اور کاپی پیسٹنگ بھی خود ہی کرتے ہیں۔ خود کمپوز کرنے کا

Marfat.com

ایک فائدہ یہ ہے کہ کتابت کی غلطیاں بھی طبع زاد ہوتی ہیں اور اُنھیں کسی دوسرے کے کھاتے میں نہیں ڈالا جاسکتا۔ قاری (بشرطے کہ دستیاب ہو) اُن غلطیوں سے بھی محظوظ ہوتا ہے۔

انیس ناگی کی ایک خوبی جو اردو کے کسی ادیب میں نہیں پائی جاتی، یہ ہے کہ وہ انتہائی بے باک اور صاف گو انسان ہیں۔ بے مثال دیدہ دلیری سے سچ بولتے ہیں۔ ایسی دیدہ دلیری تو پیشہ ور جھوٹ بولنے والوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن کا سچ صرف خود اُنھیں کے لیے قابل قبول ہوتا ہے، دوسرے اِس لیے قبول نہیں کرتے کہ اُن کے سچ کا معیار الگ ہے۔ دوسروں کے بارے میں منفی اور اپنے بارے میں مثبت رائیں قائم کرنے میں بھی اُن کا جواب نہیں ہے۔ کبھی کسی کی تعریف سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کرتے۔ اگر کبھی بادلِ ناخواستہ کسی کی تعریف کرتے بھی ہیں تو یوں جیسے خیرات دے رہے ہوں۔ فیض کی زیادہ سے زیادہ تعریف کریں گے تو یہ نہیں کہیں گے کہ وہ بڑے شاعر ہیں بلکہ یہ کہیں گے کہ وہ سب سے زیادہ مشہور شاعر ہیں۔ اپنی کم سے کم تعریف کریں گے تو یہ نہیں کہیں گے کہ میں انیس ناگی ہوں، بلکہ یہ کہیں گے کہ میں نئی شاعری کا بانی ہوں۔

انیس ناگی کی تازہ ترین کتاب ''میری ادبی بیاض'' ہے جو پچھلے ہفتے شائع ہوئی ہے اور اِسی سے استفادے کے لیے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کی عجیب وغریب کتاب ہے۔ عجیب اِس لیے کہ اِس میں مختلف طرح کی تحریروں کو یک جا کیا گیا ہے اور غریب اِس لیے کہ پڑھنے والے کو غربت بلکہ ذہنی طور پر غربت کا احساس ہوتا ہے۔ افسوس صد افسوس! مفاد پرست سیاست دانوں نے ہمارے ملک کی اقتصادی حالت اِس حد تک خراب کردی ہے کہ ادبی دنیا میں بھی غربت و ناداری بڑھتی جارہی ہے۔

لاہور کی بلدیاتی حدود میں اگرچہ ہارن بجانا منع ہے لیکن شاعری کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اِس وجہ سے لاہور میں شعر کہنے والوں کی تعداد شعر سننے والوں سے بڑھ گئی ہے۔ اِس صورتِ حال کے تدارک کے لیے انیس ناگی نے بعض شاعروں کو نثر لکھنے کے کام پر لگا دیا ہے۔ اِس کام کا پہلا نمونہ انیس ناگی کی زیرِ نظر کتاب کا دیباچہ ہے جو شاعر زاہد مسعود نے لکھا ہے۔ یہ دیباچہ پوری انیس سطروں پر مشتمل ہے اور اِن میں بھی کام کی سطر ایک ہی ہے جو یہ ہے: ''انیس ناگی تنازعوں سے نہیں ڈرتے کیوں کہ وہ خود ایک ادبی تنازع ہیں''۔ یہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک نادر واقعہ ہے کہ کوئی ادیب دوسروں سے جھگڑتے جھگڑتے خود ہی ایک جھگڑا بن کر رہ جائے۔

''میری ادبی بیاض'' میں افسانے، نظمیں، تنقیدی مضامین، شخصی خاکے اور یادداشتوں

Marfat.com

پر مبنی مضامین شامل ہیں۔ افسانے، نظمیں اور تنقیدی مضامین تو ویسے ہی ہیں جیسے انیس ناگی عمر بھر لکھتے رہے ہیں لیکن دوسری تحریریں بہت دلچسپ ہیں اور اِن سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اگر موصوف چاہیں تو ''اوراق ناخواندہ'' کے علاوہ بھی بہت کچھ تصنیف کر سکتے ہیں۔ ن م راشد اور فیض کے شخصی خاکوں میں بعض سنسنی خیز واقعات ملتے ہیں جن سے اِن دونوں کی شخصیتوں کے نئے رخ سامنے آتے ہیں۔

انیس ناگی نے بتایا ہے کہ اُنھوں نے جب پاکستان کی جدید اردو شاعری کے انگریزی تراجم پر مشتمل کتاب مرتب کی تو راشد نے اُن سے پوچھا: ''تم اپنی کتاب کس شاعر کی نظموں سے شروع کر رہے ہو''؟ ناگی نے بتایا کہ سب سے پہلے فیض کی نظمیں ہوں گی۔ اِس کے جواب میں راشد نے کہا: ''تو پھر میری نظموں کے تراجم اپنی کتاب سے خارج کردو''۔ انیس ناگی کو غصہ آ گیا۔ اُنھوں نے کہا: ''میں کتاب کے دیباچے میں آپ کی نظموں کی غیر حاضری کی وجہ یہی بیان کروں گا کہ آپ فیض سے پہلے چھپنا چاہتے تھے''۔ راشد نے قہر بھری نظروں سے ناگی کی طرف دیکھا اور کہا: ''جیسے تمھاری مرضی''۔

جب ناگی کی کتاب ''نیا شعری افق'' شائع ہوئی، راشد اُس زمانے میں نیو یارک میں تھے۔ ناگی نے اُنھیں کتاب بھیجی تو راشد نے خط کے ذریعے یہ رائے ظاہر کی: ''عزیزی آپ برخود غلط قسم کے نقاد ہیں۔ آپ نے جس تیقّن سے اپنے غلط نظریات کا اظہار کیا ہے، مجھے اُس پر حیرت ہے''۔ ظاہر ہے راشد نے انیس ناگی کی کتاب پڑھ کر ہی رائے دی ہوگی۔ ہمیں اِس پر حیرت ہے کہ مرحوم نے اپنی مختصر زندگی میں اتنا کچھ کیسے پڑھ لیا!

جن دنوں ناگی شجاع آباد میں سب ڈویژنل مجسٹریٹ تھے، اُس زمانے میں راشد پاکستان آئے اور ملتان میں اپنے بھائی کے ہاں مقیم ہوئے۔ اُنھوں نے فون کر کے ناگی کو شجاع آباد سے تیس میل دور ملتان بلایا اور اپنا ایک مسئلہ پیش کیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مشہور شاعر منیر نیازی نے ''المثال'' کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کر رکھا تھا، اور اُس کی طرف سے راشد کی کتابیں شائع کی تھیں۔ راشد کا خیال تھا کہ منیر نیازی نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے، لہٰذا وہ اُس کے خلاف غبن اور دھوکا دہی کا مقدمہ درج کرانا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ناگی کی مدد چاہتے ہیں۔ ناگی نے مروّت میں مدد کا وعدہ تو کرلیا مگر اس کے بعد راشد سے ملاقات نہ کی۔ ناگی کی یہ بات بہت اچھی ہے کہ اُنھوں نے ادبی معاملات میں اپنے سرکاری اختیارات کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنے تمام ادبی حریفوں کو بدچلنی اور نقضِ امن کے الزامات کے تحت تھانے کچہری کے چکر لگانے پر مجبور کردیتا۔ ہم انیس ناگی کی طرح کے

Marfat.com

ایک سرکاری افسر سے واقف ہیں جنھیں عدالتی اختیارات بھی حاصل تھے اور شاعری کا بھی شوق تھا۔ ایک محفل میں وہ کلام سنا رہے تھے، حاضرین ادب کی وجہ سے خاموشی سے سن رہے تھے۔ جناب شاعر کو داد نہ ملی تو اُن کے اندر کا سرکاری افسر چراغ پا ہو گیا۔ اُنھوں نے حاضرین کو ڈانٹ کر کہا: ''اِس خاموشی کی وجہ سے آپ کو توہین عدالت کے جرم میں سزا ہو سکتی ہے''۔

فیض کے شخصی خاکے میں ناگی نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ اُنھوں نے فیض کی کچھ نظموں کے انگریزی میں ترجمے کیے اور فیض کو سنانے کے لیے لاہور کے ایک ہوٹل میں گئے جہاں وہ مقیم تھے۔ اِن ترجموں سے فیض اتنے خوش ہوئے کہ انیس ناگی کو ماسکو کے ادبی میلے میں اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ آگے کا قصہ انیس ناگی کے الفاظ میں یہ ہے: ''عقب سے ٹک ٹک کی آواز آئی، مڑ کر دیکھا تو کشور ناہید اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتی مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ بلند آواز میں بولی، آہا آج دونوں میں کیا راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کشور کو دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا اور میں سوچنے لگا، اب میں کبھی ماسکو نہیں جاسکوں گا۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ اُس نے اپنے سینڈل اتارے اور پلنگ پر چڑھ کر فیض صاحب کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اُس نے ایک دو مرتبہ فیض کی پیشانی نہایت کاروباری طریقے سے تھپتھپائی پھر اُس کو بوسہ دیا... وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھی کہ میں وہاں بیٹھا کیا کر رہا تھا۔ فیض صاحب، یہ خبیث یہاں کیا کر رہا ہے، میں تو آپ کو مشاعرے میں لے جانے کے لیے آئی ہوں... فیض صاحب نے کہا، کشور اِس مرتبہ انیس ہمارے ساتھ ماسکو جائے گا اور وہاں اپنی نظمیں سنائے گا۔ کشور پٹاخ سے بولی، واہ فیض صاحب ہم آپ کے جاں نثار ہیں اور سیر یہ کرے۔ یہ تو آپ کی شاعری کے خلاف تقریر بھی کرتا ہے ... فیض صاحب نے سگریٹ کے ایک دو گہرے کش لیے اور کہنے لگے، انیس تمھارا ماسکو جانا درست نہیں۔ خفیہ پولیس تمھیں تنگ کرے گی اور ملازمت میں مشکل پیش آئے گی... میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ پندرہ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ کشور ناہید اور فیض صاحب ماسکو کے ادبی میلے کے لیے پرواز کر چکے ہیں''۔

افسوس کہ پرواز حریفوں کی قسمت میں لکھی گئی اور انیس ناگی اُڑتی چڑیا کے پر گننے کے لیے برسرِ زمین رہ گئے۔

انیس ناگی کی خود شناسی کی طرح غالب شناسی بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اِس سلسلے میں وہ دو کتابیں لکھ کر غالبِ خستہ کو مزید خستہ کر چکے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں بھی اُن کا ایک مضمون شامل ہے جس کا عنوان ہے: ''غالب اور میرا تبادلہ''۔ اِس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ جس زمانے میں وہ پنجاب آرکائیوز کے ڈائریکٹر تھے، اُنھیں حکومتِ پنجاب کے ریکارڈ میں

Marfat.com

غالب کی پنشن سے متعلق بہت سی غیر مطبوعہ درخواستیں مل گئیں اور اُنھوں نے اُن کے ترجمے کا کام شروع کردیا۔ انیس ناگی کے پیش رو نے حکومتِ پنجاب سے شکایت کی کہ وہ پہلے ہی اِس موضوع پر کام کر چکے ہیں لہٰذا ناگی کو دخل در معقولات سے روکا جائے۔ اِس پر ناگی کا تبادلہ کسی دوسرے محکمے میں کردیا گیا۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد ناگی لکھتے ہیں: ''میں نے سوچا کہ غالب سے دوستی مہنگی پڑی ہے۔ اِن سے دور ہی رہنا بہتر ہے لیکن یہ ممکن نہیں۔ میرے پاس غالب پر کام کرنے کے ایک دو منصوبے ہیں۔ اِس تذبذب میں ہوں کہ اِن پر کام کروں یا انھیں ابھی التوا میں رکھوں۔ میں اب بوڑھا ہوگیا ہوں اور مزید آزمایشوں کا متحمل نہیں ہوسکتا''۔

ہماری رائے میں یہ دوستی غالب اور ناگی دونوں ہی کو مہنگی پڑی ہے۔ ناگی کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے، اپنے منصوبوں پر کام جاری رکھنا چاہیے۔ ہم اُنھیں اطمینان دلاتے ہیں کہ غالب میں ابھی مزید آزمایشوں سے گزرنے کی سکت ہے۔

ناگی کو اپنی شاعری پر اتنا فخر نہیں جتنا اِس بات پر ہے کہ ۱۹۶۰ء میں نئی شاعری کی جو تحریک چلی تھی، وہ اُس کے بانیوں میں سے ہیں۔ یہ نئی شاعری جو لاہور کے مشہور ٹی ہاؤس کی چائے کی پیالی میں طوفان کی حیثیت رکھتی ہے، کب کی نقش و نگارِ طاقِ نسیاں بن چکی مگر انیس ناگی اُسے اردو ادب کی ایک عہد آفریں تحریک سمجھتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ نئے افسانے کو بھی اپنی نئی شاعری کی ضمنی پیداوار قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ''انتظار حسین کی ادبی ریشہ دوانیوں اور نئی شاعری کی مخالفت کا یہ حل سوچا گیا کہ اُن کے مقابلے میں انور سجاد کو تیار کیا جائے ... میں نے اُس سے کہا، منٹو کی وفات کے بعد اردو افسانے کا میدان خالی ہے۔ اُس نے اپنا منحنی سا سینہ پھلا کر کہا میں کس لیے ہوں''۔ اِن مکالموں کے بعد نیا افسانہ وجود میں آگیا۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن آگے چل کر ناگی اپنے بیان کو ایک ایسے جملے پر ختم کرتے ہیں جس سے یہ واقعہ ایک لطیفے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ جملہ یہ ہے، ''انتظار حسین بہت چیں بجیں ہوئے اور انور سجاد کی دیکھا دیکھی اپنے افسانے کا رنگ بدلا''۔

اِسی قسم کی باتیں پڑھ کر ناگی کو داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اُنھوں نے اس کتاب میں بڑی محنت سے ادبی لطیفے جمع کیے ہیں۔ لیکن اِس میں صرف لطیفے ہی نہیں ہیں، بعض دردناک واقعات بھی ہیں۔ ''ایک بھولی ہوئی سرگزشت'' کے عنوان کے تحت ناگی نے اپنے حالاتِ زندگی بیان کیے جنھیں پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اِس مضمون کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: ''مجھے پوری طرح احساس ہے کہ میں ایک ناکام ادیب ہوں۔ مجھے یہ بھی اچھی طرح احساس ہے کہ میں نے ادب کے آدرش کے لیے اپنی ساری عملی زندگی وقف کی تھی، وہ بھی رائیگاں گئی۔

Marfat.com

عملی سطح پر بھی میں ایک ناکام اور بودا شخص ثابت ہوا ہوں جو ترقی اور عروج کی منزل طے نہیں کر سکا۔ میں بین الاقوامی سطح پر ادب کا ایک ستارہ بننا چاہتا تھا لیکن میں جغرافیائی اور تہذیبی سطح پر ایک ایسے بدقسمت خطے سے تعلق رکھتا ہوں جو ہمیشہ محکوم رہا ہے، جو ہمیشہ انتشار میں رہا ہے اور دنیا کے نقشے پر کسی امتیاز کا حامل نہیں''۔

ناگی نے بڑی صفائی کے ساتھ اپنے مزاج اور شخصیت کی بعض ایسی خصوصیات کا ذکر کیا ہے جنھیں کوئی دوسرا بیان کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لکھتے ہیں: ''میں اِس وقت جو کچھ ہوں اور مجھ میں جو کج رویاں ہیں، اُن کا ذمہ دار میرے والد کا پیدا کردہ ماحول تھا... مثال کے طور پر یہ خودسری، ضد، اپنی راستی پر بے پایاں یقین، خود پسندی، طبیعت میں بے پناہ غصہ اور ایک طرح کی جذباتی سنگ دلی، منھ پھٹ ہونا اور گستاخی میری وراثت میں آئی ہے۔ میرے خاندان میں بہتر تعلیم کے باوجود تمام کی شخصیت پر ایک طرح کی ناتراشیدگی اور احساسِ برتری بے حد غالب ہے''۔

اِس مضمون کا اختتام اِن الفاظ پر ہوتا ہے: ''جو شخص کسی کو کچھ نہیں دے سکتا، کسی کا نفع نقصان نہیں کر سکتا، اُس کا کوئی دوست نہیں ہے۔ میں اِسی لیے اپنے آپ کو تنہا پاتا ہوں۔ اِس تنہائی میں میری سوگواری میری ملازمت کی وجہ سے ہے۔ ملازمت میں جتنی میری تحقیر کی گئی ہے، اگر میں شاعر نہ ہوتا تو شاید خودکشی کر لیتا۔ میری ملازمت میرے لیے، میری آزادی کے لیے، ہر طرح کی ایک رکاوٹ رہی ہے۔ اگر میں نے اِس طرح کی ملازمت کرنا تھی تو پھر ایک کل وقتی ادیب ہونا زیادہ باعثِ فخر تھا۔ میں اِس فخر سے اپنے آپ کو محروم پاتا ہوں۔ میں اِس غلطی کا کفارہ ادا نہیں کر سکتا۔ میں ایک کل وقتی ادیب کے طور پر زندہ رہنا چاہتا تھا لیکن حالات نے مجھے اور طرف دھکیل دیا۔ ہو سکتا ہے کہ میرے مزاج کے اندر تلخی اور میری تحریروں میں سفاکی یا ناخوش گواری موجودہ حقیقت کے ادراک سے پیدا ہوئی ہو جس میں مجھے ہر شخص ایک مکار درندہ نظر آتا ہے''۔

ہم یہ کالم انیس ناگی کے لیے درازیِ عمر اور شادمانی کی دعا پر ختم کرتے ہیں تاکہ وہ آیندہ زندگی اپنی مرضی کے مطابق بسر کر سکیں۔

(۶ر جون ۱۹۹۶ء)

Marfat.com

تنقید یا دشنام نویسی

ساقی فاروقی کی ایک نظم کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے اُنھیں ایک خط میں لکھا تھا: ''آپ فن کی اُن بلندیوں پر ہیں کہ لوگ آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو اُن کی ٹوپیاں اور پگڑیاں گر جاتی ہیں''۔

ساقی نے اِس بیداد نما داد کا شکریہ اِن لفظوں میں ادا کیا تھا: ''اِس طرح کی داد وہی لوگ دیتے ہیں جو اندر سے مضبوط ہوں۔ شکریہ میرے دوست بہت بہت شکریہ''۔

ہم نے ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے کالم میں لکھا تھا: ''ساقی کے فن کی بلندیوں کو دیکھ کر جو ٹوپیاں اور پگڑیاں نہیں گرتیں، اُنھیں ساقی خود اپنے ہاتھ سے گرا دیتے ہیں''۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہمارا یہ تبصرہ دراصل ایک پیش گوئی ہے، اور ٹھیک دس برس بعد ڈاکٹر وزیر آغا کی دستارِ فضیلت ہوگی اور ساقی فاروقی کا دستِ باد پیما (ممکن ہے مشاعروں میں شرکت کرنے والے پیشہ ور شاعروں اور نثری نظم لکھنے والوں کو ''دستِ باد پیما'' کا مطلب سمجھنے میں دقت ہو، اُنھیں مزید تھوڑی سی دقت ہوگی، اِس ترکیب کا مفہوم کسی لغت میں دیکھ لیں، یا پھر اِس کالم کی اگلی سطریں غور سے پڑھ لیں۔

دس سال پہلے ڈاکٹر وزیر آغا، بقول ساقی، اندر سے بہت مضبوط تھے، لیکن اب وہ اتنے کم زور ہو چکے ہیں کہ ساقی نے اُن کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ یہ اعلانِ جنگ ڈاکٹر صاحب کے نام ساقی کے ایک طویل خط کی صورت میں سامنے آیا ہے جو پہلے فوٹو اسٹیٹ کی صورت میں تقسیم ہوا پھر دہلی کے سہ ماہی ''ذہن جدید'' میں شائع ہوا اور اب لاہور کے رسالے ''معاصر'' میں جلوہ افروز ہوا ہے۔ جب تک ہمارا یہ کالم شائع ہوگا، امید ہے یہ خط کئی

Marfat.com

اور رسالوں میں چھپ کر ساقی کی شہرت میں بے پناہ اضافے کا سبب بن چکا ہوگا۔ ایک خط سے اتنی بہت سی شہرت سمیٹ لینا، ساقی کا کمال نہیں کہ شہرت آج کل اِسی طرح ملتی ہے۔ ساقی کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے یہ خط بڑی محنت سے اور بہت سے خطرات مول لے کر لکھا ہے جس کا اندازہ خط کی اِن آخری سطور سے ہوتا ہے: ''بہت تھک گیا ہوں۔ صبح کے سات بجے ہیں۔ رات بھر سوچتا اور لکھتا رہا ہوں۔ آج رات بھی سگریٹ کے تین پیکٹ، فرانس کی ایک سرخ وائن کی بوتل اور جرمنی کی ایک سفید وائن کی بوتل پی چکا ہوں۔ یہ چیزیں دل کے مریض کے لیے زہر ہیں''۔

یہ ایک رات کی روداد ہے۔ باقی دو راتوں میں بھی یہی کچھ ہوا ہوگا۔ اِس سے ساقی کی محنت اور لگن کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے دل کے مریض ہونے کے باوجود زہر خوری کا شغل فرماتے رہے ہیں۔ چھ بوتلوں کی روشنائی سے اُنھوں نے جو خط لکھا ہے، اُسے پڑھتے ہوئے، پڑھنے والا بھی جھومنے لگتا ہے اور اُس کا سر اِس طرح گھومنے لگتا ہے جیسے خط لکھنے والے کا دستِ باد پیا۔

اِس خط کو بار بار چھپوانے کا مقصد شاید یہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا مشتعل ہو کر اِس کا جواب لکھیں لیکن ڈاکٹر صاحب اِس طرف توجہ ہی نہیں کر رہے۔ ہماری رائے میں اُنھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے ورنہ اُن کی بجائے ساقی مشتعل ہو جائیں گے اور اُن کے نام ایک اور خط لکھ ڈالیں گے۔ بالکل اُسی طرح جیسے پچھلے دنوں ساقی نے رسالہ ''سوغات'' (بنگلور) کے ایڈیٹر محمود ایاز کے نام گالیوں بھرا ایک خط لکھا تھا۔ جب کوئی جواب نہ آیا تو ایک اور خط لکھ دیا جس میں سابقہ گالیوں کی شرح بھی تھی اور کچھ نئی گالیوں کا اضافہ بھی تھا۔ اگر اِس خط کا بھی جواب نہ آیا تو پھر سمجھ لینا چاہیے کہ محمود ایاز کی ساری زندگی ساقی کے خط وصول کرنے میں گزر جائے گی۔

ساقی کی خوبی یہ ہے کہ جب وہ کوئی عتاب نامہ لکھتے ہیں تو مکتوب الیہ کو بعد میں بھیجتے ہیں، پہلے اُس کی سیکڑوں نقلیں اِدھر اُدھر تقسیم کر دیتے ہیں۔ اِس سے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مکتوب الیہ کی رسوائی بڑے پیمانے پر ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ جن لوگوں کو اِس خط کی نقلیں ملتی ہیں، وہ اِس خیال سے دہل جاتے ہیں کہ ایسا خط ایک دن اُن کے نام بھی لکھا جا سکتا ہے۔ اِسی لیے تو ہم نے ساقی کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''بازگشت و بازیافت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اُنھیں ایک ادبی دہشت گرد قرار دیا تھا اور یہ لکھا تھا: ''آج کے دور میں کئی ایسے شاعر ہمارے درمیان موجود ہیں جو اچھی نثر بھی لکھ لیتے ہیں لیکن ساقی فاروقی کی بات ہی اور ہے۔ باقی لوگ تو شرافت کے دائرے میں رہتے ہوئے لکھتے ہیں، ساقی اِس

Marfat.com

دائرے سے باہر نکل کر بھی کام کی باتیں کر جاتے ہیں۔ شرافت کی بات اِس لیے درمیان میں آئی کہ ساقی کی لغت میں لحاظ و مروت نام کی کوئی چیز نہیں ہے، وہ بے باکی بلکہ سفاکی کی حد تک صاف گو ہیں۔ واضح رہے کہ صاف گو حق گو کے معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا۔ صاف گو سے مراد وہ شخص ہے جو کسی مصلحت کے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ سچ بھی بولے''۔

ساقی کی تازہ ترین دہشت گردی کا ہدف ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ بظاہر تو ساقی نے اُن کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے لیکن اندازِ بیان ایسا اختیار کیا ہے جیسے ڈاکٹر صاحب سے اُن کی پرانی دشمنی ہو۔ حالاں کہ دونوں میں سولہ برس تک خوش گوار دوستانہ تعلقات رہے ہیں جن کی تفصیل خود ساقی نے اپنے خط میں بیان کردی ہے۔ اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ دونوں کے درمیان اسّی خطوں کا تبادلہ ہوا۔ ساقی نے متعدد مرتبہ لاہور اور سرگودھا میں ڈاکٹر صاحب کی میزبانی کے مزے لوٹے۔ میزبان ہی نے نہیں، اُس کے ملازموں نے بھی مہمان کو زیر بار کیا۔ دو مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا بھی لندن گئے۔ ساقی نے اِس پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی خاطر خواہ مدارات نہیں کر سکے۔ ہمیں ساقی کی اِس بات سے اتفاق نہیں ہے۔ مہمان کی مدارات صرف دعوتیں کرنے سے نہیں ہوتی خط لکھ کر بھی کی جاسکتی ہے لہٰذا ساقی نے اپنا فرض بخوبی ادا کردیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ساقی کی تواضع پر جو کچھ خرچ کیا ہوگا، اُس سے کہیں زیادہ تو ساقی نے اُن چھ بوتلوں پر صرف کردیا ہوگا جو خط لکھنے کے دوران خالی کی گئیں۔

باہمی محبت کے سلسلے میں، خط میں ساقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ''آپ نے میری اَن گنت نظموں کے سلسلے میں غلو سے کام لیا اور اِس طرح داد دی (جس طرح) راشد، محمد حسن عسکری، ناصر کاظمی، سلیم احمد اور اطہر نفیس دیا کرتے تھے ... میں نے بھی آپ کی علمی فراست اور آپ کی تنقیدی بصیرت کو اپنے کسی انٹرویو میں ... نظر انداز نہیں کیا۔ بلکہ آپ کے فیض والے مضمون سے اتنا خوش ہوا کہ اپنی ایک نظم یا غزل آپ کے نام معنون کر دی۔ یہ سعادت میں نے کسی اور کو نہیں بخشی''۔

استاد لاغر مراد آبادی نے یہ اقتباس پڑھ کر فرمایا: ''اب کے ساقی نے ڈاکٹر وزیر آغا کو ایک اور سعادت بخشی ہے کہ اُن کے نام کے خط میں گالیوں سمیت ایسی بہت سی باتیں لکھ دی ہیں جنھوں نے سولہ برسوں کے مخلصانہ تعلقات پر خاک ڈال دی ہے۔ ساقی نے پہلے وزیر آغا کے نام اپنی کوئی نظم یا غزل معنون کی تھی، اب کے اپنے دل کا غبار اُن کے نام کردیا ہے''۔

ہمیں استادِ گرامی کی اِس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ ساقی کی دشنام طرازی ہمیشہ

Marfat.com

خلوص پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خلوص وہ ہوتا ہے جو اُنھیں اپنی ذاتِ گرامی سے ہے اور پھر دشنام طرازی بلکہ دشنام نویسی ہی تو ساقی کی شناخت ہے، ڈاکٹر وزیر آغا کا احترام اپنی جگہ لیکن ڈاکٹر صاحب کی خاطر ساقی اپنے آپ کو بے شناخت تو نہیں کر سکتے۔

ہمیں اِس سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ ساقی نے اپنے خط میں دل کا غبار نکالا ہے۔ یہ دل کا نہیں دماغ کا غبار ہے جسے دماغ سوزی بھی کہا جاسکتا ہے۔ ساقی کو ڈاکٹر صاحب کے کلام میں عروض، زبان و بیان اور الفاظ کے استعمال کی جو غلطیاں نظر آئی ہیں، وہ دماغ سوزی ہی کا نتیجہ ہیں۔ ساقی نے جتنی دماغ سوزی ڈاکٹر صاحب کی شاعری پر کی ہے، اگر اِس کا دسواں حصہ وہ اپنی شاعری پر صرف کرتے تو آج اُن کا مجموعۂ کلام ''دیوانِ غالب'' کے برابر رکھا جاسکتا تھا۔ غالب کا مکان، ایک مسجد کے پہلو میں تھا جس کی بنا پر غالب اپنے آپ کو ''ہمسایۂ خدا'' کہا کرتے تھے۔ اِسی طرح ساقی بھی اپنے مجموعے کو دیوان غالب کے ساتھ رکھا دیکھ کر ''ہمسایۂ غالب'' ہونے پر فخر کر سکتے تھے۔ قطع نظر اِس سے کہ خود غالب کا کیا ردِعمل ہوتا!

لوگ پوچھتے ہیں کہ آخر فریقین میں اتنے گہرے تعلقات کا ایسا افسوس ناک انجام کیوں ہوا۔ اِس کی وجہ بھی ساقی نے خود ہی بتا دی ہے۔ خط کے شروع میں وہ لکھتے ہیں: ''میری شکایت یہ رہی کہ آپ نے مجھ سے زیادہ کم تر شاعروں کا گوشہ (اپنے رسالے) اوراق میں نکالا، میرا کیوں نہیں''۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ساقی کی شکایت بجا ہے۔ آخر ڈاکٹر صاحب نے اپنے رسالے کے غالب نمبر اور اقبال نمبر شائع کیے ہیں، اگر ایک گوشہ ساقی فاروقی کا بھی نکال دیتے تو کیا حرج تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جان بوجھ کر ساقی سے ''زیادہ کم تر'' شاعروں یعنی غالب اور اقبال کو اچھالا اور ساقی کو نظر انداز کیا۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو سارا قصور ڈاکٹر صاحب کا نظر آتا ہے۔ کاش وہ صرف خطوں ہی میں ساقی کی تعریف نہ کرتے، اپنے رسالے کے صفحات کو بھی آلودۂ مدح کر دیتے تو ساقی کو اُن کی شان میں ''قدح نامہ'' لکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

بعض لوگوں کی مذکورہ رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ فرض کیا، ڈاکٹر صاحب، ساقی کی شان میں گوشہ کیا، پورا نمبر بھی شائع کر دیتے تو اس سے ساقی کی حیثیت میں کیا فرق پڑتا۔ وہ جیسے ہیں اور جس مقام پر ہیں، ویسے ہی اور وہیں رہتے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح غالب اور اقبال سے متعلق خصوصی شماروں کی اشاعت کے بعد بھی اِن دونوں شاعروں کے قد و قامت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اصل بات یہ ہے کہ ساقی اِس رسالے کے ذریعے خود کچھ

Marfat.com

حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اپنے حوالے سے رسالے کے معیار کو اونچا دیکھنے کے خواہاں تھے۔ ساقی کا گوشہ چھپتا تو چار دانگِ عالم میں ''اوراق'' کی دھوم مچ جاتی۔ رسالہ گودام میں پڑے رہنے کی بجائے ہاتھوں ہاتھ بک جاتا۔ آدھا ایڈیشن تو ساقی خود ہی خرید لیتے کہ وہ معیاری کتابیں اور رسالے بڑی تعداد میں خرید کر دوستوں میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔

(۱۴؍اپریل ۱۹۹۴ء)

Marfat.com

تنقید کے چراغ تلے

پچھلے دنوں ڈاکٹر عالیہ امام کی کتاب ایک دوست کی عنایت سے مل گئی۔ اُسے پڑھ کر ہم نے دل ہی دل میں مصنفہ کا شکریہ ادا کیا کہ اُنھوں نے واقعی ایک عالمانہ تنقیدی کتاب لکھی ہے بشرطے کہ علم اور تنقید سے اِس کتاب کا کوئی تعلق دریافت کیا جاسکے۔

کتاب کا پورا نام ہے ''شاعر انقلاب ... نظریاتی وتنقیدی مطالعہ''۔ یہ مطالعہ کس قسم کا ہے، اِس کا اندازہ دیباچے کے اِس جملے سے کیا جاسکتا ہے: ''حضرت جوش کی رعنائی فکر و نظر رنگِ جلدِ بدن، رنگ سوزِ گلو اور رنگِ لختِ جگر کی قیود سے آزاد ہے''۔ حضرت جوش کے لختِ جگر سجاد حیدر خروش خدا کے فضل سے کراچی ہی میں موجود ہیں، وہی اِس جملے کا مفہوم سمجھا سکتے ہیں، ورنہ ہم جیسے عام قاری کے لیے تو یہ جملہ ہر طرح کے مفہوم و معنی کی سطح سے بلند ہے۔

فاضل مصنفہ نے جوش ملیح آبادی کے اسلوب کی پیروی کرتے ہوئے لفظوں کو جمع کرنے میں بے مثال مہارت کا مظاہرہ کیا ہے، فرق یہ ہے کہ جوش صاحب اپنے قاری کو خوف زدہ کرنے کے لیے لفظوں کو بھاری پتھروں کی طرح لڑھکاتے تھے جب کہ عالیہ امام لفظوں سے خوب صورت مناظر کی تشکیل کرتی ہیں۔ کتاب کا پہلا باب جوش کے تصورِ عشق سے متعلق ہے۔ اِس کا آغاز اِن الفاظ سے ہوتا ہے: ''اُن کی شاعری کا بنیادی محرک محبت کا جذبہ تھا جس کی دل فریب وادی میں اُنھوں نے اِس جذبے کی وسعت، اِس کی عظمت اور آسمان کی سی رفعت دیکھی۔ اس وادی میں کڑی دھوپ بھی تھی اور نرم رو دریا کی روانی بھی۔ پرشکوہ جھاڑیاں بھی، سرو قد سنگتروں کے درخت بھی، ڈھلوان چٹانیں بھی اور جنگلی پھول بھی''۔

Marfat.com

(ص۔۸) ... اردو تنقید میں تو کیا، شاعری میں بھی ایسی منظر نگاری شاید ہی کسی نے کی ہو۔ ممکن ہے بعض کوتاہ نظر یہ اعتراض کریں کہ محبت کی وادی میں اور سب کچھ تو ٹھیک ہے، سنگتروں کے درخت اور وہ بھی سرو کے درختوں کی طرح سربلند کہاں سے آگئے؟ اِن معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ محبت کی وادی میں رہنے والوں کو آخر کھانے پینے کی ضرورت بھی پیش آتی ہوگی، سنگترہ وہ پھل ہے جو بھوک اور پیاس دونوں کو مٹاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ سنگترے کے درخت سرو قد کس طرح ہوگئے تو اِس کا جواب یہ ہے کہ درختوں کی باہمی پیوند کاری سے یک کے قد اور دوسرے کے پھل کو یک جا کر دینا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

محترمہ نے جوش کے تصورِ عشق کے بارے میں خاصی تفصیل سے بحث کی ہے، جس کا خلاصہ اُنھی کے الفاظ میں یہ ہے: ''گو بیوی سے اُنھیں محبت تھی، لیکن ذہنی سطح پر جو محرومی تھی، وہ اُنھیں گھر سے باہر لے گئی... جوش کا عشق تقلیدی نہیں، وہ سنا سنایا یا اکتسابی اور کتابی نہیں بلکہ ذاتی تجربات کی آنچ میں پک کر کندن بنا ہے۔ جو ہر قانون کو گرفت میں لے لیتا ہے، ہر پابندی کو توڑتا، ہر چٹان سے موج کی طرح ٹکراتا ہے۔ اِس لیے اُن کا عشق سماجی مسرت میں اضافہ کرتا ہے''۔ (ص ۲۷)

ہر بات کا صرف منفی پہلو دیکھنے والے ضرور یہ کہیں گے کہ جوش صاحب نے گھر سے باہر جو گل کھلائے، اُس سے اُن کی ذاتی مسرت میں تو یقیناً اضافہ ہوا ہوگا مگر سماجی مسرت میں اضافہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ اعتراض کم فہمی کا نتیجہ ہے، حیرت ہے کہ معترضین کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ جوش صاحب گھر سے باہر نکل کر گل کھلانے کے دوران یا اُس کے فوراً بعد شاعری بھی تو کرتے تھے، یہی شاعری سماجی مسرت میں اضافے کا باعث ہوتی تھی۔

محترمہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ جوش صاحب شادی کے ادارے کے خلاف تھے، اس لیے وہ ''عشق میں صرف ایک کے ہو کر رہ جانے کو imagination کے افلاس سے تعبیر کرتے ہیں جو شاید صحیح ہے، اس لیے کہ جس معاشرے میں مرد نے صدیوں سے عورت کے جسم و جاں پر ڈاکے ڈالے ہوں، وہاں عشق جسم ہی کے مرحلے طے کرتا ہے، ذہن کے نہیں۔ اس لیے اگر جوش صاحب کا عشق اپنے طبقے کی خو بو لیے ہوئے ہے، رفاقت کی نرم آنچ سے محروم ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں... حضرت جوش نے بانگ دہل عشق کیا، اُن کا رویہ اپنے طبقے کی دیرینہ روایات سے بغاوت ہے، عشق میں جسم کی گرمی اور روح کی پاکیزگی دونوں کو اچھوتے اسلوب میں بیان کرنا زندگی میں ایک مثبت قدر کا اضافہ کرنا ہے، جو گناہ و ثواب کے تمام آہنی حصاروں کو توڑ کر بے باکی و جرأت کا حوصلہ عطا کرتی ہے ...''۔ (ص ۵۹)

Marfat.com

اِس اقتباس کے شروع میں محترمہ نے لفظ ''شاید'' استعمال کیا ہے، جو یقیناً کے نعم البدل کے طور پر خاصا لطف دے رہا ہے، البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ محترمہ نے ایک ہی سانس میں یہ دو متضاد باتیں کیسے کہہ دیں کہ جوش صاحب کا عشق اُن کے اپنے طبقے کی خو بو لیے ہوئے بھی ہے اور اِس طبقے کی دیرینہ روایات کے خلاف بغاوت بھی ہے۔ حسبِ معمول ہم نے یہ مسئلہ استاد لاغر مراد آبادی کے سامنے رکھا تو انھوں نے فرمایا: ''اِن دونوں باتوں میں ہرگز کوئی تضاد نہیں ہے، جوش صاحب بیک وقت شاعرِ شباب بھی تھے اور شاعرِ انقلاب بھی، شاعرِ شباب کی حیثیت سے جب وہ عشق کرتے تھے تو اُن کے عشق میں اپنے طبقے کی خو بو آجاتی تھی، لیکن شاعرِ انقلاب کی حیثیت سے اُن کا عشق اپنے طبقے کی دیرینہ روایات سے بغاوت کا اعلان کر دیتا تھا''۔

ہم نے مزید وضاحت چاہی تو استادِ گرامی نے فرمایا: ''آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ڈاکٹر عالیہ امام، پیپلز پارٹی کی سابق چیئر پرسن محترمہ نصرت بھٹو کی مشیر برائے ثقافتی امور ہیں، اِس لیے ثقافتی معاملات میں اُن کے ارشادات سند کا درجہ رکھتے ہیں، وہ جو کچھ کہتی ہیں، اُسے بلا چون و چرا تسلیم کر لینا چاہیے''۔

ڈاکٹر عالیہ امام نے جوش کے عشق کا اقبال کے عشق سے موازنہ کرتے ہوئے کیا عمدہ بات کہی ہے: ''اقبال نے آفتاب تازہ کی بشارت دی لیکن اُن کے عشق کا تصور بھنور میں پھنس گیا، عشق کے آفتابے سے جنسی کشش کو باسی کھانے کی طرح الٹ دیا''۔ (ص ۲۹)... اور باتوں کو چھوڑیے، صرف اس کی داد دیجیے کہ آفتاب اور آفتابے کی رعایتِ لفظی نے جملے کو کتنا خوب صورت بنا دیا ہے۔ یہی نہیں اِس جملے سے ہماری ایک غلط فہمی بھی دور ہوگئی، ہم سمجھتے تھے کہ آفتابہ پانی کے استعمال کا برتن ہے، اب معلوم ہوا یہ باسی کھانا رکھنے کے کام آتا ہے۔

محترمہ نے علامہ اقبال کے حالِ زار پر اِس کتاب میں کئی جگہ توجہ فرمائی ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتی ہیں: ''اقبال کے خمیر میں کشمیر کی مٹی کی خوش بو بسی ہوئی ہے لیکن بدقسمتی سے وہ اِس مٹی سے رشتہ استوار نہ کر سکے، گو برہمن زادے تھے لیکن اسلام کے شیدائی بنے، دل حریمِ حجاز سے جڑا ہوا تھا''۔ (۱۰۷)

اقبال پر سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن حیرت ہے کہ اقبال کی مذکورۂ بالا ''بدقسمتی'' کی طرف کسی کی نظر نہیں گئی، کیا ہی اچھا ہو اگر ڈاکٹر صاحبہ اِس موضوع پر ایک مستقل کتاب تصنیف فرما دیں کہ کتابیں تصنیف فرمانا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

اِس کتاب کو کئی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن ہر باب میں ویسے ہی مباحث ہیں

Marfat.com

جن کی دو چار مثالیں اوپر درج کی جا چکی ہیں۔ اِس لیے کتاب کے کسی ایک باب کو تو کیا، کسی ایک صفحے کو بھی پڑھ لینا، پوری کتاب پڑھ لینے کے مترادف ہے، البتہ ورق گردانی پوری کتاب کی کرنی پڑے گی، کیوں کہ اِس میں جا بجا تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں جن میں مصنفہ جوش صاحب کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ اِن تصویروں سے بھی مصنفہ کی اپنے موضوع سے گہری عقیدت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ عقیدت کا ذکر آیا ہے تو ایک اقتباس پیش کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ فرماتی ہیں: ''ہندوستان میں جوش صاحب بے تاج بادشاہ تھے، اُن کی ایک ایک ادا پر سو جان سے پنڈت جواہر لال نہرو نثار تھے، وہ کروڑوں انسانوں کے محبوب تھے، اُن کے چہرے کا دیدار وہاں کے لوگوں کے لیے عبادت تھا، اُن کے کوچے میں قدم رکھنا، اُن کے لیے کعبے کا طواف تھا، اُن کی یاد میں سو جانا شبِ قدر کی بیداری تھا، ذرہ ذرہ اُن کی عزت کرتا تھا''۔ (ص ۱۹۸)

ہندوستان میں جوش صاحب کے مراتب کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ ذرہ ذرہ اُن کی عزت کرتا تھا اور پاکستان میں اُن کی یہ درگت بنی کہ ڈاکٹر عالیہ امام نے اُن پر ایک تنقیدی کتاب لکھ دی۔

ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی خود نوشت سوانح عمری ''شاخ ہری اور پیلے پھول'' میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ وہ اکثر جوش صاحب کے گھر جایا کرتی تھیں۔ بیگم جوش کو اُن کا آنا پسند نہیں تھا۔ ایک روز بیگم صاحبہ کا پیمانۂ صبر چھلک گیا اور اُنھوں نے ڈاکٹر عالیہ امام سے کہا: ''مجھے ایسی عورتیں زہر لگتی ہیں جو دوسروں کے کارخانے میں دخل دیں''۔

افسوس کہ بیگم جوش کا انتقال ہو چکا ہے۔ اگر زیرِ نظر کتاب اُن کی زندگی میں شائع ہوتی تو وہ اِسے دیکھ کر ضرور یہ کہتیں: ''اچھا تو اب آپ تنقید کے کارخانے میں بھی دخل دینے لگیں''۔

(۱۴ر جولائی ۱۹۹۴ء)

Marfat.com

غالب ناشناسی

کسے معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ جن کتابوں کا شائع ہونا نہ ہونا برابر ہے، اُن کا تو چرچا ہوگا اور جو کتابیں کسی نہ کسی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہیں، اُن کے نام سے بھی کسی کو واقفیت نہ ہو گی۔ ایسی ایسی کتابوں کی رونمائیاں ہوتی ہیں جو اگر کسی مہذب معاشرے میں شائع ہوں تو اُن کے مصنّف منہ چھپاتے پھریں۔ مگر اب زمانہ ہی ایسا ہے کہ منہ چھپانے والے سر اٹھا کر چلتے ہیں اور جنھیں سر اٹھا کے چلنا چاہیے وہ اپنے اپنے کلبۂ احزاں میں سرنگوں بیٹھے ہیں کہ اُنھوں نے کتابیں شائع کر کے اپنا وقت اور روپیہ ضائع کیا۔ ایسے ہی لوگوں میں سید آفاق حسین آفاق دہلوی بھی شامل ہیں جنھوں نے پچھلے سال دو اہم کتابیں شائع کیں۔ ایک تو ''نادراتِ غالب'' کا نیا ایڈیشن ہے اور دوسری ''حدیثِ عارف'' جو مرزا غالب کے مُنہ بولے بیٹے اور شاگرد زین العابدین خاں عارف کا مجموعۂ کلام ہے۔ یہ وہی عارف ہیں جن کی جواں مرگی پر غالب نے وہ بے مثال نوحہ لکھا تھا جس کا پہلا شعر یہ ہے:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور

آفاق دہلوی خوش گو شاعر ہیں۔ اُن کا مجموعۂ کلام ''جلوۂ آفاق'' بیس بائیس برس قبل شائع ہوا تھا لیکن اُن کی شاعری اُن کے لیے ذریعۂ عزت تو کیا ذریعۂ شہرت بھی نہ بن سکی۔ شہرت اور عزت اُنھیں ''نادراتِ غالب'' کے حوالے سے ملی۔ یہ اُن کی نہیں، غالب کی تصنیف ہے۔ (غالب بھی کیسے مخیّر آدمی ہیں کہ اپنی عزت و شہرت میں دوسروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں!)

Marfat.com

''نادرات'' میں غالب کے ایسے خط شامل ہیں جو پہلے کبھی شائع نہیں ہوئے تھے۔ آفاق دہلوی کو یہ خطوط اپنے نانا میرن صاحب سے ورثے میں ملے تھے۔ یہ وہی میرن صاحب ہیں جن سے غالب کو ربطِ خاص تھا اور جو غالب کے عاشق صادق تھے۔ یہ عشق اِس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ اگر کوئی غالب کے خلاف کچھ کہتا یا اُس کا کوئی شعر غلط پڑھ دیتا تو یہ چراغ پا ہو جاتے۔ غالب سے میرن صاحب کو کس حد تک عقیدت تھی، اِس کا اندازہ ایک واقعے سے ہوتا ہے جو مولوی عبدالحق نے بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ کسی محفل میں سید محمد حسین اغلب موہانی نامی ایک شاعر کا تعارف میرن صاحب سے کرایا گیا۔ تخلص سن کر چونکے اور بگڑے ''ہیں! غالب سے بھی بڑھ گیا''۔ یہ کہہ کر مُنھ پھیر لیا اور اُن صاحب سے بات تک نہ کی۔ (ہمارا کالم چوں کہ اردو کے ادیب بھی پڑھتے ہیں، اِس لیے غالب اور اغلب کا فرق بتا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ ''اغلب'' کے معنی ہیں ''غالب تر''۔)

میرن صاحب کو غالب کی شاعری کے ساتھ ساتھ اُن کے خطوں سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ منشی نبی بخش حقیر کے پاس غالب کے بہت سے خط محفوظ ہیں تو اُنھوں نے یہ سارے خط ایک بیاض میں نقل کر لیے۔ اِسی بیاض کو ۱۹۴۹ء میں آفاق دہلوی نے ''نادرات غالب'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ اب اِس کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے جس میں غالب کے پانچ ایسے خط بھی ہیں جو پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے ہیں۔ یہ خاصے دلچسپ خط ہیں مگر افسوس کہ ہم انھیں یہاں نقل نہیں کر سکتے کیوں کہ کتاب کے پہلے صفحے پر جلی حروف میں لکھا ہے کہ خطوں کا کوئی اقتباس مؤلف کی اجازت کے بغیر شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اپنے لیے ''مؤلف'' کا لفظ آفاق دہلوی نے ازرہِ انکسار استعمال کیا ہے، وہ اپنے آپ کو غالب کے خطوں کا مصنّف سمجھتے ہیں، ورنہ اُنھیں یہ پابندی لگانے کی کیا ضرورت تھی کہ اِن خطوں کا کوئی اقتباس بھی بلا اجازت کسی مضمون میں نقل نہیں کیا جاسکتا۔

تقریباً چالیس سال پہلے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ''انتخابِ خطوطِ غالب'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ اِس میں چند خطوط ایسے بھی تھے جو ''نادرات'' سے لیے گئے تھے۔ آفاق دہلوی نے ڈاکٹر صاحب پر مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ اگرچہ اس مقدمے کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا، تاہم اِس سے متعلق کچھ اخباری تراشے ''نادرات'' کے دوسرے ایڈیشن میں بطور ضمیمہ شامل کر دیے گئے ہیں تاکہ اُنھیں پڑھ کر لوگوں میں خوف و ہراس پیدا ہو، اور آیندہ کوئی ''نادرات'' سے استفادے کی جسارت نہ کر سکے۔

مالک رام نے خطوطِ غالب کا مجموعہ شائع کیا تھا، اس میں اور ڈاکٹر خلیق انجم

Marfat.com

کی مرتبہ کتاب ''غالب کے خطوط'' میں ''نادرات'' کے تمام خطوط شامل کر لیے گئے ہیں۔ آفاق دہلوی نے اِس پر شدید احتجاج کیا ہے اور کہا ہے کہ ''نادرات'' میں شامل خطوطِ غالب اُن کی ذاتی ملکیت ہیں، کسی دوسرے کو اُن کے شائع کرنے کا حق نہیں ہے۔ مالک رام اور ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتبہ مجموعے بالترتیب انجمن ترقی اردو ہند اور انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کیے ہیں۔ اِس حوالے سے آفاق دہلوی لکھتے ہیں: ''ان دونوں انجمنوں کے بطن سے غالب کے خطوط کی شکل میں ناجائز اولاد پیدا ہوئی ہے''۔

غالب کے خطوں کے لیے اتنے سخت الفاظ استعمال کرنا میرن صاحب کے نواسے کے شایانِ شان نہیں ہے اور وہ بھی اِس صورت میں جب کہ موصوف اِن خطوں پر حق ملکیت کا دعویٰ بھی کر رہے ہیں۔ آفاق صاحب نے سخت زبان استعمال کر کے اپنے ہی دعوے کو کم زور کرلیا ہے۔ جب اُنھوں نے یہ تسلیم کرلیا کہ غالب کے خطوط انجمن ترقی اردو کی ناجائز اولاد ہیں تو پھر دوسرے کی اولاد پر اور وہ بھی جو ناجائز ہو، حق جتانا کہاں کی دانش مندی ہے۔

آج غالب کے خطوط کی ملکیت کا جھگڑا اٹھا ہے تو کل کوئی صاحب دیوان غالب کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرا کے اعلان کر دیں گے کہ اُن کے سوا کوئی دوسرا اِس دیوان کو شائع نہیں کر سکتا۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے کچھ عرصہ قبل بہادر شاہ ظفر کی اولاد میں سے کسی نے دعویٰ کیا تھا کہ تاج محل کا قبضہ اُنھیں دیا جائے کیوں کہ اِس کے قانونی وارث وہی ہیں۔ یہ دعویٰ بڑی حد تک نامعقول ہونے کے باوجود کسی حد تک معقول تھا کیوں کہ اِس مغل زادے کا شاہان مغلیہ سے نسبی تعلق تھا۔ مگر آفاق صاحب کا دعویٰ شاعرانہ نازک خیالی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیوں کہ اُن کا غالب سے نسبی تو کیا سببی تعلق بھی نہیں ہے۔

میرن صاحب نے غالبؔ کے خطوں کی طرح زین العابدین خاں عارف کا دیوان بھی نقل کیا تھا جو آفاق دہلوی کو ورثے میں ملا اور جسے انھوں نے ''حدیث عارف'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اگر کوئی دوسرا شخص اِس دیوان کو مرتب کرتا تو وہ مختلف کتب خانوں میں موجود دیوان عارف کے قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے مستند متن شائع کرتا لیکن آفاق صاحب نے محققانہ تکلفات کو تضیعِ اوقات سمجھا اور میرن صاحب نے جو کچھ نقل کیا تھا، اُسے ایک اور مرتبہ نقل کر کے کاتب کے حوالے کردیا۔ میرن صاحب، آفاق صاحب اور کاتب صاحب کی مشترکہ کوششوں سے نقل درنقل کے عمل نے کلامِ عارف کو خاصا مجروح کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے اشعار بے معنی ہوگئے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر میرن صاحب کی تیار کردہ نقل کا عکس شائع کردیا جاتا تاکہ نقل درنقل کے عمل کی وجہ سے غلطیوں کی تعداد میں اضافہ نہ ہوتا۔ اِسی سے خیال آتا ہے

Marfat.com

کہ ''نادراتِ غالب'' میں شامل خطوط میں بھی اِسی طرح کی غلطیاں راہ پا گئی ہوں گی۔ اِن خطوط کو بھی میرن صاحب کی تحریر میں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

''حدیثِ عارف'' کے سرورق پر جلی حروف میں لکھا ہے: ''بعض ماہرینِ غالبیات کے خیال میں عارف کا کلام مرزا غالب ہی کا کلام ہے''۔ خیال تھا کہ کتاب کے دیباچے میں اس دعوے کی دلیل دی گئی ہوگی اور اُن ماہرینِ غالبیات کے نام بتائے گئے ہوں گے جنھوں نے عارف کے کلام کو غالب کا کلام قرار دیا ہے لیکن دیباچے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ علامہ تاجور نجیب آبادی نے مذکورہ خیال ظاہر کیا تھا۔ علامہ تاجور ماہر غالبیات نہیں تھے، بفرضِ محال مذکورہ اظہارِ خیال کے بعد ماہر غالبیات بن ہی گئے تھے تو فردِ واحد کو ''ماہرین'' کیسے بنا دیا گیا۔ شاید احتراماً جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ علامہ تاجور اپنے علم و فضل کی وجہ سے بلاشبہہ احترام کے مستحق تھے، مگر ہمیں اِس پر حیرت ہے کہ آفاق دہلوی نے علامہ کا تو اتنا احترام کیا کہ انھیں واحد سے جمع بنا دیا لیکن عارف کا کلام غالب سے منسوب کر کے عارف کی عزت خاک میں ملا دی۔

عارف کا کلام خود عارف ہی کا ہے، اگر یہ غالب کا کلام ہے تو پھر وہ کلام جو غالب کے نام سے ملتا ہے کسی اور کا ہوگا۔ ہم نے اِس خیال سے عارف کا پورا کلام پڑھ ڈالا کہ غالب کے رنگ کا کوئی شعر نظر آجائے لیکن ہمیں کامیابی نہیں ہوئی۔ سچی بات یہ ہے کہ عارف اپنے رنگ کا بے مثال شاعر ہے، اس رنگ میں غالب ڈھنگ کے دو شعر بھی نہیں کہہ سکتے۔

عارف نے مشکل زمینوں میں اپنے کمالِ فن کا جو مظاہرہ کیا ہے اُس کی غالب سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ اُنھیں آسان اور پامال زمینوں میں شعر کہنے کی عادت تھی۔ عارف کی ایک غزل اس زمین میں ہے:

گریہ سے ہے عاشقِ دل گیر پانی کے تلے
حال دل کا کیا کرے تقریر پانی کے تلے

عارف نے پانی کے تلے پندرہ شعر لکھے ہیں۔ غالب اتنی گہرائی میں جا کر شعر لکھتے تو ڈوب جاتے۔

عارف بات سے بات پیدا کرنے میں اس حد تک ماہر ہیں کہ اُن کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ہوتی۔ بات چبانا اور پان چبانا، دو مختلف باتیں ہیں لیکن عارف نے اُنھیں بڑی خوبی سے یک جا کر دیا ہے:

کب گلوری دہنِ تنگ میں لے سکتے تھے
بات ناچار چبانے لگے وہ پان کی جا

Marfat.com

عرضِ مطلب پر محبوب بات چبا جاتا ہے یعنی ٹال جاتا ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ محبوب پر عیاری کا الزام رکھا جائے لہٰذا بات چبانے کا جواز یہ پیش کیا ہے کہ محبوب کا دہن اتنا تنگ ہے کہ اُس میں گلوری سما نہیں سکتی، اِس وجہ سے مجبوراً وہ پان کی جگہ بات چبانے لگا ہے۔ غالب کا پورا دیوان دیکھ جایئے، ایسی نازک خیالی اُس کے ہاں نہیں ملے گی۔

عشق میں سوکھ کر کانٹا ہو جانے کا مضمون اکثر شاعروں نے باندھا ہے لیکن عارف نے لاغری کے حوالے سے بالکل نئی بات کہی ہے:

چشمِ مورِ کوئے جاناں میں مرا گھر ہو گیا
کیا ہی آسایش میں ہوں، میں جب سے لاغر ہو گیا

اس غضب کا مضمون پوری اردو شاعری میں ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔ لاغر دبلے کو کہتے ہیں لیکن یہاں مراد ایسا شخص ہے جو عرض ہی میں نہیں، طول میں بھی کم ہو گیا ہو۔ اتنا کم کہ چیونٹی کی آنکھ میں سما سکے۔ حضرت عارف چیونٹی کی آنکھ میں بیٹھ گئے اور چیونٹی بھی وہ جو محبوب کے کوچے میں رہتی ہے۔ موصوف ہر وقت محبوب کے جلووں سے آنکھیں سینکتے رہتے ہیں اور کسی کو اِس کی خبر نہیں ہوتی۔ غالب دنیا دار آدمی تھے، اِس لیے خلعت و دربار کے معاملات میں الجھے رہے۔ عارف کی طرف قناعت پسند ہوتے تو چیونٹی کی آنکھ میں بڑے آرام سے زندگی گزار سکتے تھے۔

غالب نے ہمیشہ محبوب کے درباں یا پاسبان کی خوشامد کی لیکن عارف کا طریق کار بالکل مختلف تھا، فرماتے ہیں:

آج پھر بولے تو پھر ایسی لگاؤں جوتی
سر کھجاتا ہی رہے آپ کا درباں کل تک

مختصر یہ کہ کہاں عارف اور کہاں غالب۔ آفاق دہلوی نے عارف کے کلام کو غالب سے منسوب کر کے عارف اور غالب دونوں کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔

آخر میں ہم آفاق دہلوی سے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا خطوطِ غالب کی طرح کلام عارف بھی اُن کی ملکیت ہے؟ پچھلے سال جمیل الدین عالی نے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ عارف کے بیٹے باقر علی خان کامل اُن کے والد کے پھوپھا تھے۔ ایسی صورت میں عارف کے واحد وارث عالی صاحب ہیں۔ کیا آفاق صاحب نے عالی صاحب کی اجازت سے کلامِ عارف شائع کیا ہے؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اُنھوں نے عالی صاحب سے اجازت نہیں لی۔ حیرت ہے کہ آفاق صاحب اپنے مفروضہ جملہ حقوق کے لیے تو لڑتے ہیں لیکن دوسروں کے اصلی جملہ حقوق کی پروا نہیں کرتے۔

(۱۱راگست ۱۹۹۴ء)

Marfat.com

سفرنامہ یا عبرت نامہ

قمر علی عباسی کو ہم اُس وقت سے جانتے ہیں، جب وہ نہایت خوش وضع اور خوش اطوار آدمی تھے۔ خوش وضع تو خیر وہ اب بھی ہیں لیکن بُرا وقت آتے دیر نہیں لگتی کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ادیب بن گئے۔ اِس کا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ اب اُن میں خوش اطواری کی خصوصیت نہیں رہی، خدا کے فضل سے موجود ہے مگر بعض دیگر خصوصیات کے تلے اِس طرح دب گئی ہے کہ نظر نہیں آتی۔ کسی بھلے مانس کا ادیب بن جانا ایسا ہی ہے جیسے کسی دینی مدرسے کے فارغ التحصیل کا پولیس میں ملازم ہو جانا، وہ بے چارہ لاکھ اپنی پارسائی کا دعویٰ کرے مگر محکمۂ پولیس کی شہرت اُس کے دعوے کو رد کر دیتی ہے۔

قمر علی عباسی کو ادیب بننے کا شوق ہوا تو اُنھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ کتابیں لکھنی شروع کر دیں، حالاں کہ اچھے وقتوں میں جب ادب کا شوق پیدا ہوتا تھا تو پہلے کتابیں پڑھی جاتی تھیں، کتابیں لکھنے کا مرحلہ اِس کے بعد آتا تھا۔ کتابیں نہ پڑھنے کا عباسی کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ نہ صرف دوسروں کی تقلید سے بچ گئے بلکہ ادبی معیار کے سلسلے میں بھی خود کفیل ہو گئے، یعنی اُن کی کتابوں کو اُنھی کے قائم کردہ معیاروں سے جانچا جا سکتا ہے، عام ادبی معیار اُن کی کتابوں کے سامنے بے وقعت نظر آتے ہیں۔

عباسی نے یہی نہیں کیا کہ کتابیں لکھیں، بلکہ یہ بھی کیا کہ کثرت سے لکھیں۔ ۱۹۸۷ء میں اُن کی پہلی کتاب چھپی تھی، پچھلے سال پانچویں کتاب شائع ہوئی۔ سالِ رواں بہت مبارک ہے کہ ابھی ختم نہیں ہوا کہ اُن کی دو کتابیں ایک ساتھ منظرِ عام پر آ گئی ہیں۔ یہ جڑواں کتابیں ناک نقشے کے اعتبار سے بالکل ایک جیسی ہیں، بس یوں سمجھیے کہ ایک دوسرے کا چربہ معلوم ہوتی

Marfat.com

ہیں۔ یہ تو سنا تھا کہ پاکستان میں چربہ فلمیں بنتی ہیں، خوشی کی بات ہے کہ اب چربہ کتابیں بھی چھپنے لگی ہیں۔ عباسی کی کتابوں کی ولادت کی اگر یہی رفتار رہی تو ممکن ہے اقوام متحدہ کی بہبود آبادی کانفرنس کی طرح اکادمی ادبیات پاکستان کو ادبی منصوبہ بندی کانفرنس کا اہتمام کرنا پڑے۔ اگر اِس کانفرنس میں یہ طے ہو گیا کہ کوئی مصنّف زندگی بھر میں تین سے زیادہ کتابیں نہیں لکھ سکتا تو قمر علی عباسی اِس پابندی سے بچ نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالیں گے اور کچھ نہیں تو وہ اپنی کتابوں پر پابندی لگنے کی تاریخ سے پہلے کی تاریخ درج کر دیا کریں گے۔ ممکن ہے کہ اس پر بعض لوگ یہ کہیں کہ اِس طرح تو موصوف کی ہر کتاب، چھپتے ہی آؤٹ آف ڈیٹ ہو جائے گی۔ ہماری رائے میں اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، عباسی اُن مصنّفین سے پھر بھی بہتر رہیں گے جن کی کتابیں لکھنے کے دوران ہی آؤٹ آف ڈیٹ ہو جاتی ہیں۔

کثیر التصانیف مصنّفین کے بارے میں عام خیال یہ پایا جاتا ہے کہ وہ زیادہ کتابیں لکھتے ہی اِس لیے ہیں کہ اُنھیں مصنّف مان لیا جائے، بالکل اُسی طرح جس طرح نازیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جھوٹ بار بار بولا جائے تو اُسے سچ سمجھ لیا جاتا ہے۔ لیکن اِس اصول کا اطلاق عباسی پر نہیں ہوتا۔ اول تو وہ جھوٹ بولتے نہیں اور پھر جو کچھ بولتے ہیں یا لکھتے ہیں، اُسے کبھی دہراتے نہیں۔ ہر مرتبہ نئی بات کہتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سفر نامہ نگار ہیں، ظاہر ہے کہ مختلف ملکوں کے سفر ناموں میں ایک ہی جیسے جغرافیائی حالات اور ایک ہی جیسے آثارِ قدیمہ کا ذکر نہیں کیا جا سکتا، اِسی سے عباسی کی تنوّع پسندی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ عباسی کی تنوّع پسندی جغرافیائی حالات اور آثارِ قدیمہ کی حد تک ہے، ورنہ اُن کے سارے سفر ناموں میں خواتین ایک ہی جیسی ہوتی ہیں اور ایک ہی جیسی باتیں کرتی ہیں۔ ہماری رائے میں یہ اعتراض لاعلمی کا نتیجہ ہے، معترضین کو معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا کے تمام ممالک میں ایک ہی نظام شمسی رائج ہے، سورج، چاند، ستارے ہی نہیں چاند جیسے چہروں اور ستاروں جیسی آنکھوں والے لوگ بھی تمام ملکوں میں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں، نظام شمسی کو تبدیل کر دینا قمر علی عباسی کے لیے تو کیا، کولمبس جیسے بڑے سیاح کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔

عباسی انتہائی محتاط مصنّف ہیں، وہ جس ملک کا سفر نامہ تحریر کرتے ہیں، اُس میں وہیں کے حالات لکھتے ہیں۔ بعض غیر محتاط سفر نامہ نگاروں کی طرح یہ نہیں کرتے کہ سفر نامہ تو لندن کا ہو اور حالات اپنے گھر کے لکھ دیے جائیں، جن کے لکھنے کے لیے لندن جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے سفر نامہ نگار جن حالات سے بچنے کے لیے سفر کرتے ہیں، اُنھیں حالات کو مزید خراب کرنے کے لیے واپس آ جاتے ہیں۔ عباسی کی واپسی

Marfat.com

کا مقصد بالکل مختلف ہوتا ہے، وہ ایک نئے سفر کی تیاری کے لیے واپس آتے ہیں، گویا اُن کا آنا، دوبارہ جانے کی تمہید ہوتا ہے۔ جتنا عرصہ وہ ملک میں رہتے ہیں، اِس دوران میں وہ اگلے سفر کی روداد لکھ لیتے ہیں۔ صرف مقامات اور افراد کے ناموں کے لیے جگہ چھوڑ دیتے ہیں، سفر کے دوران وہ خالی جگہوں کو پُر کرتے رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہر سفر کے بعد اُن کا سفرنامہ فوراً چھپ جاتا ہے۔

عباسی بڑے خوش قسمت ہیں کہ اُنھیں بار بار سفر کے مواقع ملتے ہیں۔ اُن کی خوش قسمتی اُس وقت قابلِ رشک ہو جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے بیشتر سفر دوسروں کے خرچ پر کیے ہیں۔ وہ عموماً کسی نہ کسی کی دعوت پر سفر کی نیت اور سامان باندھتے ہیں، اِسی لیے اُن کا ہر سفر خوش گوار ہوتا ہے۔ اپنے خرچ پر سفر کرنے والوں کی طرح تکلیف دہ نہیں ہوتا۔ ممکن ہے یہاں بھی بعض لوگ یہ کہیں کہ اُن کے سفر میں نہ سہی، سفرناموں میں تو تکلیف کا احساس پایا جاتا ہے۔ چوں کہ اِس احساس کا تعلّق مصنّف سے نہیں، پڑھنے والوں سے ہے، اس لیے ہم اِس اعتراض کو رد کرتے ہیں۔ قمر علی عباسی سے خوش گوار مراسم کی وجہ سے ہم اعتراض ہی کو رد کر سکتے ہیں، سفر ناموں کو نہیں۔

عباسی کے جو تازہ ترین دو سفرنامے ہمیں اظہارِ خیال کے لیے موصول ہوئے ہیں، وہ اگرچہ اخفائے خیال کے متقاضی ہیں، تاہم یہ اچھا نہیں لگتا کہ کوئی مصنّف اتنی محبت سے اپنی کتابیں عنایت کرے اور ہم اُس کے جواب میں تعریف کے تین حرف بھیجنے میں بھی بخل سے کام لیں۔ لہٰذا یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اِن سفرناموں کے نام یہ ہیں، ۱۔ برطانیہ چلیں ۲۔ نیل کے ساحل۔

جیسا کہ اِن ناموں سے ظاہر ہے، پہلا سفرنامہ انگلستان کا ہے اور دوسرا مصر کا۔ یہ نام اتنے خوب صورت ہیں کہ سفرنامے پڑھے بغیر اُن کے مطالب کی عمدگی کی داد دی جاسکتی ہے لیکن ہم چوں کہ خود داد کے طالب ہیں، اس لیے ہم نے اِن سفر ناموں کو شروع سے آخر تک پڑھا اور بے حد محظوظ ہوئے اور خدا کا شکر ہے کہ محفوظ بھی رہے۔ اِن سفرناموں کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے دوران کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا، جب واقعات دلچسپ ہوں اور جا بجا اُن پری وشوں کا ذکر ہو جن کی بری نظریں قاری کے جان و ایمان کی دشمن ہوں تو قدم قدم پر سلامتی کی دعا مانگنی پڑتی ہے۔ ہم تو خیر سخت جان ہیں اور یہ کالم لکھنے کیلئے بچ گئے، لیکن کمزور دل قارئین کو ہم مشورہ دیں گے کہ وہ مطالعے سے پہلے زندگی کا بیمہ کرالیں تا کہ ان کتابوں کا مطالعہ اُن کے لیے نہ سہی اُن کے پس ماندگان کے لیے مفید ثابت ہو۔

Marfat.com

قمر علی عباسی کا اندازِ بیان نہایت دل آویز ہے، اُن کی نثر میں کردار کی لغزشیں تو مل سکتی ہیں لیکن زبان کی غلطی کہیں نظر نہیں آئے گی۔ وہ ایسی عمدہ زبان لکھتے ہیں کہ اُن جیسے لکھنے والے ملک میں دو چار ہی ہوں گے بہ شرطے کہ ملک سے مراد ریڈیو پاکستان ہو۔ موصوف کراچی ریڈیو کے اسٹیشن ڈائریکٹر ہیں، حیرت ہے کہ اِس عہدے پر فائز ہونے کے باوجود وہ صحیح زبان لکھتے ہیں حالاں کہ ایسا نہ کرنا اُن کے فرائضِ منصبی میں شامل ہے۔ اِس سے ضمنی طور پر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ سرکاری اہل کار اپنے فرائضِ منصبی سے کس قدر غفلت برتتے ہیں۔

واقعہ نگاری میں بھی عباسی کو کمال حاصل ہے۔ بے جان واقعے میں وہ اپنے اندازِ بیان سے جان ہی نہیں ڈالتے بلکہ اپنے ذہنِ رسا کی مدد سے واقعے کی گم شدہ کڑیوں کو تلاش بھی کر لیتے ہیں۔ جوش صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ الفاظ اُن کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے تھے کہ ہمیں جس طرح چاہیں استعمال کریں، قمر علی عباسی کے سامنے واقعات ہاتھ باندھ کر یہی درخواست کرتے ہیں اور واقعات بھی وہ جو ابھی پردۂ غیب میں ہوتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، غالب کے ذہن میں بھی مضامین اِسی طرح غیب سے آتے تھے۔

دونوں سفرنامے اگرچہ مطالب کے اعتبار سے مختلف ہیں لیکن فلیپ کی آرا دونوں میں مشترک ہیں۔ معلوم نہیں اِس اشتراک کا سبب کیا ہے۔ دونوں سفرناموں کے لیے الگ الگ فلیپ نگاروں کا انتظام بآسانی کیا جاسکتا تھا۔ جو شخص ریڈیو اسٹیشن پر ایک ذمہ دار افسر ہو، اُس کے لیے کنٹریکٹ پر دستخط کرا کے اپنی تعریف میں چند سطریں لکھوا لینا کون سا مشکل کام ہے۔ ریڈیو کے ذمہ دار افسر تو ماضی میں کنٹریکٹ کے ذریعے کتابیں لکھوا کر بھی اپنے نام سے شائع کراتے رہے ہیں۔ آدمی ذمہ دار ہو تو ہر کام خوش اسلوبی سے ہو جاتا ہے۔

فلیپ پر سب سے عمدہ رائے ناصر زیدی کی ہے۔ یہ وہی مشہور شاعر ہیں جن کی غزلیں منی بیگم کی آواز میں اپنا جادو جگاتی رہتی ہیں اور جن کے بارے میں ہم نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ وہ غالب کے درجے کے شاعر ہیں کیوں کہ دونوں ایک ہی جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں، بس ذرا لفظوں کی ترتیب مختلف ہوتی ہے۔ ناصر زیدی نے عباسی کو اِن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے: ''اُن کے اسلوب میں شفیق الرحمٰن کی بے ساختگی، ابن انشا کی شگفتگی، مشتاق احمد یوسفی کی کاٹ اور کرنل محمد خان کی دلچسپ تحریر کا مزہ آتا ہے''۔ قطع نظر اِس سے کہ بعض اوقات بے مزہ بات بھی مزہ دے جاتی ہے، ہمیں اِس پر حیرت ہے کہ ناصر زیدی غزل کے شاعر ہونے کے باوجود مبالغے کا حق ادا نہیں کر سکے۔ مبالغے کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک

Marfat.com

مبالغۂ خام اور دوسری مبالغۂ تام۔ اول الذکر وہ مبالغہ ہے جس میں ممدوح کی تعریف کے ساتھ کچھ دوسرے لوگوں کی تعریف بھی کی گئی ہو۔ مبالغۂ تام یعنی مکمل مبالغہ وہ ہے جس میں ممدوح کی تعریف کے ساتھ کچھ دوسرے لوگوں کی مذمّت بھی کی گئی ہو تاکہ ممدوح کے اوصاف پوری طرح اجاگر ہوں۔ ناصر زیدی کی مذکورہ رائے مبالغۂ خام کے تحت آتی ہے کیوں کہ اِس میں قمر علی عباسی کے ساتھ شفیق الرحمٰن اور مشتاق احمد یوسفی وغیرہ کی تعریف کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ اگر ناصر زیدی ذرا سی توجہ سے کام لیتے تو مبالغۂ خام کو مبالغۂ تام میں بدل سکتے تھے، یعنی وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ عباسی کے اسلوب کی چار بنیادی خوبیاں ہیں جنھیں بے ساختگی، شگفتگی، کاٹ اور دلچسپیِ تحریر کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اِن میں سے ایک ایک خوبی بالترتیب شفیق الرحمٰن، ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی اور کرنل محمد خان میں بھی پائی جاتی ہے۔ اِن چاروں میں سے کوئی بھی قمر علی عباسی کے پائے کا ادیب نہیں ہے، ہاں چاروں مل کر عباسی کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ اِن سب کا چونکہ ایک وقت میں ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں ہے، اِس لیے عباسی کے قریب پہنچنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

فلیپ پر سب سے منفرد رائے مستنصر حسین تارڑ کی ہے جو خود بھی صفِ اول کے سفرنامہ نگار ہیں۔ فکشن میں بھی اُنھوں نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ قمر علی عباسی جیسا بہادر شخص ہی سفرنامہ لکھ سکتا ہے۔ اُن کے نزدیک بہادر شخص وہ ہے جو معاشرے سے ڈرتا ہے نہ نقاد سے اور نہ اپنی بیوی سے۔ زیرِ نظر سفرناموں کے مطالعے سے یہ تینوں باتیں درست ثابت ہوئی ہیں۔ عباسی معاشرے سے بالکل نہیں ڈرتے، اگر ڈرتے تو وہ سفرنامے لکھنے کی بجائے کوئی آبرومندانہ کام کرتے۔ نقاد سے نہ ڈرنے ہی کا نتیجہ ہے کہ نقاد بھی اُن کا خیال نہیں کرتے، آج تک کسی پیشہ ور نقاد نے اُن کو ادیب تسلیم نہیں کیا۔ بیوی سے نہ ڈرنے کا ثبوت یہ ہے کہ دونوں سفرناموں کا انتساب اِنھی محترمہ کے نام ہے۔ جن کتابوں کے ہر دوسرے صفحے پر کسی اصلی یا خیالی نامحرم خاتون کا چٹخارے دار ذکر ہو، اُن کا انتساب بیوی کے نام کرنا بڑی جرأت اور ہمت کی بات ہے۔ اِس بات پر تو عباسی کو تمغائے جرأت ملنا چاہیے۔

ہماری رائے میں سفرنامہ نگار کو کسی سے بھی نہیں ڈرنا چاہیے، بس دل میں تھوڑا سا خوفِ خدا ضرور ہونا چاہیے تاکہ سفرنامے اور فکشن میں جو فرق ہے، اُسے نظرانداز نہ کیا جاسکے۔ اپنی اِس بات کی وضاحت کے لیے ہم فلیپ نگار اور صاحب کتاب ہی کی مثال پیش کریں گے۔ تارڑ سفرنامے کو افسانہ بنا دیتے ہیں اور عباسی افسانے کو سفرنامہ، اِس کے باوجود دونوں کو سفرنامہ نگار ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ سمجھنے والوں کی غلطی ہے، اس کا تارڑ یا عباسی سے کوئی

Marfat.com

تعلق نہیں۔

فلیپ پر ایک رائے مشفق خواجہ کی بھی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو پچھلے پانچ برسوں میں تقریباً پانچ درجن کتابوں پر موصوف کے فلیپ اور دیباچے نظر سے گزرے ہیں جن میں لفظوں کی میناکاری یا بے سروپا مدح سرائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مشفق خواجہ کے پاس اگر وقت ضرورت سے زاید ہے تو اُسے کسی مفید کام میں صرف کرنا چاہیے، فلیپ لکھ کر وہ اپنے آپ ہی کو نہیں اُن لوگوں کو بھی ضائع کر رہے ہیں جن کی کتابوں پر وہ فلیپ لکھتے ہیں۔ فلیپ عموماً ان لوگوں سے لکھوائے جاتے ہیں جن کے نام دیکھ کر لوگ کتابیں خرید لیتے ہیں۔ مشفق خواجہ کے نام سے خود اُن کی اپنی کتابیں نہیں بکتیں تو دوسروں کی کیا فروخت ہوں گی۔ ایک کروڑ کی آبادی والے شہر کراچی میں اُن کی کتاب ''تحقیق نامہ'' کے صرف سترہ نسخے فروخت ہوئے ہیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ اتنے نسخے بھی کیسے فروخت ہوگئے۔ یقیناً موصوف نے خود ہی خریدے ہوں گے۔

قمر علی عباسی کے بارے میں مشفق خواجہ نے لکھا ہے: ''وہ سفر کے دوران راستے کے ہر منظر سے ہم کلام ہوتا ہے، کچھ اپنی کہتا ہے کچھ اُس کی سنتا ہے اور یوں اُس کا سفرنامہ ایک ایسی دستاویز بن جاتا ہے جسے پڑھ کر قاری کو احساسِ زیاں نہیں ہوتا۔'' مشفق خواجہ کی اپنی حد تک تو یہ بات درست ہوسکتی ہے کہ اُنھیں عباسی کی کتابیں مفت ملی تھیں، مگر جو لوگ اِن کتابوں کو خرید کر پڑھیں گے، اُن کے لیے یہ پیش گوئی کیسے کی جاسکتی ہے کہ اُنھیں احساسِ زیاں نہیں ہوگا۔

(۲۲ر ستمبر ۱۹۹۴ء)

Marfat.com

مطائبات شہرت بخاری

کہا جاتا ہے کہ غزل ایک مظلوم صنفِ سخن ہے کیوں کہ جو شخص بھی شاعری کی طرف رخ کرتا ہے، سب سے پہلے اسی کو تختۂ مشق بناتا ہے۔ اِس صنف پر شاعروں نے جو ستم توڑے ہیں، اگر اُنھیں بیان کیا جائے تو اُن کے سامنے چنگیز و ہلاکو کے مظالم کوئی حیثیت نہیں رکھتے، چنگیز و ہلاکو ظلم کرتے کرتے کبھی کبھار تھک بھی جاتے تھے، غزل گو ہر لحظہ تازہ دم رہتے ہیں۔

ہمیں ان سب باتوں سے اتفاق نہیں ہے، ہماری رائے میں غزل مظلوم نہیں بڑی ظالم صنفِ سخن ہے، عہدِ میر سے لے کر عہدِ فیض تک ہزاروں شاعروں نے قافیہ پیمائی کی مگر غزل نے اپنے راز سوائے چند شاعروں کے کسی پر ظاہر نہ کیے۔ یہی وجہ ہے کہ جن شاعروں کے سبب غزل نیک نام ہوئی، اُن کے نام دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، بشرطے کہ انگوٹھوں کو انگلیوں میں شمار نہ کیا جائے کیوں کہ انگوٹھے، انگوٹھا چھاپ متغزلین کی یاد دلاتے ہیں۔

عہدِ میر میں صرف دہلی میں پانچ ہزار شاعر تھے اور آج لاہور کے تھانہ انارکلی کی حدود میں اِس سے زیادہ شاعر مل جائیں گے۔ جس طرح عہدِ میر کے شاعروں میں سے آج صرف میر کا نام زندہ ہے اور باقی سب طاقِ نسیاں میں تشریف فرما ہیں، اُسی طرح تھانہ انارکلی کی حدود میں صرف شہرت بخاری ہی ایسے شاعر ہیں جنھیں لاہور کی میونسپل حدود سے باہر بھی جانا جاتا ہے۔ وہ گزشتہ نصف صدی سے غزل کہہ رہے ہیں، سبب تو اُنھیں کو معلوم ہوگا، نتیجہ ہم جانتے ہیں کہ بہ حیثیت غزل گو اُن جیسا وضع دار آج کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ جیسی شاعری وہ پچاس برس پہلے کرتے تھے، ویسی ہی آج بھی کر رہے ہیں۔ بلاشبہہ میر علی اوسط رشک اور امداد

Marfat.com

علی بحر جیسے لکھنوی اساتذہ کے رنگ میں اُن سے بہتر غزل کہنے والا کوئی نہیں۔ فرق یہ ہے کہ لکھنوی اساتذہ مشکل اور نامانوس قافیے ڈھونڈ کر لاتے تھے، شہرت بخاری سامنے کے قافیے اِس خوب صورتی سے باندھتے ہیں کہ اُن کی غزل کا ہر مصرعِ ثانی سہل ممتنع کی مثال بن جاتا ہے، یہ مصرعے ایسے برجستہ بلکہ تیر از کمان جستہ ہوتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والے کی عقل دنگ رہ جاتی ہے بشرطے کہ وہ پہلے ہی ماؤف نہ ہو چکی ہو۔

اُن کی ایک مشہور غزل ہے، بہک رہا ہوں کب سے، دہک رہا ہوں کب سے۔ اِس میں قافیوں کی روانی اور مصرع ہائے ثانی کی یکسانی قابل دید ہے۔ اِس غزل کے چند مصرعے یہ ہیں... بلبل سا چہک رہا ہوں کب سے، شعلہ سا بھڑک رہا ہوں کب سے، سورج سا چمک رہا ہوں کب سے، غنچہ سا چٹک رہا ہوں کب سے، بجلی سا لپک رہا ہوں کب سے، سونا سا دمک رہا ہوں کب سے، بادل سا کڑک رہا ہوں کب سے ... ایسے ہی اور بھی کئی مصرعے ہیں۔ شاید ہی کوئی قافیہ ہوگا جسے ردیف کی سولی پر نہ لٹکایا گیا ہو۔ مقطع البتہ ذرا مختلف ہے۔ اِس میں غالب کی طرح سخن گسترانہ بات کی ہے؟

معلوم یہ اب ، ہوا کہ شہرتؔ
دیوانہ ہوں بک رہا ہوں کب سے

شہرت بخاری آج اِس لیے یاد آئے کہ گزشتہ ہفتے روزنامہ ''نوائے وقت'' میں اُن کا ایک انٹرویو چھپا ہے، جسے پڑھ کر جی خوش ہوگیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ مطائبات اُن کی شاعری ہی میں ملتے ہیں، اب معلوم ہوا کہ وہ گفتگو بھی خاصی شگفتہ کرتے ہیں۔ پاکستان کی ادبی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں... ''۱۹۶۵ء تک ہمارے ادیبوں میں پڑھنے اور لکھنے کا رجحان بہت رہا، لیکن پھر یہ رجحان ختم ہوگیا، میرا اپنا یہ عالم ہے کہ کوئی اچھا شعر سنے اور شعر کہے زمانے گزر گئے، یوں لگتا ہے جیسے سننے اور کہنے کا شوق کوئی اندر سے نکال کر لے گیا ہے''۔

جناب شہرت نے اچھے شعر سننے اور کہنے کا معاملہ بلاضرورت اپنے کلام سے مشروط کرلیا ورنہ ہمارے کئی شاعروں نے ۱۹۶۵ء کے بعد اردو شاعری کو خاصا باثروت بنایا ہے۔ بہرحال موصوف کی یہ بات سزاوارِ تحسین ہے کہ اُن کا انکسار حقیقت پر مبنی ہے، ایک ایسے دور میں جب ہمارے شاعر کچھ نہ کرنے پر بھی بہت کچھ کر گزرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، جنابِ شہرت اپنے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں، اگر کچھ غلط فہمی ہے تو صرف اتنی کہ وہ ۱۹۶۵ء کے بعد کی اپنی شاعری سے مایوس ہیں۔ اِس سے پہلے کی شاعری شاید اُن کی نظروں میں

Marfat.com

نہیں ہے۔

ماضی میں جناب شہرت کا حلقۂ ارباب ذوق سے قریبی اور گہرا تعلق رہا ہے، ایک زمانے میں وہ اس کے سیکریٹری بھی تھے، مگر اب وہ اُس سے بے تعلق ہیں۔ کچھ عرصہ قبل بعض لوگوں کے اصرار پر اُنھوں نے حلقے کے ایک اجلاس میں شرکت کی تھی، اُس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں... ''محفل کا رنگ اور پیش کی جانے والی تخلیقات پر بے تکی تنقید سن کر مجھے بہت دکھ ہوا، میرا جی چاہتا تھا کہ میں روؤں''۔... حلقے کے ایک رکن نے اِس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''شہرت صاحب نے حلقے کے جس اجلاس میں شرکت کی تھی، اُس میں اُنھوں نے غزل سنائی تھی، غزل پر تنقید سن کر اُن کا جو حال ہوا، غزل سن کر ویسی ہی حالت ہم لوگوں کی بھی تھی''۔... فریقین کے بیانات سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اب حلقۂ ارباب ذوق کی فضا خاصی اشک آور ہو چکی ہے۔

جناب شہرت نے اپنے ساتھ ہونے والی اُس نا انصافی کا بطور خاص ذکر کیا ہے کہ اُنھیں اقبال اکیڈمی کی نظامت سے سازشوں کے ذریعے ہٹا دیا گیا۔ اِس سلسلے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے بطور پس منظر یہ بتا دینا بے جا نہ ہوگا کہ بے نظیر حکومت کے دونوں ادوار میں جیالوں کو منہ مانگی مرادیں ملتی رہی ہیں۔ ہر طرح کے سرکاری اداروں میں اہلوں کو برطرف کر کے جیالوں کو کلیدی عہدوں پر بٹھا دیا جاتا تھا، اِس سلسلے میں علمی و ادبی اداروں کو بھی بخشا نہیں جاتا تھا۔ کشور ناہید، سائنس بورڈ کی ڈائریکٹر بن جاتی تھیں اور جغرافیے کی ایک استانی کو ہسٹاریکل کمیشن کی سربراہی سونپ دی جاتی تھی۔ ریوڑیوں کے اِس تبرک میں سے جناب شہرت کو بھی اُن کا حصہ ملا اور اُنھیں پروفیسر مرزا محمد منور جیسے عالم بے بدل اور ماہر اقبالیات کی جگہ اقبال اکیڈمی کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا۔ اس سے علمی حلقوں میں خاصی بے چینی پیدا ہوئی کیوں کہ اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر کے لیے ضروری ہے کہ اُس نے اقبال پر کچھ لکھا ہو۔ انگریزی اور فارسی پر دسترس رکھتا ہو، فلسفے اور اسلامیات سے واقف ہو۔ جناب شہرت ان شرائط میں سے کسی ایک کو بھی پورا نہیں کرتے۔ اُنھیں یہ ملازمت کس طرح ملی یہ اُنھیں کی زبانِ حقیقت ترجمان سے سنیے:

''۱۹۸۸ء میں جب بے نظیر بھٹو برسرِ اقتدار آئیں تو لاہور میں ایک کھانے پر اُن سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آج کل آپ کیا کرتے ہیں تو میں نے جواب دیا کہ فارغ ہوں۔ اِس پر اُنھوں نے وہاں موجود حکام سے دریافت کیا کہ کہاں کہاں جگہ خالی ہے، حکام نے جن اداروں کے نام لیے اُن میں اقبال اکیڈمی بھی شامل تھی۔ چنانچہ دوسرے یا

Marfat.com

تیسرے روز چیف سیکریٹری پنجاب نے فون کر کے مجھے اپنے دفتر بلایا اور مجھے اقبال اکیڈمی کا ڈائریکٹر بننے کی پیشکش کی جو میں نے قبول کر لی، مگر چوں کہ میں ایک خوددار شخص ہوں اور کسی کی خوشامد نہیں کر سکتا، چنانچہ وہ خوشامدی لوگ جو میرے مخالف تھے، میرے خلاف سرگرم ہوگئے، اُنھوں نے خوشامد اور سازشوں کے ذریعے مجھے اِس عہدے سے ہٹوا دیا''۔

اقبال اکیڈمی میں جگہ تھی، خانۂ خالی را دیوی گیرد کے مصداق وہ اُس جگہ پر قابض ہو گئے۔ بدقسمتی سے اٹامک انرجی کمیشن میں جگہ خالی نہیں تھی، ورنہ موصوف کا وہاں تقرر ہو جاتا اور اِس طرح شاعری کو ایٹمی توانائی میں تبدیل کرنے کی صورت نکل آتی۔ حیرت ہے کہ ایک خوددار اور خوشامدی شخص نہ ہونے کے باوجود جناب شہرت نے اِس غیر قانونی تقرر کو کیوں قبول کیا۔ اقبال اکیڈمی، پارلیمنٹ کے ایک قانون کے ذریعے قائم شدہ ادارہ ہے، جس کے ڈائریکٹر کا تقرر صرف اکیڈمی کی مجلسِ نظما کر سکتی ہے۔ حکومت پنجاب سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے، پنجاب کے چیف سیکریٹری کو ایسے کسی تقرر کا حق حاصل نہیں ہے، مگر جیالوں کی حکومت میں یہ سب کچھ روا تھا، اِس لیے غیر قانونی طور پر ایک ایسے شخص کو اقبال اکیڈمی کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا جو کسی اعتبار سے بھی اِس منصب کا اہل نہیں تھا۔

بے نظیر کی حکومت گئی تو علمی اداروں سے جیالے بھی رخصت ہوگئے، جناب شہرت بھی اقبال اکیڈمی کے بجائے حسب سابق شہرت اکیڈمی کے ڈائریکٹر بن گئے، لیکن وہ اپنی رخصتی کا سبب اُن لوگوں کو بتاتے ہیں جنھوں نے اپنی سازشوں اور خوشامدوں کا جال اُن کے خلاف پھیلا رکھا تھا۔ موصوف نے یہ نہ سوچا کہ جب تعمیر ہی میں خرابی مضمر ہو تو کسی دوسرے کو الزام نہیں دیا جاسکتا۔

انٹرویو لینے والے نے جناب شہرت سے یہ سوال کیا: ''کہا جاتا ہے کہ آپ کو یہ عہدہ آپ کی اہلیہ کی اُن خدمات کے صلے میں دیا گیا تھا جو اُنھوں نے پیپلز پارٹی کے لیے ضیاء الحق کے دور میں اور اُس سے پہلے انجام دی تھیں''۔ جناب شہرت نے اِس کے جواب میں ارشاد فرمایا: ''یہ درست ہے کہ میری اہلیہ نے بہت سی سیاسی خدمات انجام دیں اور ہو سکتا ہے کہ بے نظیر بھٹو نے مجھے اقبال اکیڈمی کی ذمہ داری سونپتے وقت اُن کی سیاسی خدمات کو بھی پیشِ نظر رکھا ہو، لیکن اُنھوں نے کسی سطح پر بھی اِس کا اظہار نہیں کیا، ہمارے بعض حاسدوں نے اِسی گمان کو بنیاد بنا کر میرے اور میری اہلیہ کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ میرے عہدے کی کوئی سیاسی وجہ ہوتی تو میں سمجھتا ہوں کہ بے نظیر بھٹو اپنے دوسرے دور میں مجھے دوبارہ موقع دیتیں، تاہم اتنا ضرور ہے کہ میں نے ذوالفقار علی بھٹو پر بہت لکھا اور وہ اس لیے کہ بھٹو صاحب

Marfat.com

بطور انسان مجھے اچھے لگتے تھے، وہ پُرجوش مقرر تھے اور مکا مار کر بات کرتے تھے"۔

اِس جواب کے بعد کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے، اہلیہ محترمہ کی سیاسی خدمات کا صلہ حاصل کرنے کا واقعہ پاکستان کی سیاست اور علمی اداروں کی تاریخ کا بے نظیر واقعہ ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ بے نظیر نے اپنے دوسرے دورِ حکومت میں تمام برطرف شدہ جیالوں کو دوبارہ بحال کردیا تھا، لیکن جناب شہرت بے حال ہی رہے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اب کے اُس شخصیت نے سفارش نہ کی جس نے پہلی مرتبہ اپنی سیاسی خدمات کے صلے میں ملازمت دلوائی تھی، خرابی کہیں اور تھی، لیکن سازشیوں اور خوشامدیوں کے حوالے سے اُسے کہیں اور تلاش کیا گیا۔ شاعری کی اصطلاح میں اِسی طریقِ کار کو ایہام گوئی کہا جاتا ہے۔

اقبال اکیڈمی میں تقرر سے پہلے جناب شہرت حکومت پنجاب کی قائم کردہ "مجلس دفتری زبان" میں ملازم تھے۔ اِس ملازمت کے دوران اپنی کارگزاری کی تفصیل اُنھوں نے اپنی کتاب سوانح "کھوئے ہوؤں کی سرگزشت" میں یوں بیان کی ہے: "میں نے تقریباً چار برس ملازمت کی جو برائے نام تھی، اتنا آرام زندگی میں کہیں حاصل نہیں ہوا، اِس محکمے کا کام ایک ایسا لغات تیار کرنا تھا جو اردو کے سرکاری زبان بننے میں مد ثابت ہو سکے مگر میرا کام یہ تھا کہ میں صبح دفتر جاؤں، تھوڑی دیر اِدھر اُدھر پھروں، دیگر مترجمین سے اِدھر اُدھر کی ہانکوں، چائے پیوں اور میز پر پڑ کر سو جاؤں، دوپہر کو اُٹھوں، کھانا کھانے گھر جاؤں اور پھر اکثر واپس نہ آؤں"۔

جناب شہرت جتنا عرصہ اقبال اکیڈمی میں رہے، اُن کی مصروفیات اِسی نوعیت کی تھیں، فرق یہ تھا کہ وہ میز پر نہیں، میز کے نیچے بوریا بچھا کر سوتے تھے تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ اقبال اکیڈمی کا ڈائریکٹر بھی اقبال کی طرح بوریا نشین ہے۔

ہماری دلی ہمدردیاں جناب شہرت کے ساتھ ہیں، ہم اُنھیں مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ اقبال اکیڈمی میں دوبارہ دخل در معقولات کا ارادہ ترک کردینے ہی میں عافیت ہے، اگر اقبال کی خطائیں معاف کردی جائیں تو یہ نیکی کا کام ہوگا اور اِس کا اجر بھی ملے گا۔

جو شخص بھٹو کا پرستار ہو، اُس پر بہت کچھ لکھ چکا ہو، اُس کے مکا مار کر بات کرنے کے انداز کو پسند کرتا ہو، اُسے اقبال اکیڈمی کے بجائے بھٹو اکیڈمی کا ڈائریکٹر ہونا چاہیے اور اگر اس کا امکان نہیں تو اُسے بھٹو کے زیرِ تعمیر مزار کا متولی تو مقرر کیا ہی جا سکتا ہے۔

(۹ر جنوری ۱۹۹۷ء)

Marfat.com

ادیب اور راگ درباری

ڈاکٹر عالیہ امام جس پائے کی ادیبہ ہیں، اُسی پائے کی سیاست دان بھی ہیں۔ اِس کے باوجود ادیب اُنھیں ادیب نہیں مانتے اور سیاست دان اُنھیں سیاست دانوں میں شمار نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک یہ بڑی نا انصافی ہے۔ پاکستان میں ادب اور سیاست دونوں کی زبوں حالی کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحبہ بہت سے ادیبوں سے بہتر ادیب اور بہت سے سیاست دانوں سے بڑھ کر سیاست دان ہیں۔ اِس لیے اہلِ سیاست و ادب کو اِس حد تک کشادہ دلی اور وسیع النظری سے کام ضرور لینا چاہیے کہ ادیب ڈاکٹر صاحبہ کو سیاست دان تسلیم کرلیں اور سیاست دان اُنھیں ادیب مان لیں۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے ڈاکٹر صاحبہ ادب اور سیاست دونوں کی بے لوث خدمت گزار ہیں۔ یہی نہیں کہ اُنھوں نے ادب اور سیاست سے خود کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اپنی ذات سے اِن دونوں کو بھی کوئی فائدہ پہنچنے نہیں دیا۔ یہ بے لوثی کی انتہا ہے۔ ایسی بے لوث شخصیت کی قدر نہ کرنا ایک بہت بڑا قومی المیہ ہے۔ لیکن داد دیجیے ڈاکٹر صاحبہ کو کہ اُنھوں نے اِس المیے کو اُس وقت طربیے میں تبدیل کردیا جب اُن کی تازہ کتاب ''رفیقِ دل فگاراں'' کے جلسۂ رونمائی کی صدارت بیگم نصرت بھٹو نے کی۔ بیگم صاحبہ نے نہ صرف دل کھول کر ڈاکٹر صاحبہ کی تعریف کی، بلکہ اپنا پرس کھول کر دس ہزار روپے موصوفہ کی خدمت میں پیش کیے۔ ہماری ادبی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ کسی کتاب کی تقریبِ رونمائی اُس کے مصنف کے لیے سود مند رہی ہو۔ ورنہ پاکستان میں کتاب لکھنے سے کتاب پڑھنے تک ہر سودا، زیاں کا سودا ہوتا ہے۔

Marfat.com

یہ تقریبِ رونمائی اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب و غریب تھی۔ کتاب کا ذکر کسی مقرر نے نہیں کیا، زیادہ تر صدرِ جلسہ ہی کی تعریف میں تر زبانی کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر عالیہ امام نے جو ایک طویل مضمون پڑھا، وہ بھی بیگم نصرت بھٹو کی تعریف میں تھا۔ اِس مضمون کا آغاز اِن الفاظ سے ہوتا ہے: ''سروقد، متوازن اعضا، آتشیں رنگت، رومان و انقلاب میں ڈوبی ہوئی بے قرار آنکھیں، گہر بیز ہنسی، ہندی و عجمی تہذیب کا مرقع، خود اعتمادی و مضبوطی لیے ہوئے مترنم انداز، دل کی آنچ میں تپے ہوئے الفاظ، شوخ و خواب آلود لہجہ جو ہر دل میں آویزاں، حسن پرست و حسن آگاہ، مزاج میں راگ بھوپالی کی نغمگی''۔

اِس آغاز ہی سے مضمون کے انجام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پرانے زمانے میں جب شاعر امیروں، رئیسوں اور بادشاہوں کے قصیدے پڑھتے تھے تو اُن کے مُنھ موتیوں سے بھر دیے جاتے تھے۔ ڈاکٹر عالیہ امام کا مضمون قصیدہ نگاری کے فن کا نقطۂ عروج ہے۔ اِسے سن کر صرف دس ہزار روپے عنایت فرمانا، بخل کی انتہا ہے۔ اِس سے کہیں زیادہ قیمت تو اُس اقتباس کی ہے جو ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ اگر ڈاکٹر عالیہ امام کی جگہ ہم ہوتے تو یہ رقم واپس کر دیتے لیکن پھر اِس خیال سے یہ ارادہ ترک کر دیتے کہ اگر بیگم صاحبہ نے یہ رقم دوبارہ اپنے پرس میں رکھ لی تو جلسۂ تقریب رونمائی کے اخراجات کون ادا کرے گا۔

ڈاکٹر صاحبہ کی قصیدہ خوانی سے تقریب کے دوسرے مقرر بھی متاثر ہوئے اور ایک مقرر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ محمد حسین آزاد سے لے کر ابو الکلام آزاد تک انشا پردازی اور حسنِ بیان کی روایت کو اگر کسی نے برقرار رکھا ہے تو وہ ڈاکٹر عالیہ امام ہیں۔ معلوم نہیں جنابِ مقرر نے دونوں آزادوں کی روحوں کو شرمندہ کرنا ضروری کیوں سمجھا، حالاں کہ وہ ان دونوں کا نام لیے بغیر بھی اپنی ممدوحہ کو خوش اور اہلِ جلسہ کو شرمندہ کر سکتے تھے۔ افسوس کہ جنابِ مقرر نے انشا پردازی اور حسنِ بیان کی مثالیں نہیں دیں، اِس لیے مجبوراً ہمیں کتاب سے براہِ راست استفادہ کرنا پڑا۔

''رفیقِ دل فگاراں'' شخصیات سے متعلق مضامین کا مجموعہ ہے۔ شخصیات وہ ہیں جن سے مصنفہ کو ملاقات کا موقع ملا۔ یہ ملاقاتیں پانچ منٹ سے لے کر پندرہ برسوں تک کے دورانیے کی ہیں۔ مثلاً چو این لائی سے ملاقات پانچ منٹ کی تھی، اندرا گاندھی سے دس منٹ کی، مجروح سلطان پوری سے چند گھنٹوں کی، فیض صاحب سے دس برسوں کی اور جوش صاحب سے پندرہ برسوں کی۔ ڈاکٹر صاحبہ نے ان سب ملاقاتوں کی تفصیلات قلم بند کی ہیں اور جو کچھ لکھا ہے، وہ سب کچھ ملاقاتوں کے بغیر بھی لکھا جاسکتا تھا۔ مثلاً چو این لائی سے ملاقات کا حال لکھتے

Marfat.com

ہوئے چین کے انقلاب کی پوری تاریخ بیان کردی ہے نیز اپنا سفرنامۂ چین بھی شاملِ ملاقات کر دیا ہے۔ اندرا گاندھی سے ملاقات کی روداد سوال و جواب پر مشتمل ہے۔ اندرا کی مطبوعہ تقریروں کے اقتباسات کو اپنے سوالوں کے جواب کے طور پر درج کردیا ہے۔ راجہ محمود آباد سے متعلق مضمون میں راجہ صاحب خود تو دکھائی نہیں دیتے، اُن کا کلام بلاغت نظام ہر صفحے پر نظر آتا ہے۔ اِسی طرح جس شاعر پر لکھا ہے، اُس کے کلام کا خاصا حصہ یہ کہہ کر نقل کردیا ہے کہ یہ کلام خود شاعر نے مختلف ملاقاتوں میں اپنی زبان سے سنایا تھا۔ یہی نہیں، اگر کوئی ملاقاتی نثرنگار ہے تو اُس کی نثر کے اقتباسات اِس کثرت سے نقل کیے ہیں کہ مضمون نویسی نقل نویسی بن کر رہ گئی ہے۔ اِس نقل نویسی کی انتہا اُس وقت نظر آتی ہے جب ایک ڈراما نگار کا تذکرہ کرتے ہوئے اُس کا ایک پورا ڈراما نقل کردیا جاتا ہے۔ اگر اِس کتاب میں شاعروں کا کلام، خطیبوں کی تقریریں اور نثرنگاروں کے اقتباسات خارج کردیے جائیں تو کتاب کے تین چوتھائی صفحات خالی رہ جائیں گے اور یہی خالی صفحات بعض اہلِ نظر کے نزدیک کام کے صفحات ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحبہ نے دیباچے میں لکھا ہے کہ اِس کتاب میں اُن تاریخ ساز ہستیوں کا ذکر ہے جنھوں نے اُن کی ذہنی تربیت کی۔ یہ تاریخ ساز ہستیاں، کتاب ساز ہستیاں نظر آتی ہیں کیوں کہ اُنھیں کے فرمودات سے کتاب کی ضخامت میں اضافہ ہوا ہے۔ رہا ذہنی تربیت کا مسئلہ تو اِس میں ہمارا کچھ کہنا چھوٹا مُنھ بڑی بات کے مصداق ہوگا، اِس لیے ''واللہ اعلم بالصواب'' کہہ دینا کافی ہوگا۔

بلاشبہہ یہ کتاب ڈاکٹر صاحبہ کی انشا پردازی اور حسنِ بیان کا دل کش مرقع ہے۔ کتاب کے ہر اُس صفحے پر جس پر دوسروں کے اقتباسات نہیں ہیں، اس قسم کے جملے ملتے ہیں:

۱۔ وہ عقل و خرد، عرفان و آگہی کا ان گنت جھاڑ تھا۔ (ص ۳۲)

۲۔ ہر بات جو وہ کر رہے تھے راز معلوم ہو رہی تھی، راز جو کلی کی طرح خوب صورتی نکال رہی تھی۔ (ص ۱۶)

۳۔ اِنھیں دو الفاظوں میں بقائے انسانیت کا دار و مدار ہے۔ (ص ۱۸۱)

۴۔ اِن دھڑکنوں کو سُنیے جنھوں نے ابھی دھڑکنا شروع نہیں کیا۔ (ص ۱۹۵)

۵۔ ہر مرتبہ وہ... اونچے سے اونچا تر ہوتا گیا۔ (ص ۲۰۰)

۶۔ سردار کی شاعری نئی پیکر شیریں تراشنے کے لیے نیا تیشہ استعمال کرتی ہے۔ (۲۴۴)

اس قسم کے بے شمار جملے پیش کر کے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ محترمہ نے تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کے اصول تبدیل کر کے اردو کی ترقی کی راہ ہموار کردی ہے۔ یہی نہیں، بعض

Marfat.com

الفاظ و تراکیب سے اُنھوں نے اپنے خصوصی تعلّق کا اظہار بڑے خوب صورت طریقوں سے کیا ہے۔ مثلاً ''مایۂ ناز'' اُن کی پسندیدہ ترکیب ہے۔ یہ کتاب میں ۴۷ مرتبہ استعمال کی گئی ہے اور ہر مرتبہ نئے نازو انداز سے۔ ادیب اور شاعر تو ''مایۂ ناز'' تھے ہی، اُن کی بعض حرکتوں کو بھی اِسی کھاتے میں جمع کر دیا ہے۔

محترمہ کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے، اِس لیے بعض مذہبی نوعیت کے الفاظ کو بھی اُنھوں نے نئے معنی عطا کیے ہیں۔ ان کا پسندیدہ لفظ ''نبوّت'' ہے۔ اِس لفظ کے استعمال کی کچھ مثالیں یہ ہیں:

۱۔ ''تقی صاحب سائنسی سوچ کی دنیا میں نبوّت بخش مکھڑا ہیں''۔

۲۔ ''احتشام صاحب... تنقید کے لیے نبوّت بخش مکھڑا بن گئے''۔

۳۔ ''سرور صاحب کی طرح اُن کی تحریک کا مکھڑا بھی نبوّت بخش ہے''۔

''نبوّت بخش'' کا استعمال اِس کثرت سے کیا گیا ہے کہ یہ علی بخش، رحیم بخش، اور خدا بخش کی طرح کا نام معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ نے تلاوتِ قرآن، طوافِ کعبہ اور شبِ قدر جیسی ترکیبوں کو بھی بڑی چابک دستی سے استعمال کیا ہے۔ فرماتی ہیں:

۱۔ ''عقل کی بزرگی کے گیت گانا اُن کے نزدیک تلاوت قرآن تھا''۔ (جوش)

۲۔ ''شیخ ایاز کے کوچے میں قدم رکھنا طوافِ کعبہ اور اس کا دیدار نگاہوں کی عبادت ٹھہرا''۔

۳۔ '' میں ٹیڑھے ترچھے انداز میں غزلیں گاتی، اُنھیں سناتی... ہر شب شبِ قدر ہوتی''۔ (فیض)

آخری جملے میں ڈاکٹر صاحبہ نے اپنے شوقِ گلوکاری کا حوالہ دیا ہے۔ یہ حوالہ کتاب میں کئی جگہ ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِس راہ میں بھی رواں ہیں۔ مگر افسوس کہ اُن کے اِس کمال کی کسی نے قدر نہیں کی۔ یہاں تک کہ علی سردار جعفری نے ایک مرتبہ برسرِ محفل اُنھیں گانے سے روک دیا اور کہا کہ وہ تلفظ کی غلطیاں برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ واقعہ خود ڈاکٹر صاحبہ نے بیان کیا ہے جسے پڑھ کر ہمیں علی سردار جعفری کی سادگی پر ہنسی آئی۔ حیرت ہے کہ وہ اپنی شاعری میں معنوی اغلاط کو تو برداشت کر لیتے ہیں لیکن کسی کے گانے میں تلفظ کی غلطیاں برداشت نہیں کر سکتے۔

اس کتاب میں موسیقی کا اتنا تذکرہ ہے کہ ورق پلٹنے کی آواز بھی راگ درباری میں سنائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا ہے کہ فیض احمد فیض کو موسیقی سے بے پناہ شغف تھا اور وہ

Marfat.com

اکثر ڈاکٹر صاحبہ سے غزلیں گانے کی فرمائش کرتے تھے۔ فیض کے ذوق موسیقی کی داد ایک مرتبہ گلوکار استاد بڑے آغا نے بھی دی تھی۔ ایک محفل میں استاد نے گانا سنایا اور پھر فیضؔ سے پوچھا بتائیے ہم نے کیا سنایا، کون سا راگ تھا۔ فیض نے جو جواب دیا، اُسے سن کر استاد یہ کہتے ہوئے محفل سے اٹھ گئے: ''ہمیں ذلیل کرایا گیا ہے، جاہلوں کے درمیان لا کر بٹھایا گیا ہے''۔ ہماری رائے میں یہ واقعہ اگر درست بھی ہے تو اِسے کتاب میں شامل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جو شخص موسیقی کا ایسا پارکھ ہو کہ ڈاکٹر صاحبہ کی گائیکی کو پسند کرتا ہو، اُس کی رسوائی کا سامان بہم پہنچانا، خود اپنی گائیکی کے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ کو سراپا نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔ بیگم نصرت بھٹو کا سراپا اوپر نقل کیا جا چکا ہے، باقی ممدوحین کے سراپے بھی اِسی سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً ایک شخصیت کا تذکرہ وہ ان الفاظ میں کرتی ہیں: ''لانبا قد، چھریرا جسم، کشادہ پیشانی جس سے نہ بجھنے والی ضو پھوٹتی ہوئی۔ آنکھوں میں حسن کو پا لینے کی جستجو و تمنا گفتگو آبِ رواں، میٹھی، ٹھنڈی، نیلے پانیوں کی طرح صاف و شفاف گل رنگ مسکراہٹ، قرمزی قہقہہ، پوری ذات فیروزی، کاسنی، گلابی اور بادامی پھولوں سے لدی ہوئی، سرفراز شاخوں کے درمیان ہر آن جھکتی، لچکتی، ڈولتی، لہراتی ہوئی...''

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے فیروزی، کاسنی، گلابی اور بادامی پھولوں والی ساڑھی میں کوئی رقاصہ جھکتی، لچکتی ڈولتی اور لہراتی ہوئی اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ لیکن ہماری ساری خوش فہمی اُس وقت دور ہو جاتی ہے جب معلوم ہوتا ہے کہ یہ سراپا سید محمد تقی کا ہے۔ سید محمد مہدی اور احتشام حسین کے سراپے بھی اِسی نسوانی انداز کے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بعض لفظوں کی طرح بعض شخصیات کے سلسلے میں بھی ڈاکٹر صاحبہ نے تذکیر و تانیث کے قید اٹھا دی ہو؟

ڈاکٹر صاحبہ نے عشق و محبت کے معاملات سے بھی خاصی دلچسپی لی ہے۔ کتاب کے دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے: ''محبت دو قسم کی ہوتی ہے۔ آنکھ کی وساطت سے جو محبت ہوتی ہے، اسے عشق کہتے ہیں ... شعور کے ذریعے جو محبت ہوتی ہے اُس کا تعلق محبوب کی صفات اور اعترافِ کمال سے ہوتا ہے''۔ کتاب میں محبت کی صرف پہلی قسم کے حوالے سے مواد فراہم کیا گیا ہے۔ مثلاً وہ مجروح سلطان پوری سے پہلی ہی ملاقات میں پوچھتی ہیں: ''جناب نے کتنے عشق کیے ہیں''؟ مجروح صاحب پرانی تہذیب کے آدمی ہیں، یہ سوال سن کر پریشان ہو گئے۔ اِس آڑے وقت میں ایک دوست نے مدد کی اور ڈاکٹر صاحبہ کو بتایا کہ ایک زمانے میں فلم اسٹار نرگس نے مجروح صاحب کا گھر دیکھ لیا تھا اور اکثر اُن کے ہاں آنے لگی تھی۔ مجروح صاحب

Marfat.com

نے نرگس کی والدہ جدن بائی سے کہا کہ اپنی لڑکی کو سمجھاؤ۔ یہ واقعہ سن کر ڈاکٹر صاحبہ کو حیرت ہوئی کہ فلموں میں عشقیہ گانے لکھنے والا عشق کے اسرار و رموز سے ناواقف ہے۔

کیفی اعظمی سے ڈاکٹر عالیہ امام نے پوچھا کہ آپ کو لڑکیاں کیسی لگتی ہیں؟ کیفی صاحب تو جیسے اِس سوال کے منتظر بیٹھے تھے، نثر میں مثنوی زہر عشق سنانے لگے جس کا خاتمہ اس جملے پر ہوا: ''لڑکیاں زندہ مچھلی کی طرح ہوتی ہیں جو ہاتھ میں آتے ہی پھسل جاتی ہیں''۔ ہم نے تو سنا تھا کہ کیفی اعظمی شاعری میں پھسلتے ہیں، اب معلوم ہوا کہ روزمرہ گفتگو میں بھی اُن کا یہی عالم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عالیہ امام نے جوش صاحب سے بھی بے تکلفی سے باتیں کی ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کی فرمایش پر انھوں نے اپنے اور موجودہ زمانے کے عشق کا فرق اِن الفاظ میں بیان کیا ہے: ''کیا بتائیں صاحب، ہم نے عشق کیے، ہمہ وقت محبوب کی خاطر داریاں کیں۔ یہاں ہمارے نواسے عاشق ہوئے ہیں۔ لیجیے یہ دیکھیے معشوقہ کو پیٹ رہے ہیں۔ ہائے ہائے۔ عاشق کے ہاتھوں معشوقہ کو پٹتے ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا ہے''۔

مختصر یہ کہ اِس کتاب میں عشق و عاشقی کے پیچیدہ مسائل ایسی عمدگی سے حل کیے گئے ہیں کہ تازہ واردانِ بساط ہوائے عشق کے لیے یہ ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ اِس مناسبت سے اگر کتاب کا نام ''رفیق دل فگاراں'' کی بجائے ''رہبر دل فگاراں'' ہوتا تو اچھا تھا۔

ڈاکٹر صاحبہ شاعرہ نہیں ہیں لیکن بلا کی سخن فہم ہیں۔ نثر کو شعروں سے مزیّن کرنے کا فن کوئی اُن سے سیکھے۔ جب وہ کسی شعر کو استعمال کرتی ہیں تو وہ پہلے سے زیادہ بامعنی نظر آتا ہے۔ مثلاً راجہ صاحب محمود آباد کی صفات بیان کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ یگانہ نے یہ شعر راجہ صاحب ہی کے لیے کہا تھا:

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے

اب نہ یگانہ رہے نہ راجہ صاحب محمود آباد، ڈاکٹر صاحبہ کو حق حاصل ہے کہ ایک کے شعر سے اور دوسرے کے کردار سے جو سلوک چاہیں کریں۔

(۱۳/ اکتوبر ۱۹۹۴ء)

Marfat.com

اَدبی مجاور

اردو کے صاحب طرز نثر نگار رشید احمد صدیقی نجی خطوط کی اشاعت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اُن کے سوانح نگار ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے جب اُن کے خطوط جمع کرنے کا ارادہ کیا اور اِس سلسلے میں ہفت روزہ ''ہماری زبان'' (علی گڑھ) میں ایک اعلان شائع کرایا تو اُسی ہفت روزے میں رشید صاحب نے ایک خط چھپوایا جس میں اُنھوں نے لکھا: ''بزرگوں، دوستوں اورعزیزوں کے نام میں نے جو نجی خطوط لکھے، اُن کا شائع کیا جانا مجھے کسی حال میں گوارا نہیں۔ اِس کو میں امانت میں خیانت سمجھتا ہوں ... اپنے بچوں تک کو ہدایت کردی ہے کہ وہ میرے خطوط شائع نہ کریں۔ میری اِس خواہش یا درخواست کو کوئی نا قابلِ التفات سمجھے تو میں کیا کوئی بھی اُس کا کچھ نہیں کر سکتا۔ البتہ مجھے اِس سے بڑی تکلیف ہوگی اور رہے گی کہ متعلقہ اصحاب نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا''۔

رشید صاحب نے اپنی بیٹی سلمیٰ صدیقی کو لکھا: ''پڑھنے کے بعد میرے خطوط تلف کردیا کرو، اِس پر مجھے برابر اصرار ہے اور میں چاہتا ہوں کہ کوئی اور نہیں تو میری اولاد اِس پر عمل کرے''۔ لیکن اِس ہدایت پر کسی اور نے تو کیا، اُن کی اولاد نے بھی عمل نہ کیا۔ سلمیٰ صدیقی، اقبال رشید صدیقی اور ڈاکٹر احسان رشید صدیقی کے نام کے خطوط شائع ہو چکے ہیں۔

رشید صاحب کے خطوں کے اب تک پانچ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ سب سے پہلے ۱۹۷۸ء میں پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنے نام کے خطوط ''مکاتیب رشید احمد صدیقی'' کے نام سے شائع کیے۔ دوسرا مجموعہ ''مکاتیب رشید'' ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے مرتب کیا تھا۔ اِس میں مختلف لوگوں کے نام کے خطوط جمع کیے گئے ہیں۔ اِس کی پہلی جلد ۱۹۸۰ء میں شائع

Marfat.com

ہوئی تھی، دوسری کا تاحال انتظار ہے۔ ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے نام کے خطوط ''رقعات رشید صدیقی'' کے نام سے شائع کیے۔ چوتھا مجموعہ ''حنائے علی گڑھ'' ہے جس میں میسور کے پروفیسر محمد عبدالقادر کے نام کے خط ہیں۔ پانچواں مجموعہ ''خطوط رشید احمد صدیقی'' مرتبہ لطیف الزماں خان ہے جو ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔

اِن پانچوں مجموعوں میں رشید صاحب کے ایسے خطوط بڑی تعداد میں شامل ہیں جنھیں اردو کے مکاتیبی ادب میں گراں قدر اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر رشید صاحب کی ہدایت یا وصیّت کے مطابق اِن خطوں کو تلف کردیا جاتا تو اردو ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا۔

مولوی عبدالحق نے ''خطوطِ شبلی بنام عطیہ بیگم'' کے دیباچے میں لکھا تھا کہ شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہوگئی ہے مگر اُن کے خطوط سدا بہار ہیں۔ یہ بات شبلی کے بارے میں درست ہو نہ ہو، رشید صاحب کے حوالے سے کسی حد تک درست ہے۔ اُن کی تصانیف سے محظوظ ہونے کے لیے ایک خاص ذہنی سطح اور ایک مخصوص ادبی مزاج کی ضرورت ہے لیکن اُن کے خطوں میں ہر سطح اور ہر مزاج کے لوگوں کی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔

رشید صاحب خطوں کا جواب دینے میں بڑے مستعد تھے۔ ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ وہ ہر روز چار پانچ خط ضرور لکھتے تھے۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو مولوی عبدالحق کے بعد وہ دوسرے ''بسیار نویس'' مکتوب نگار ہیں۔ رشید صاحب کے جتنے خط شائع ہوئے ہیں، اس سے کہیں زیادہ تعداد میں وہ خطوط ہیں جو ابھی شائع نہیں ہوئے اور لوگوں کے پاس محفوظ ہیں۔ جب تمام خطوط چھپ جائیں گے تو پھر یقین ہے کہ غالب کے بعد رشید صاحب ہی اردو کے سب سے بڑے مکتوب نگار قرار پائیں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا رشید صاحب جیسے صاحب نظر کو اندازہ نہیں تھا کہ اُن کی مکتوب نگاری کا درجہ کتنا بلند ہے۔ آخر انھوں نے اپنے خطوط تلف کر دینے کی ہدایت کیوں کی؟ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ اُنھیں یہ احساس تھا کہ اُن کی بعض ایسی تحریریں جن کی کوئی علمی و ادبی اہمیت نہیں ہے، اُنھیں بھی خطوط کے نام پر جمع کر کے شائع کر دیا جائے گا اور اُن تحریروں سے مرحوم کی نیک نامی میں قطعاً کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ اس خیال کی تصدیق ''خطوط رشید احمد صدیقی'' کی جلد دوم سے ہوتی ہے جو پچھلے مہینے شائع ہوئی ہے۔ اس میں رشید صاحب کی ۱۴۹ ''چٹیں'' ہیں جنھیں خطوط کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کی شانِ نزول یہ ہے کہ رشید صاحب کے شاگرد خلیل الرحمن اعظمی مرحوم، اُن کے گھر کے قریب ہی رہتے تھے۔ رشید صاحب کو جب کسی کتاب کی ضرورت ہوتی یا کسی شخص کا ڈاک کا پتا معلوم کرنا ہوتا یا اسی قسم کا

Marfat.com

کوئی اور کام ہوتا تو وہ اعظمی صاحب کو ایک آدھ سطر میں یا چند سطروں میں مطلب کی بات لکھ کر ملازم کے ہاتھ بھیج دیتے۔ انھیں پرزوں یا چٹوں کو لطیف الزماں خان اور مہر الٰہی ندیم نے مرتّب کیا ہے۔ سارا کام اول الذکر ہی نے انجام دیا ہے، خطوط بھی اُنھوں نے حاصل کیے، حواشی بھی لکھے اور دیباچہ بھی تحریر کیا۔ معلوم نہیں کس وجہ سے ثانی الذکر کو کتاب کی ترتیب کی ذمہ داری میں شریک کیا گیا ہے۔ ہم اگلی سطور میں جو کچھ لکھیں گے، وہ اول الذکر کے حوالے سے ہوگا۔

اِس مجموعے میں جس قسم کے خطوط ہیں، اُن کے نمونے کے طور پر ذیل میں چار خط پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ خلیل صاحب۔ کل پانچ بجے شام تک میرا آدمی مارا مارا پھرا اور آپ نہ ملے۔

۲۔ خلیل صاحب مکرم۔ تسلیم۔ اختر الایمان کا پتا معلوم ہو تو مطلع فرمایئے۔ آپ کا رشید احمد صدیقی۔

۳۔ ایک ذرا دیر کے لیے مجھ سے مل جایئے۔ رشید احمد صدیقی۔

۴۔ خلیل صاحب۔ اِس میں شرکت کیجیے گا۔ رشید احمد صدیقی۔

یہ چار سطریں نہیں چار مکمل ''خط'' ہیں۔ مجموعے میں خاصی بڑی تعداد اسی قسم کے یک سطری ''خطوط'' کی ہے، اور جو کچھ زیادہ سطروں پر مشتمل ہیں، اُن میں بھی اِسی قسم کی باتیں ہیں۔ ۱۴۹ ''خطوط'' میں ایک بھی تو ایسا نہیں ہے جسے رشید صاحب کے خوب صورت اسلوب کا نمونہ کہا جاسکے یا جس میں کوئی کام کی بات ہو۔ اِن تحریروں کو اگر رشید صاحب کے خطوط کے کسی بڑے مجموعے کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا جاتا تو ٹھیک تھا، لیکن الگ سے کتابی صورت میں شائع کرنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، سوائے اِس کے کہ جناب مرتّب کے کارناموں میں ایک اور کا اضافہ ہوگیا۔

اوپر نمونے کے جو خط نقل کیے گئے ہیں، ان میں سے آخری خط کا یہ پنج لفظی جملہ ''اِس میں شرکت کیجیے گا'' اُس وقت تک بالکل بے معنی ہے جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ کسی تقریب میں شرکت کی دعوت دی جارہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رشید صاحب نے اعظمی صاحب کو کوئی دعوت نامہ بھیجا ہوگا اور اُس کے لفافے پر مذکورہ جملہ لکھ دیا ہوگا۔ دعوت نامہ گم ہوگیا ہوگا، لفافہ باقی رہ گیا جو مرتّب کے ہاتھوں میں آکر ''خط'' کی صورت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگیا۔ جنابِ مرتّب اِس پنج لفظی جملے پر کوئی سہ لفظی حاشیہ ہی لکھ دیتے تو بات بن جاتی۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ پوری کتاب میں مرتّب کا طریق کار یہی رہا ہے۔ ایسا نہیں

Marfat.com

ہے۔ اُنھوں نے جا بجا حواشی بھی لکھے ہیں لیکن اہتمام یہ کیا ہے جہاں حاشیوں کی ضرورت تھی، وہاں کچھ نہیں لکھا، جہاں ضرورت نہیں تھی، وہاں مضامینِ نو کے انبار لگا دیے ہیں۔ مثلاً اِس قسم کی معلومات اُنھوں نے فراوانی سے فراہم کی ہیں۔ بشیر بدر کا اصلی نام محمد بشیر ہے۔ مجروح سلطان پوری تخلص اختیار کرنے سے پہلے اسرار حسن خاں تھے۔ احمد جمال پاشا پیدا ہوئے تو اُن کا نام آغا محمد نزہت پاشا رکھا گیا تھا۔ خطوطِ رشید کے قارئین کو اِس قسم کی نادر معلومات فراہم کرنا ایسا ہی ہے جیسے دیوان غالب کے حاشیے میں ریل گاڑیوں کی آمد و رفت کے اوقات درج کر دیے جائیں۔

حاشیوں میں ''احمد کی پگڑی محمود کے سر'' کی مثالیں بھی خاصی نظر آتی ہیں۔ مثلاً خط نمبر ۲۱، ۲۲ و ۲۴ میں مغنی صاحب کا ذکر ہے جو حیدرآباد سے آئے تھے۔ مرتّب نے ''مغنی صاحب'' پر جو حاشیہ لکھا ہے، اُس میں پٹنے کے مشہور نقاد ڈاکٹر عبدالمغنی کے حالات درج کر دیے ہیں جن کا حیدرآباد سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ رشید صاحب دراصل حیدرآباد دکن کے نقاد اور شاعر ڈاکٹر مغنی تبسم کا ذکر کر رہے تھے جن سے جنابِ مرتّب بظاہر ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔

اِسی طرح کا ایک دلچسپ حاشیہ ڈاکٹر سید محمود کے بارے میں ملتا ہے۔ ۲۸/ جون ۱۹۶۱ء کے رقعے میں رشید صاحب لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر سید محمود صاحب ایم پی کی صاحب زادی قدسیہ (امتحان میں) شریک ہوئی تھیں۔ موصوف کا خط آیا ہے کہ نتیجہ معلوم ہو گیا ہو تو مطلع کروں''۔ اُنھیں ڈاکٹر سید محمود اور ان کی صاحب زادی کا ذکر ایک اور خط میں بھی ملتا ہے۔ وہاں مرتّب نے حاشیے میں بتایا ہے کہ سید محمود کا سالِ پیدایش ۱۸۵۰ء اور سالِ وفات ۱۹۰۳ء ہے۔ فاضل مرتّب نے یہ بھی دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی جو شخص ۱۹۰۳ء میں وفات پا چکا ہے وہ ۱۹۶۱ء میں رشید صاحب کو خط لکھ کر اپنی بیٹی کے امتحان کا نتیجہ کس طرح معلوم کر سکتا ہے؟ جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ خط عالمِ بالا سے آیا تھا، اُس وقت تک یہی سمجھنا چاہیے کہ جنابِ مرتّب بہار کے مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود اور سرسید کے بیٹے سید محمود کے ناموں کی مماثلت سے دھوکا کھا گئے۔ جو سنینِ پیدایش و وفات اُنھوں نے لکھے ہیں، وہ سرسید کے بیٹے کے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمود کا انتقال ۱۹۷۱ء میں ہوا تھا۔

اسی طرح ایک دلچسپ حاشیہ خلیل الرحمٰن اعظمی کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' پر لکھا ہے۔ اِس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے بارے میں فرماتے ہیں: ''معلوم نہ ہو سکا کہ کب اور کس نے شائع کیا''۔ حاشیہ تو اُس وقت لکھا جاتا ہے جب قاری کو کچھ بتانا مقصود ہو۔ جب کچھ بتانا ہی نہ ہو تو حاشیہ لکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ ویسے اعظمی مرحوم کی مذکورہ کتاب کا پہلا ایڈیشن کوئی

Marfat.com

نایاب چیز نہیں ہے۔ یہ ایڈیشن انجمن ترقی اردو ہند جیسے بڑے اور مشہور ادارے نے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا تھا۔ اِس کے نسخے کراچی اور لاہور کے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں۔

فاضل مرتّب نے بعض خطوں کا صحیح متن بھی پیش نہیں کیا۔ مثلاً اعظمی صاحب نے اپنی ایک کتاب پر رشید صاحب سے تعارف لکھوایا۔ اِس تعارف کے ساتھ رشید صاحب نے ایک رقعہ بھی لکھا جس میں وہ فرماتے ہیں: ''آپ کو اصرار تھا جلد سے جلد لکھ دیا جائے، اِس لیے رواروی میں جو بن پڑا لکھ دیا۔ اب اطمینان ہے کہیے تو کچھ اور بھیج دوں لیکن شرط یہی ہے کہ آپ مجھے بتا دیں کہ ان lines پر اِس طرح کی باتیں ہوئیں''۔ اس اقتباس کا دوسرا جملہ کچھ اس قسم کا ہے کہ رشید صاحب جیسے صاحب طرز ادیب سے ایسی خراب اور مہمل تحریر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ لازماً جنابِ مرتّب کا کمال ہے۔ خدا جانے اصل میں کیا لکھا ہوگا جسے انھوں نے اِس مضحکہ خیز صورت میں نقل کردیا۔

کتاب کے دیباچے اور ایک حاشیے میں مرتّب نے پروفیسر آل احمد سرور کا ذکر نہایت ناشایستہ انداز میں کیا ہے۔ سرور صاحب کے نام رشید صاحب کے جو خطوط ہیں، اُن کا ذکر کرتے ہوئے جناب مرتّب لکھتے ہیں: ''سرُور صاحب اِن کے عکس چھپوا دیں ورنہ اس کا قوی امکان ہے کہ وہ تحریف کریں گے''۔ ایک حاشیے میں لکھتے ہیں: ''سرور صاحب جتنی چاہیں لفاظی کریں، اُن کا علم سے معنی ومفہوم سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ سیاسی حیوان ہیں''۔ اردو کے ایک بڑے اور بزرگ ادیب کے بارے میں ایک غیر ادیب کا یہ اندازِ بیان انتہائی افسوس ناک ہے۔ اِس سے پہلے بھی جناب مرتّب ''خطبات رشید'' کے دیباچے میں سرور صاحب اور دوسرے کئی محترم ادیبوں کے بارے میں اِسی قسم کی ناشایستہ باتیں لکھ چکے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رشید احمد صدیقی کے خطبات یا خطوط کے دیباچوں میں قابل احترام بزرگوں اور ادیبوں کو برا بھلا کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ تسلیم کہ موصوف کو رشید صاحب سے بے پناہ عقیدت ہے لیکن ایسی عقیدت اور ادبی مجاوری کس کام کی جس کی بنیاد دوسروں کی برائی پر ہو۔ عقیدت کے اظہار کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ رشید صاحب کی تحریروں کو خالص علمی انداز سے مرتّب کیا جائے اور اگر کسی میں اِس کی صلاحیت نہ ہو تو پھر اُسے یہ چاہیے کہ یہ کام اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دے جو اِسے بہتر طور پر انجام دے سکیں۔

آخر میں خطوطِ رشید احمد صدیقی، جلد اول میں شامل مجروح سلطان پوری کے نام کے خط کا ایک دلچسپ اقتباس پیش کیا جاتا ہے جسے اُن لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے جو آیندہ

Marfat.com

رشید صاحب کے خطوط مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں: ''پرائیویٹ خطوط کو حاصل کرنے اور اُن کی اشاعت کی جو مہم شروع کی گئی ہے، اُسے میں اچھا نہیں سمجھتا، اُن لوگوں کو بھی جو ایسا کرتے ہیں۔ جن اشخاص کو کبھی اچھے اور بڑے کام کی توفیق نہیں ہوتی یا اِس کے اہل نہیں ہوتے، وہ اِس طرح کی دوسرے اور تیسرے درجے کی سرگرمیوں میں جا پڑتے ہیں''۔

(۱۹ر جنوری ۱۹۹۵ء)

Marfat.com

جوش ناشناسی

جوش ملیح آبادی کی وفات کے بعد گزشتہ بارہ تیرہ برسوں میں اُن کے بارے میں بے شمار مقالات اور رسالوں کے خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اِس سارے انبار میں اُن کی شاعری کے متعلق کوئی فکر انگیز تحریر نظر نہیں آتی۔ بیسیوں نقادوں نے اُن کی شاعری پر طبع آزمائی کر کے صرف اِن دو باتوں کو دُہرایا ہے کہ وہ شاعرِ انقلاب تھے اور بڑے قادر الکلام تھے۔ حالاں کہ اِن خصوصیات کے جاننے کے لیے کسی نقاد کی رہ نمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خصوصیات ہر اُس شخص پر خود بخود ظاہر ہو جاتی ہیں جو جوش کے کسی بھی مجموعۂ کلام کے چار صفحے پڑھنے کی توفیق رکھتا ہو۔ اگر ہمارے نقادوں کی جوش شناسی یہی ہے تو جوش ناشناسی کسے کہا جائے گا؟

جوش کی شاعری کے برعکس اُن کی شخصیت کے بارے میں لکھنے والوں نے زیادہ بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے اور مضامینِ نو کے ایسے ایسے انبار لگا دیے ہیں کہ اگر جوش زندہ ہوتے تو اُنھیں اپنی خودنوشت ''یادوں کی برات'' پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی جس کے نتیجے میں اِس کتاب میں بیان کردہ بہت سے وقوع پذیر نہ ہونے والے واقعات خارج ہو جاتے اور بہت سے ایسے واقعات شامل کیے جاتے جنھیں کتاب لکھتے وقت مصنف نے نظر انداز کر دیا تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے جوش کی شخصیت کا حسن نکھر کر سامنے آرہا ہے اور ہم جیسے طالب علموں کے لیے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ جوش کی شاعری بڑی تھی یا اُن کی شخصیت۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جوش کی شخصیت ایک ہشت پہلو ہیرے کی طرح ہے، جس رخ

Marfat.com

سے بھی دیکھیے ایک نیا عالم نظر آتا ہے۔ اِس کا کچھ اندازہ رسالہ ''آج کل'' دہلی کے اُس خصوصی شمارے سے بھی ہوتا ہے جو جوش صاحب کی یاد میں ابھی پچھلے دنوں شائع ہوا ہے۔

اِس رسالے کا پہلا مضمون پروفیسر آل احمد سرور کا ہے۔ اِس میں اُنھوں نے اپنی یادوں اور اپنے نام جوش کے خطوں کی روشنی میں جوش کی شخصیت کو پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے کئی دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں جن سے جوش کی بے مثال ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فقرہ چست کرنے میں جوش صاحب کا جواب نہ تھا۔ سرور صاحب نے بیان کیا ہے کہ ایک مشاعرے کے بعد جگر مراد آبادی ایک گوشے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ یہ وہی جگر تھے جو کسی زمانے میں رندِ بلانوش تھے۔ جوش نے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''دیکھو شیر گھاس کھا رہا ہے''۔

فقرے بازی کا ایک ایسا ہی واقعہ ہم نے بھی سنا ہے۔ جن دنوں جوش صاحب رسالہ ''کلیم'' شائع کرتے تھے، ایک شاعر نے اپنا کلام رسالے میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ نہایت بے مزہ اور اغلاط سے پُر کلام تھا۔ جوش صاحب نے اُس کی اشاعت سے معذرت کرلی۔ شاعر کو اِس میں اپنی سبکی محسوس ہوئی اور اُس نے جوش صاحب سے انتقام لینے کے لیے ایک رسالہ اپنے بیٹے کے نام سے شائع کیا جس میں اپنی تعریف میں اور جوش صاحب کی مذمّت میں بہت کچھ لکھا۔ شاعر کے صاحب زادے یہ رسالہ لے کر اچھلتے کودتے جوش صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑے فخر سے ''اپنا'' کارنامہ پیش کیا۔ جوش صاحب نے چند منٹ رسالے کی ورق گردانی کی، پھر صاحب زادے کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور کہا: ''میاں صاحب زادے، آپ سے تو میں کچھ نہیں کہوں گا البتہ اپنے والد صاحب کو میرا یہ پیغام پہنچا دیجیے کہ شاعری کی طرح اولاد کے معاملے میں بھی آپ کا تخلیقی معیار اطمینان بخش نہیں ہے''۔

''یادوں کی برات'' میں جوش صاحب نے لکھا ہے کہ جب اُنھوں نے ہندوستان سے پاکستان منتقل ہونے کے سلسلے میں مولانا ابو الکلام آزاد سے مشورہ کیا تو اُنھوں نے تمام حالات سن کر اور معاملے کے ہر پہلو کو سمجھنے کے بعد کہا: ''آپ کا ہجرت کر جانا ہرچند ہمارے واسطے پشیمانی و سرگرانی کا باعث ہوگا لیکن جہاں تک آپ کے خانوادے کے مستقبل کا سوال ہے، میری رائے ہے کہ آپ ہجرت کر جائیں ... نہرو کے بعد آپ کا یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں رہے گا، آپ تو آپ خود مجھے کوئی نہیں پوچھے گا''۔

پروفیسر آل احمد سرور نے مولانا آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری کرشنا کیلانی کے حوالے سے بالکل مختلف واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''مولانا آزاد نے جوش سے صاف بات کی

Marfat.com

اور کہا جب آپ وہاں سارے معاملات طے کر کے آگئے ہیں تو پھر ہم لوگوں سے رائے کیوں لیتے ہیں۔ آپ کا وہاں جانا ہی بہتر ہے''۔

سرور صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ''جوش اُن ہم عصروں کی تعریف میں بخل سے کام لیتے تھے جو عمر میں اُن سے چھوٹے تھے اور اُن کے بعد اُن کی شہرت ہوئی''۔ اِس سلسلے میں سرور صاحب نے دو واقعات بیان کیے ہیں۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ جن دنوں فیض راولپنڈی سازش کے سلسلے میں حیدرآباد سندھ میں اسیر زنداں تھے، اُن کے چند شعر سجاد ظہیر کے ایک خط کے ذریعے عام ہوئے۔ سرور صاحب نے یہ شعر جوش کو سنائے تو اُنھوں نے داد نہ دی اور ہوں ہاں کر کے بات ٹال دی۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک مشاعرے میں شکیل بدایونی اور ساغر نظامی کو اُن کے کلام پر بہت داد دی گئی تو جوش کا مزاج بگڑ گیا اور اُنھوں نے سرور صاحب سے کہا: ''یہ آپ مجھے کہاں لے آئے۔ یہ کیا بدمذاقی ہے''۔ اِس کے بعد جوش ایسے بدمزہ ہوئے کہ کلام سنانے سے انکار کر دیا۔

فیض، شکیل اور ساغر تو جوش سے عمر میں چھوٹے تھے، عمر میں بڑے شاعروں کے ساتھ بھی جوش کا سلوک کچھ مختلف نہ تھا۔ اِس ضمن میں علامہ اقبال کا نام لینا کافی ہوگا جن کے سفارشی خط پر جوش کو حیدرآباد دکن میں ملازمت ملی تھی۔ جگن ناتھ آزاد ''آج کل'' میں شامل اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: ''اقبال کا تعریفی انداز میں ذکر جوش صاحب کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ خدا جانے اقبال کے تعلق سے کون سا احساسِ کمتری اُن کے اندر کام کر رہا تھا کہ اقبال کی بات ہوتی تھی تو ان کی کیفیتِ انقباض اُن کے چہرے سے ظاہر ہو جاتی تھی۔ اگرچہ اقبال کے بعد اہلِ ملک نے عزت اور محبت کے خزانے اُنھیں پر نچھاور کر دیے تھے لیکن وہ اِس قدردانی سے مطمئن نہیں تھے۔ اُن کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ وہ اقبال سے بڑے شاعر ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اقبال کو بڑا شاعر ہی تسلیم نہیں کرتے تھے... اقبال کے اکثر اشعار پر وہ اعتراض کیا کرتے تھے اور اعتراض بھی طعن و تشنیع کے انداز میں''۔

جگن ناتھ آزاد نے یہ دلچسپ اطلاع بھی دی ہے کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب ''روحِ اقبال'' جوش نے اُن سے مستعار لے کر پڑھی تھی، یہ کتاب جب واپس ملی تو اُس پر جوش نے جا بجا اختلافی حواشی لکھ رکھے تھے۔ آزاد سے یہ نسخہ ''نقوش'' کے ایڈیٹر محمد طفیل مرحوم نے لے لیا تھا۔ خدا کرے کہ یہ نسخہ محفوظ ہو اور کیا ہی اچھا ہو کہ ''نقوش'' کے موجودہ مدیر اور محمد طفیل مرحوم کے صاحب زادے جاوید طفیل جوش کے حواشی کو اپنے رسالے میں شائع کر دیں تاکہ جوش کی ''اقبال شناسی'' کا دستاویزی ثبوت محفوظ ہو جائے۔

Marfat.com

''آج کل'' میں ڈاکٹر سید داؤد اشرف کا ایک تحقیقی مقالہ ''جوش اور سابق ریاست حیدرآباد'' بھی شامل ہے جس میں جوش کی زندگی کے ایک اہم دور کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ سابق ریاست حیدرآباد دکن سے جوش کے اخراج کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ خود جوش نے ''یادوں کی برات'' میں جو کچھ لکھا ہے، اُس میں اپنے آپ کو ایک ایسے صاحب کردار کی حیثیت سے پیش کیا ہے جو بڑے سے بڑے جابر حکمراں کے سامنے سرنہیں جھکاتا۔ اُنھوں نے بیان کیا ہے کہ اُن کی ایک باغیانہ نظم نظام دکن تک پہنچی اور وہ اُن سے ناراض ہوگئے۔ نائب کوتوال آغا جانی نے جوش سے کہا کہ اگر وہ نظام سے معافی مانگ لیں تو نظام اُن کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کریں گے۔ مگر جوش نے معافی مانگنے سے انکار کردیا اور اِس کے نتیجے میں اُنھیں ریاست سے خارج کردیا گیا۔ سید داؤد اشرف نے حیدرآباد میں محفوظ سرکاری کاغذات کے حوالے سے لکھا ہے کہ جوش کا یہ کہنا کہ وہ معافی مانگنے پر تیار نہ ہوئے، ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے کیوں کہ جوش کا ایک معافی نامہ آج بھی آندھرا پردیش آرکائیوز میں محفوظ ہے۔ سید داؤد اشرف نے جوش کے معافی نامے کے یہ الفاظ اپنے مضمون میں نقل کیے ہیں: ''فدوی ایک شریف خاندان کا رکن ہے اور شریف اپنے محسنوں پر جاں نثار کردیا کرتے ہیں۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ فدوی اپنے اتنے بڑے عظیم المرتبت محسن اعظم کی شان میں سوءِ ادب کا تصور بھی اپنے ذہن میں لاتا جو محسن ہونے کے علاوہ اُس کی قوم کا واحد تاج دار بھی ہے''۔

معافی نامے کے اِن الفاظ سے اور کچھ ثابت ہو نہ ہو یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ شاعرِ انقلاب تاجِ برطانیہ کے نہ سہی، تاجِ حیدرآباد کے اِس حد تک وفادار تھے کہ اُس کی خاطر جان کی بازی لگانے کے لیے بھی تیار تھے۔

اِس معافی نامے کے جواب میں نظام نے جو فرمان جاری کیا وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے: ''اُس (جوش) نے اپنی دیدہ و دانستہ غلطی کو جو ایک عذرِلنگ کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ ہرگز اِس قابل نہیں ہے کہ اُس سے درگزر کیا جائے تاہم اِس شرط کے ساتھ معافی دیتا ہوں کہ آیندہ اگر اُس سے پھر ایسی غلطی سرزد ہوئی تو ۲۴ گھنٹے کے اندر اُس کو خدمت سے علیحدہ کردیا جائے گا۔ کیوں کہ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اُس کی پرائیویٹ لائف ہرگز اطمینان کے قابل نہیں ہے اور ایسے کیریکٹر کے اشخاص کو سرکاری محکمے میں جگہ دینا گویا محکمے کی تذلیل ہے''۔

''آج کل'' میں ایک مضمون ڈاکٹر محمد حسن کا بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ عادت ہے کہ وہ جب بھی اپنے کسی مضمون میں پاکستان کے بارے میں کچھ لکھتے ہیں تو آرائشِ بیان کے لیے کچھ نہ کچھ اپنی طرف سے بھی بڑھا دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ''اسلام آباد گیا تو

Marfat.com

ہندوستان کے ہائی کمشنر نٹور سنگھ جی سے پوچھا کہ جوش صاحب سے ملنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ میں چوں کہ انجمن اساتذۂ ہند کے وفد کے رہ نما کی حیثیت سے گیا تھا لہٰذا نٹور سنگھ نے اِس کے خلاف رائے دی۔ کہنے لگے: آپ تو مل آئیں گے مگر ضیاء الحق کی حکومت جوش صاحب کو تنگ کرے گی۔ میں نے پوچھا کیسے؟ کہنے لگے: ممکن ہے کچھ دنوں کے لیے نل یا بجلی کاٹ دے۔ میں نے سینے پر پتھر رکھا اور جوش صاحب سے ملے بغیر چلا آیا''۔

پاکستان میں بھی بعض لوگ اِس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ضیاء الحق کی حکومت نے جوش صاحب کو تنگ کیا حالاں کہ معاملہ اِس کے برعکس تھا۔ ضیاء الحق کے دور میں جوش صاحب کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ ایک دن کے لیے بھی اُن کی تنخواہ نہیں روکی گئی۔ مکان اور ٹیلی فون وغیرہ کی سہولتیں بھی اُنھیں بدستور حاصل رہیں۔ یہی نہیں، ضیاء الحق کے وزیر میر غلام علی تالپور باقاعدگی سے جوش صاحب سے اُن کی قیام گاہ پر جا کر ملتے رہتے تھے لیکن کبھی ضیاء الحق نے اُنھیں منع نہیں کیا۔ ڈاکٹر محمد حسن کون سے ایسے سبز قدم تھے کہ جوش صاحب سے ملنے چلے جاتے تو اُن کا نل یا بجلی کاٹ دی جاتی۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے کنور مہندر سنگھ بیدی اور دہلی کے سابق چیف کمشنر شنکر پرشاد کے نام جوش صاحب کے دو درجن کے قریب غیر مطبوعہ خطوط مرتب کر کے ''آج کل'' میں چھپوائے ہیں۔ یہ خطوط دلچسپ بھی ہیں اور جوش کے شگفتہ اندازِ تحریر کا عمدہ نمونہ بھی۔ اِن خطوں میں جوش کے ہندوستان میں قیام کے آخری زمانے کے متعلق نہایت اہم معلومات ملتی ہیں۔ ''یادوں کی برات'' میں جوش نے ایک جگہ لکھا ہے: ''ہندوستان میں میرے واسطے کس چیز کی کمی تھی کہ میں اِس کمی کو پورا کرنے یہاں آتا''۔ لیکن اِن خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مالی لحاظ سے اور اِس کے نتیجے میں ذہنی طور پر اِس حد تک پریشان تھے کہ زندگی اُن کے لیے ایک بارِگراں بن کر رہ گئی تھی۔ شنکر پرشاد کے نام کے تقریباً سارے خطوں میں گھریلو پریشانیوں کا ذکر ملتا ہے۔ کسی خط میں اپنے بیٹے کی بے روزگاری کا تذکرہ ہے اور کسی میں اپنے داماد کی معاشی بدحالی کا۔ اِن دونوں کو روزگار دلانے کے لیے شنکر پرشاد کو بار بار لکھا گیا ہے۔

پاکستان آنے سے کچھ عرصہ پہلے کے ایک خط کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جوش جیسا بڑا شاعر اور پنڈت نہرو کا ذاتی دوست کیسے حالات میں زندگی بسر کر رہا تھا: ''بندہ پرور! دوسروں کی سفارش کرتے ہوئے جو کہنا ہوتا ہے، میں کہہ گزرتا ہوں لیکن اب اپنے متعلق کہنے کا جو موقع آیا ہے تو بے تکلفی کے باوجود شرمایا جارہا ہوں۔ جہاں تک دُنیوی عقل کا تعلق ہے میں ایک خالص احمق آدمی ہوں، اِس لیے اپنی عقل سے نہیں بلکہ اپنی

Marfat.com

زوجۂ محترمہ کی عقل سے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میری بیوی مجھ سے کہتی ہے کہ تم نرے پاگل ہو۔ شنکر پرشاد صاحب سے اپنی حالت صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تمھیں اُن کی امداد کی سخت ضرورت ہے۔ اگر شنکر پرشاد صاحب چاہیں تو تمھاری ساری مصیبتیں دور ہوسکتی ہیں اور وہ اِس طرح کہ ا۔ سجاد کو ٹرک چلانے یا اِسی قسم کا کوئی پرمٹ دے دیں تاکہ وہ روزی کمانے لگے اور ہم دونوں اِس اطمینان کے ساتھ مریں کہ وہ ٹھوکریں کھاتا نہیں پھرے گا۔ ۲۔ ''شعلہ و شبنم'' کے واسطے شنکر پرشاد صاحب اپنے براہ راست اثر سے اشتہارات دلا دیں۔ اور ۳۔ شنکر لال کو ذرا سا اشارہ کردیں کہ ... مالی امداد کردے۔ ہزار اُس کے نزدیک ایک نہایت حقیر رقم ہے لیکن زمانے کی رفتار نے آج ہماری یہ حالت کردی ہے کہ ہزار کی سی حقیر رقم ہمارے نزدیک نہایت اہم ہے...''

ایسے اندوہ ناک حالات میں جوش کے لیے سوائے اِس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ پاکستان آجاتے۔ انھوں نے اچھا ہی کیا کہ یہاں آگئے۔ پاکستان میں جوش نے جس آسودہ حالی میں زندگی بسر کی، ہندوستان میں رہ کر وہ اُس کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

(۱۲/اکتوبر ۱۹۹۵ء)

Marfat.com

تاریخ یا ٹلّے نویسی

لفظ بھی انسانوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، جیتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح اُنھیں عزت بھی ملتی ہے اور ذلّت بھی۔ کبھی یہ معمولی حیثیت سے ترقی کر کے بلند مدارج تک پہنچ جاتے ہیں اور کبھی بلند مدارج سے گر کر معمولی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ کسی لفظ کے بلند درجہ حاصل کرنے کی بہترین مثال لفظ ''شہید'' ہے۔ ظہورِ اسلام سے پہلے یہ گواہی دینے والے کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اِس سے غرض نہیں تھی کہ وہ جھوٹی گواہی دے رہا ہے یا سچی۔ اسلام نے اِس لفظ کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا اور اب یہ صرف حق کی راہ میں جان دینے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ معنوی تنزّل کی مثالیں بھی عام ملتی ہیں۔ ''نائک'' ایک بہت بڑا اور قابلِ احترام فوجی عہدہ تھا مگر آج اِس کی تانیثِ اخلاقی زوال کی آئینہ دار ہے۔ اِسی طرح ''جمعدار'' بھی مغلوں کے زمانے میں ایک معزز عہدہ تھا اور ''مہتر'' سردار کو کہتے تھے (جیسے سابق ریاست چترال کے نواب کو ''مہترِ چترال'' کہا جاتا تھا) مگر اب اِن دونوں لفظوں کی عزت خاک میں مل چکی ہے کہ یہ خاک روبوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ معنوی زوال کی تازہ ترین مثال ''دانش ور'' ہے۔ کبھی یہ لفظ عالموں، عقل مندوں اور داناؤں کے لیے استعمال ہوتا تھا، اب اُن لوگوں کے سر منڈھ دیا گیا ہے جو اکادمی ادبیات کی سالانہ کانفرنسوں میں شریک ہوتے ہیں اور اُن کا دانش سے وہی تعلق ہوتا ہے جو اکادمی ادبیات کا ادب سے ہے یا کسی زنگی کا کافور سے۔

ایک عرصے سے ہماری خواہش تھی کہ کوئی خدا کا بندہ دانش وروں کے بارے میں تحقیق کر کے بتائے کہ اصلی اور جعلی دانش ور میں کیا فرق ہوتا ہے اور تاریخ کے مختلف ادوار میں

Marfat.com

اِن دونوں طرح کے دانش وروں کا کردار کیا رہا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی نے ہماری یہ خواہش پوری کردی۔ اُنھوں نے ''تاریخ اور دانش ور'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی ہمارے ملک کے ممتاز مورخ ہیں۔ تاریخی موضوعات پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں۔ برصغیر کی تاریخ پر اُن کی گہری نظر ہے لیکن کسی حد تک یہ نظر ترچھی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تازہ کتاب ایک آئینہ خانے کی طرح ہے جس میں مختلف نوعیت کے دانش وروں کے چہرے بے نقاب کیے گئے ہیں لیکن ایک چہرہ ایسا بھی ہے جس پر نام نہاد سیکولرازم اور ترقی پسندی کا دبیز نقاب پڑا ہوا ہے اور یہ چہرہ خود ڈاکٹر صاحب کا ہے۔ بے نقاب چہروں کے ساتھ یہ بانقاب چہرہ بھی خاصا دل کش ہے۔ نقاب سے چھن کر آنے والی ترچھی نظروں نے اِسے اور بھی دل کش بنا دیا ہے۔

''تاریخ اور دانش ور'' دراصل متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ دانش وروں کے بارے میں ہے اور اِسی کی مناسبت سے کتاب کا نام رکھا گیا ہے اور یہی ہمارے کام کا ہے۔ ورنہ آخری دو حصوں میں ''آلو اور اُس کے سماجی اثرات'' جیسے موضوعات پر دادِ تحقیق دی گئی ہے۔ اگر تحقیق کرنی ہی تھی تو بینگن کے سماجی اثرات پر کی ہوتی کہ دانش وروں کا اِس سے بہت گہرا تعلق ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے دانش وروں کی جو قسمیں بیان کی ہیں، اُن میں سرِفہرست سرکاری دانش ور ہیں۔ یہ وہ دانش ور ہیں جو حکومت کے نظریات اور پالیسیوں کی حمایت کرتے ہیں اور حکومت اُن کی سرپرستی کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ سرکاری دانش ور صرف ایوب خان اور ضیاء الحق کے دور میں نظر آتے ہیں۔ ''عوامی آمروں'' کے عہد میں اُنھیں کوئی سرکاری دانش ور دکھائی نہیں دیتا۔ حد تو یہ ہے کہ موصوف نے علامہ اقبال کو بھی سرکاری دانش وروں میں شامل کرلیا ہے۔ فرماتے ہیں: ''پاکستان میں ... اُن دانش وروں کو جو گزر چکے ہیں مگر جن کے خیالات ریاست کے نظریے کو تقویت و استحکام بخشتے ہیں، اُن کو دوبارہ سے دریافت کر کے اُن کا پروپیگنڈا کیا جارہا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ دورِ جدید کے دانش وروں میں اقبال کے افکار جو مطلق العنان حکومتوں کی حمایت کرتے ہیں کیوں کہ یہ جمہوری نظام کے خلاف ہیں۔ اِن میں اشتراکیت پر تنقید، مغربی تہذیب سے بیزاری، عورتوں کی آزادی کی مخالفت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کے ہاں شخصیت پرستی کی تبلیغ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر حکومت کے لیے اقبال اور اُن کے افکار جو آمریت، جبر اور تشدد کی حمایت کرتے ہیں، اُن کی اشاعت و تبلیغ اسی لیے کی جاتی ہے تاکہ اُن سے وہ اپنے قانونی اور اخلاقی ہونے کا جواز ثابت کرسکیں''۔

Marfat.com

علامہ اقبال کی دوبارہ دریافت کی بات کر کے دور کی کوڑی لانے کی جو کوشش کی گئی ہے، اُس سے قطع نظر اقبال کے جرائم کی فہرست تیار کرتے وقت اگر ڈاکٹر مبارک علی بعض اشترا کی مصنفوں مثلاً علی سردار جعفری اور سید سبط حسن کی اقبال سے متعلق تحریریں ہی پڑھ لیتے تو اُنھیں کم از کم یہ معلوم ہو جاتا کہ اقبال کون تھے اور کیا تھے؟ اُنھوں نے آمریت، جبر اور تشدد کی حمایت کی ہے یا مخالفت۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے آلو کے سماجی اثرات پر لکھنے کے لیے تو حوالے کی ایک آدھ کتاب دیکھ لی مگر اقبال کے بارے میں رائے دیتے ہوئے کلامِ اقبال کا مطالعہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، اِسی لیے اُن کا موقف اُن کے اندازِ تحریر سے بھی زیادہ بے مزہ اور کمزور ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو اِس کا بھی غم ہے کہ پاکستان کی یونی ورسٹیوں میں صرف اُنھیں موضوعات پر تحقیق کی اجازت ہے جو تحریکِ پاکستان اور دو قومی نظریے کی حمایت کرتے ہیں، اگر کوئی دانش ور دو قومی نظریے یا بانیِ پاکستان کے خلاف تحقیق کرنا چاہے تو اُسے اِس کی اجازت نہیں ملتی۔ اِس صورتِ حال کا نتیجہ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ ''ایک طرف تو نظریۂ پاکستان دانش وروں کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے تو دوسری طرف مذہب اور تہذیبی روّوں اور اقدار کو لے کر ہم سماجی علوم میں تحقیق کو روکتے ہیں''۔

خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک دانش وری کی راہ میں نظریۂ پاکستان ہی رکاوٹ ہے، ورنہ ہم بعض ایسے دانش وروں کو بھی جانتے ہیں جن کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ خود پاکستان ہے اور وہ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی اکھنڈ بھارت کے خواب دیکھتے ہیں۔ ممکن ہے پاکستان میں تحریک پاکستان، دو قومی نظریے اور بانیِ پاکستان کے خلاف دانش ورانہ تحقیق کی اجازت نہ ہو لیکن خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے لہٰذا اُس وقت تک خواب دیکھتے رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں جب تک اِن خوابوں کی حسبِ منشا تعبیر نہ مل جائے۔

ڈاکٹر صاحب کو اِس کی بھی شکایت ہے کہ پاکستانی دانش وروں نے بھارت سے جنگ کے زمانے میں قومی ترانے اور ایسی نظمیں کیوں لکھیں جن کے ذریعے دشمن کے خلاف پاکستانی عوام کے جذبات ابھارے گئے۔ فرماتے ہیں: ''پاکستانی دانش وروں کی اکثریت نے ہمیشہ حکمران طبقوں کے مفادات کی حمایت کی ہے۔ مثلاً جنگ کے موقع پر بجائے اِس کے کہ یہ اُس کی مخالفت کرتے اور جنگ کی ہول ناکیوں سے لوگوں کو آگاہ کرتے، ہمارے دانش وروں نے اِس کی بجائے عوام کے جذبات کو اپنی شاعری اور افسانوں کے ذریعے بھڑکایا اور امن کی بجائے جنگ کی جانب مائل کیا۔ اِس لیے اِس رویّے سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے

Marfat.com

دانش وروں نے آخر کیوں موقع پرستی اور خوشامد کو اختیار کیا۔ آخر اُنھوں نے کیوں اتھارٹی کو چیلنج نہیں کیا، اس پر تنقید نہیں کی اور اُس کے خلاف کوئی بغاوت کی آواز نہیں اٹھائی‘‘۔

دوسرے لفظوں میں ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ ہے کہ جنگ کے دوران شاعروں اور ادیبوں کو عوام کا حوصلہ بلند نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنی حکومت کے خلاف ایک اور محاذ جنگ کھول دینا چاہیے تاکہ دشمن کو اپنے مقاصد میں جلد کامیابی ہو۔ مشورہ بہت عمدہ ہے مگر اِس پر عمل وہی شاعر اور ادیب کر سکتے ہیں جو زمانۂ امن میں دشمن ملک میں منتقل ہو جائیں اور جنگ کے دوران دشمن کی فوج میں باقاعدہ شریک ہو کر اپنے ملک کی طرف پیش قدمی کریں تاکہ اپنے ملک کی اتھارٹی کو چیلنج کرنے اور بغاوت کی آواز اٹھانے میں نظریۂ پاکستان رکاوٹ نہ بن سکے۔

ڈاکٹر مبارک علی نے پاکستانی دانش وروں کی اِس بنا پر بھی مذمّت کی ہے کہ وہ آمروں سے اعزازات اور انعامات وصول کرتے رہے ہیں۔ فرماتے ہیں: ’’ایوب خان، یحییٰ خان اور ضیاء الحق کے دور میں ہمارے دانش ور بغیر کسی شرم کے اُن سے خطابات و انعامات قبول کرتے رہے ہیں اور ان خطابات کو قبول کرتے ہوئے اُن میں سے کسی نے اُن کے جبر و تشدّد اور عوام دشمنی پر کسی قسم کا اظہار نہیں کیا اور نہ اُن کو انسانی حقوق کو کچلنے کے لیے قابلِ مذمت جانا بلکہ اُن کے ہاتھوں یا اُن کی جانب سے خطابات کو قبول کرنے کا مطلب تھا کہ وہ اُن کی پالیسیوں کی تصدیق کر کے اُن کے ہم نوا ہو گئے ہیں‘‘۔

ہمیں ڈاکٹر صاحب کے ارشاداتِ عالیہ سے صد فی صد اتفاق ہے، بس اتنی گزارش ہے کہ اگر سچ بولنا ہی تھا تو پورا سچ بولتے اور آمروں کی فہرست میں اُس جمہوریت نواز کا نام بھی شامل کر لیتے جس کے پورے عہدِ حکومت میں عوام کے بنیادی حقوق ایک دن کے لیے بھی بحال نہیں کیے گئے تھے۔ اُس جمہوریت نواز کو آمروں کی فہرست سے خارج کرنا اور اُس کے عہد میں ملنے والے اعزازات و خطابات کو دانش وروں کے لیے مباح قرار دینا تاریخ نویسی نہیں، ٹلّے نویسی ہے۔ کھلم کھلا آمریت یقیناً قابلِ مذمّت ہے لیکن اُس سے زیادہ قابلِ مذمّت وہ آمریت ہے جو جمہوریت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہو۔

زیرِ نظر کتاب میں ایک مضمون ’’تاریخ اور افواہیں‘‘ کے عنوان سے بھی ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ افواہیں کس طرح پھیلتی ہیں۔ اب اُنھیں ایک مضمون ’’مورّخ اور افواہیں‘‘ کے عنوان سے بھی لکھنا چاہیے جس میں یہ بتایا جائے کہ افواہیں پھیلانے والوں میں کبھی کبھی مورّخ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اِس کی مثالیں دینے کے لیے اُنھیں دوسروں کی کتابوں کی

Marfat.com

ورق گردانی کی ضرورت نہیں ہوگی، اپنی زیرِ نظر کتاب ہی سے کئی مثالیں مل جائیں گی۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ بعض لوگ جو دانش ور نہیں ہوتے مگر دانش ور بننے کا شوق رکھتے ہیں، وہ دوسروں سے کتابیں لکھوا کر اپنے نام سے شائع کرتے ہیں اور اِس طرح اپنا شوق پورا کر لیتے ہیں۔ اِس کی اُنھوں نے دو مثالیں دی ہیں، پہلی مثال یہ ہے: ''تقسیم کے بعد بہت سے عربی و فارسی کے اسکالرز ہجرت کر کے پاکستان آئے اور یہاں آ کر اُنھیں مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اِن حالات سے فائدہ اٹھا کر سندھ کے ایک مشہور دانش ور نے کہ جنھیں حکومت ایران و پاکستان سے تمغے اور انعامات بھی ملے، اِن لوگوں سے معاوضے پر کام کرا کے اپنے نام سے چھپوایا اور مشہور محقق اور دانش ور ہو گئے''۔

مورخ اشاروں کنایوں میں بات نہیں کرتا۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے صاف صاف لفظوں میں کہتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے پیر حسام الدین راشدی مرحوم کا نام لیے بغیر اُن پر الزام لگایا ہے کہ وہ دوسروں سے معاوضے پر کام کرا کے اپنے نام سے شائع کرتے تھے۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جس نے پیر صاحب کی کتابوں کو نہ دیکھا ہو۔ ویسے بھی پیر صاحب کا بیشتر کام فارسی میں ہے اور فارسی ڈاکٹر صاحب کے لیے عبرانی کا درجہ رکھتی ہے۔ اور اِسی لیے اُنھوں نے اپنی کتابوں میں ہمیشہ فارسی مآخذ کے اردو اور انگریزی ترجموں پر انحصار کیا ہے۔ پیر صاحب فارسی زبان کے بہت بڑے ماہر تھے۔ اُن کے موضوعاتِ تحقیق، فارسی ادب اور تاریخِ سندھ تھے۔ اِن دونوں پر وہ درجۂ استناد رکھتے تھے۔ اُن کے علمی و تحقیقی معیار کی بلندی کی گواہی سید صباح الدین عبدالرحمٰن جیسے بڑے عالم نے دی ہے جو خود مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی مسندِ علم کے وارث تھے اور جنھوں نے ہندوستان میں بیٹھ کر پیر حسام الدین راشدی کے علمی کاموں پر پوری ایک کتاب لکھی ہے جو شائع بھی ہو چکی ہے۔ پیر صاحب کو کتابیں لکھ کر دینے والے ''اسکالرز'' کے نام ڈاکٹر مبارک علی نے صیغۂ راز میں رکھے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ نہ صرف اِن ''اسکالرز'' کے نام ظاہر کر دیں بلکہ یہ بھی بتا دیں کہ اِن ''اسکالرز'' نے اپنے نام سے بھی کبھی کوئی اِس پائے کا علمی کام کیا تھا جس قسم کے کام وہ پیر صاحب کے لیے انجام دے گئے۔

ڈاکٹر مبارک علی نے دوسری مثال بھی نام لیے بغیر دی ہے، فرماتے ہیں: ''ایک مشہور دانش ور شخصیت کراچی میں رہتی ہے کہ جنھیں بیک وقت ادب، فلسفہ، تاریخ اور حکمت پر مہارت ہے۔ اُن کے ماتحت کئی اسکالرز کام کرتے ہیں اور عربی و فارسی کے مسودات کی تصحیح کر

Marfat.com

کے اُن کے نام سے شائع کراتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی قومی و بین الاقوامی شہرت ہے"۔

ظاہر ہے کہ جس دانش ور شخصیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ حکیم محمد سعید صاحب کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان کی تردید کے لیے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آج تک حکیم صاحب کے نام سے عربی وفارسی کا کوئی مسودہ شائع نہیں ہوا۔

ڈاکٹر صاحب، گستاخی معاف، مورخ اور افواہ ساز میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے؟

(۵ر ستمبر ۱۹۹۶ء)

Marfat.com

مرزا غالب پر قاتلانہ حملہ

علامہ اقبال کے ساتھ قوالوں اور سیاست دانوں نے اتنی بدسلوکی نہیں کی جس قدر محققوں اور نقادوں نے اپنی خوش فعلیوں سے غالب کی روح کو شرمندہ کیا ہے اور اب تو وہ لوگ بھی جو محقق یا نقاد نہیں ہیں، غالب کی آبرو کے در پے ہیں اور اِس بے چارے پر بعد از وفات قاتلانہ حملے کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

غالب پر تازہ ترین حملہ ''مکتوباتِ غالب'' نامی کتاب کے ذریعے ہوا ہے جس کے بیرونی سرورق پر لطیف الزماں خان کا نام بغیر اِس صراحت کے درج ہے کہ موصوف اِس کتاب کے مصنّف ہیں یا مرتّب۔ کتاب کے اندرونی سرورق پر ایک دوسرا نام درج ہے ''خلیق الزماں''۔ قاری حیران ہوتا ہے کہ اصل صاحبِ کتاب کون ہے۔ لطیف الزماں خان یا خلیق الزماں۔ کتاب کے دوسرے صفحے سے یہ راز کھلتا ہے کہ پہلا نام صحیح ہے اور دوسرا کتابت کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ کتاب کے سرورق پر اتنی بڑی غلطی کی موجودگی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خود کتاب میں غلطی ہائے مضامین کا کیا عالم ہوگا۔ کتاب کے دوسرے صفحے سے ہی یہ راز بھی فاش ہوتا ہے کہ لطیف الزماں اِس کتاب کے مترجم ہیں۔ اگر کتاب کے سرورق پر موصوف کے نام سے پہلے لفظ ''مترجم'' لکھ دیا جاتا تو کسی کو یہ خوش گمانی نہ ہوتی کہ خاں صاحب نے مکتوباتِ غالب تصنیف کیے ہیں۔ مگر یہ خوش گمانی بھی حقیقت سے دور نہیں ہے، مترجم نے ایسے ایسے کمالات دکھائے ہیں کہ غالب کے مکتوبات، غالب سے زیادہ مترجم کی تصنیف معلوم ہوتے ہیں۔

غالب کے فارسی خطوط تین مجموعوں (پنج آہنگ، متفرقاتِ غالب، مآثر غالب) میں شامل ہیں اور غیر مدون فارسی خطوط بھی مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں غالب

Marfat.com

صدی کے موقع پر غالب کے فارسی خطوط کا ایک ''نیا'' مجموعہ منظرِ عام پر آیا۔ جسے سید اکبر علی ترمذی نے مرتب کیا اور غالب اکیڈمی دہلی نے شائع کیا۔ اِس مجموعے میں جو خطوط شامل ہیں، اُن میں سے چند کے سوا، باقی تمام پہلے کبھی شائع نہیں ہوئے تھے۔ اصل مخطوطہ جس سے یہ خطوط حاصل کیے گئے نیشنل آرکائیوز دہلی میں محفوظ ہے اور اپنی نوعیت کا واحد مخطوطہ ہے۔ اس کا کوئی دوسرا نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔ اِس میں غالب کے خطوط، اصل خطوں کو سامنے رکھ کر نقل کیے گئے ہیں۔ غالب کے سفر کلکتہ کے سلسلے میں یہ خطوط بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اِن سے بعض ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو کسی دوسرے ذریعے سے دستیاب نہیں ہیں۔ سید اکبر علی ترمذی ہندوستان کے نامور مورخ اور ماہر آثارِ قدیمہ ہیں۔ فارسی زبان سے وہ ماہرانہ واقفیت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے غالب کے خطوط کو نہایت عمدگی سے مرتب کیا ہے۔ اِن خطوط کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے ایک طویل تعارف یا مقدمہ انگریزی میں لکھا ہے۔ ترمذی کا مختصر دیباچہ اور قاضی عبدالودود کا مختصر پیش لفظ بھی کتاب میں شامل ہے۔ یہ دونوں تحریریں بھی انگریزی میں ہیں۔

لطیف الزماں خان نے غالب کے فارسی خطوں اور مجموعے میں شامل انگریزی تحریروں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ فارسی خطوں کا تو یہ حال ہے کہ ترجمے کا شاید ہی کوئی صفحہ ہوگا جو غلطیوں سے پاک ہو۔ غلطیاں بھی ہر طرح کی ہیں۔ کہیں بعض لفظوں کو غلط معنی پہنائے ہیں اور کہیں پوری پوری عبارتوں کو۔ افسوس کہ اس مختصر کالم میں اتنی گنجایش نہیں کہ اصل فارسی متن اور اُس کے غلط ترجمے کی بے شمار مثالیں پیش کی جائیں۔ تاہم کچھ لطائف و ظرائف تو پیش کرنے ہی پڑیں گے جن میں تھوڑی بہت فارسی بھی ہوگی۔ فارسی کی وجہ سے یہ ہلکا پھلکا کالم بوجھل ہو جائے تو اِس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

ترجمے کی بسم اللہ ہی غلط ہوئی ہے۔ کتاب کا پہلا جملہ یہ ہے: ''ندانم خامہ آہنگ گزارش مدح اخلاق کہ دارد کہ در میدانِ تحریر از نقطہ ہزار جا پشتِ دست برزمین می گزارد''۔

اِس کا ترجمہ اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: ''مجھے نہیں معلوم کہ جناب عالی کا نغمہ نواز قلم، کیا اُس شخص کے اخلاق کی تعریف کرتا ہے کہ وہ جو نقطہ بھی لگاتا ہے، گویا آپ کی خدمت میں کورنش و تعظیم بجا لاتا ہے''۔

حاشیے میں مترجم نے فارسی عبارت کے ''مشکل'' الفاظ کے معنی بھی درج کیے ہیں جو یہ ہیں:

آہنگ = نغمہ نواز

Marfat.com

پشتِ دست برزمین گزارد= کورنش و تعظیم کردن

نغمے کو ''آہنگ'' ضرور کہتے ہیں لیکن یہ لفظ ''نغمہ نواز'' کے لیے کبھی استعمال نہیں ہوتا۔ مگر مترجم کو یہ معلوم نہیں کہ ''آہنگ'' کے ایک معنی قصد اور ارادے کے بھی ہیں اور غالب نے یہ لفظ اِنھیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ''پشتِ دست برزمین گزاشتن'' کے معنی تعظیم کرنے کے علاوہ منت و زاری کرنے اور بہت زیادہ اظہارِ عجز کرنے کے بھی ہیں اور غالب نے یہ محاورہ اِنھیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جناب مترجم لغت سے استفادہ کرتے وقت کثیر المعانی الفاظ کے مطلوبۂ غالب معانی کا فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ عبارت کے سیاق وسباق سے کون سے معنی مطابقت رکھتے ہیں۔

مذکورۂ بالا فارسی عبارت کا جو ترجمہ لطیف الزماں خان نے کیا ہے، وہ اصل سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ خان صاحب نے پہلے تو یہ تصور کرلیا کہ غالب کسی اور کے قلم کا ذکر کر رہا ہے، حالاں کہ اُس نے خود اپنے قلم کا ذکر کیا ہے۔ ''جناب عالی'' کا اضافہ مترجم نے اپنی طرف سے کردیا ہے۔ غالب کی عبارت میں یہ ترکیب استعمال نہیں ہوئی اور جو ترکیب (میدان تحریر) غالب کی عبارت میں موجود ہے، اُسے نظر انداز کردیا ہے۔ غالب کی مذکورہ عبارت کا ترجمہ استاد لاغر مراد آبادی نے بھی کیا ہے جو یہ ہے:

''معلوم نہیں قلم کس ہستی کے اخلاق کی مدح کرنا چاہتا ہے کہ صفحۂ کاغذ پر ہر نقطہ اپنے عجز کا اظہار کر رہا ہے''۔ (مراد یہ کہ قلم مدح کرنے سے قاصر ہے)

لطیف الزماں خان کے غلط اور بے معنی ترجمے اور استاد لاغر مراد آبادی کے سیدھے سادے ترجمے میں جو فرق ہے، اہلِ نظر اُس کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ جس کتاب کا آغاز غلط اور بے معنی ترجمے سے ہوا ہو اس کا انجام معلوم!

مترجم کی ہمت اور حوصلہ دیدنی ہے کہ وہ غالب کو اصلاح دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ مجموعے کے پہلے خط میں ایک جگہ غالب نے لکھا ہے: ''سیہ مستانہ رحیق شعلہ بہ پیمانہ می بودم''۔ اس کے بارے میں مترجم فرماتے ہیں: ''رحیق'' کتابت کی غلطی ہے۔ یہاں ''حریق'' درست ہے۔

''رحیق'' شراب کو کہتے ہیں اور ''حریق'' کے معنی ہیں شعلہ۔ غالب اپنی شراب نوشی کا ذکر کر رہے ہیں۔ اگر مترجم کی اصلاح قبول کرلی جائے تو جملہ بے معنی ہو جاتا ہے۔

غالب نے اپنے فارسی خطوں میں آرایشِ بیان پر خصوصی توجہ صرف کی ہے اور ایسی فارسی لکھی ہے جو زبان کی لطافتوں کی حامل ہے جس سے محظوظ ہونا خاصا مشکل کام ہے۔ چہ جائے کہ ان خطوں کا اردو ترجمہ کیا جائے۔ زیرِ نظر مجموعے کا ترجمہ کرنا یوں بھی بہت مشکل ہے کہ

Marfat.com

اصل مخطوطہ کرم خوردہ ہے اور اِس وجہ سے بہت سے الفاظ اور عبارتیں ضائع ہو گئی ہیں۔ سید اکبر علی ترمذی نے اِن لفظوں اور عبارتوں کی جگہ نقطے درج کیے ہیں۔ یہ نقطے تقریباً ہر صفحے پر ملتے ہیں اور بعض صفحوں پر تو سات سات آٹھ آٹھ مقامات پر نقطوں کے ذریعے ضائع شدہ لفظوں اور عبارتوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جناب مترجم نے یہ کمال دکھایا ہے کہ پورے ترجمے میں کسی ایک جگہ بھی اصل کے مطابق نقطے درج نہیں کیے اور تمام عبارتوں کو مسلسل کر دیا ہے۔ اصل میں جہاں کہیں نامکمل عبارت کی وجہ سے مفہوم سمجھنے میں الجھن پیدا ہو رہی تھی، وہاں مترجم نے اپنی طرف سے معانی میں رد و بدل یا اضافہ کر دیا ہے اور بعض جگہ یہ بھی کیا ہے کہ جن جملوں کا کوئی لفظ یا بعض الفاظ ضائع ہو گئے تھے، اُن کا ترجمہ نہیں کیا اور اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی کہ حاشیے میں اس غیر علمی طریقِ کار کی صراحت کر دی جائے۔

فارسی خطوں کے ساتھ مترجم نے جو سلوک کیا، اُس کا جواز تو یہ کہہ کر پیش کیا جاسکتا ہے کہ غالب اپنی شاعری کی طرح اپنی نثر کے راز بھی سخن ناشناسوں پر ظاہر نہیں کرتے مگر انگریزی تحریروں کے ترجمے میں مترجم نے جو گل کھائے ہیں، اُن پر اس لیے حیرت ہوتی ہے کہ موصوف ملتان کے ایک کالج میں تیس برس تک انگریزی پڑھاتے رہے ہیں۔ زیادہ مثالیں دینے کی گنجایش نہیں، صرف ایک دو مثالیں کافی ہوں گی۔

سید اکبر علی ترمذی نے کتاب کے مقدمے کی پہلی سطر میں اُس مخطوطے کا ذکر کیا ہے جس میں غالب کے زیرِ نظر خطوط موجود ہیں۔ چوں کہ یہ مخطوطہ منحصر بہ فرد ہے یعنی اس کا دنیا میں کوئی دوسرا نسخہ موجود نہیں ہے، اِس لیے ترمذی نے اِس کے لیے solitary manuscript کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مترجم نے ڈکشنری دیکھی اور solitary کے بہت سے معنوں میں سے ''بے یار و مددگار'' کو پسند نہ کیا لہٰذا اُنھوں نے ترجمہ کیا: ''بے یار و مددگار مسودہ''۔ اور یہ بھی نہ سوچا ''بے یار و مددگار'' انسانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ بے جان چیزوں کے لیے۔ اگر مترجم، بابائے اردو ہی کی ڈکشنری دیکھ لیتے تو اُس میں مذکورہ لفظ کے ایک معنی یہ بھی لکھے ہیں: ''واحد بلا شرکتِ غیرے''۔ کتاب کے مقدمے میں یہ لفظ انھیں معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

مترجم نے دیباچے اور مقدمے کا ترجمہ کرتے ہوئے غیر علمی زبان استعمال کی اور اُنھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ بعض علمی اصطلاحوں کا صحیح ترجمہ کیا ہے۔ (manuscript) کی مثال اوپر گزر چکی ہے جس کے لیے اُنھوں نے ہر جگہ ''مسودہ'' لکھا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اُنھیں مسودے اور مخطوطے کا فرق معلوم نہیں۔ اسی طرح قاضی عبدالودود کے پیش لفظ میں غالب کے بیانات کا خارجی شواہد سے مقابلہ کرنے کا جو ذکر کیا گیا ہے، اُس کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم

Marfat.com

نے ''تقابلی مقابلہ'' کی عجیب و غریب اور مضحکہ خیز ترکیب استعمال کی ہے۔ انگریزی میں لکھے ہوئے ناموں کو بھی جناب مترجم صحیح طور پر نہیں سمجھ پائے، مقدمے میں ایک مقام کا نام Kara ملتا ہے۔ مترجم نے اِس نام کو اردو میں ''کارا'' لکھا ہے۔ دراصل یہ مشہور تاریخی شہر ''کڑا'' ہے۔ اکبر الہ آبادی کے استاد وحید کڑوی اِسی شہر کے رہنے والے تھے۔ یہ مشہور شعر اُنھیں کا ہے۔

ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

مقدمے میں ایک جگہ قاضی عبدالودود کی مرتبہ کتاب ''مآثر غالب'' کا حوالہ دیا گیا ہے، کتاب کا نام رومن حروف میں تھا، اِس لیے مترجم نے ''مآثر'' کو ''معاصر'' سمجھا اور کتاب کو ''معاصرِ غالب'' بنا دیا۔ غالب کے خطوں کا ترجمہ کرنے والے کو اگر غالب سے متعلق ایک مشہور کتاب کا صحیح نام بھی معلوم نہ ہو تو اُسے غالب کا پیچھا چھوڑ کر کوئی آبرومندانہ کام کرنا چاہیے۔

عام قاعدہ ہے کہ اگر کسی کتاب میں غلط نامہ شامل ہو تو پہلے غلط نامے کے مطابق کتاب کی تصحیح کی جاتی ہے اور پھر اُس کا مطالعہ کیا جاتا ہے لیکن مترجم نے ترجمے سے پہلے غلط نامے سے استفادہ نہیں کیا۔ نتیجہ یہ کہ اصل کتاب میں طباعت کی جو غلطیاں تھیں، وہ ترجمے میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً مقدمے میں غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خان کے خسر کا نام احمد بخش خاں لکھ دیا گیا ہے، یہ خسر نہیں خسر کے بیٹے یعنی برادر نسبتی تھے۔ غلط نامے میں اِس غلطی کی تصحیح کی گئی ہے لیکن مترجم نے ترجمے میں غلطی کو موجود رہنے دیا۔ اِسی طرح ایک جگہ کلکتہ مدرسے کے مشاعرے کی تاریخ غلطی سے یکم جون لکھی گئی تھی۔ غلط نامے میں صحیح تاریخ ۶ر جولائی درج ہے۔ مترجم نے ترجمے میں غلط تاریخ یکم جون ہی درج کی ہے۔ اِسی طرح کی اور بھی کئی مثالیں ملتی ہیں جن سے مترجم کے ''غلطی پسند'' ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

اصل کتاب میں ایک جامع اشاریہ تھا۔ ترجمے میں اُسے حذف کر دیا گیا ہے۔ کتاب کا اشاریے کے بغیر شائع ہونا تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ایک محنت طلب کام تھا، لیکن کتاب کے شروع میں جو فہرستِ مضامین دی گئی ہے، اُس میں صفحات کے نمبر درج نہ کرنا، ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ یہ تو کوئی محنت کا کام بھی نہیں تھا۔ سب سے زیادہ قابلِ اعتراض اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ کتاب کے اصل مرتّب اور مقدمہ نگار سید اکبر علی ترمذی کی محنت کا مناسب طریقے سے اعتراف نہیں کیا گیا۔ اُن کا نام بیرونی سرورق پر ہے نہ اندرونی سرورق پر۔ غنیمت ہے کہ غالب کا نام کتاب کے نام میں شامل ہے، اگر مترجم غالب کو بھی نظر انداز کر دیتے تو کوئی اُن کیا بگاڑ سکتا تھا۔

(۱۹ر دسمبر ۱۹۹۶ء)

Marfat.com

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

اردو خطوط نویسی کی تاریخ میں رشید احمد صدیقی کو اِس اعتبار سے امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ اُنھوں نے خطوط نویسی کو ایک فنِ لطیف کا درجہ دے دیا۔ اُنھوں نے اِسے ایک ایسے شغل کے طور پر اپنایا جس سے اُنھیں سکون ملتا تھا اور اِس طرح وہ اپنی خلوت کو جلوت بنا لیتے تھے۔ خط لکھ کر وہ نہ صرف خود خوش ہوتے تھے بلکہ وہ لوگ بھی خوشی محسوس کرتے تھے جن کے نام خط لکھے جاتے تھے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے ہر خط میں کوئی نہ کوئی ایسا نکتہ ضرور ہوتا ہے جس سے اُن کی ذہانت اور شوخیِ طبع آشکار ہوتی ہے اور پھر اُن کا اندازِ بیان ایسا ہے کہ اگر کسی خط میں کام کی کوئی بات نہ بھی ہو تو انشا پردازی ہی کام کی بات بن جاتی ہے۔ اپنی خطوط نگاری کے بارے میں رشید صاحب نے اپنے ایک مضمون ''اپنی یاد میں'' میں لکھا ہے:

> ''بے تکلف اور مخلص دوستوں کو خط لکھنے میں مجھے بڑا لطف آتا تھا۔ ان خطوں میں مجھے سب کچھ لکھ دینے میں مطلق باک نہ ہوتا۔ یہ میرے اچھے برے خیالات اور جذبات کی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ مجھے اِس کا خیال آیا کرتا تھا کہ کہیں یہ منظر عام پر نہ آجائیں، چنانچہ ایک بار ایک عزیز دوست کی وفات کی خبر آئی تو بہت لمبا اور دشوار سفر کر کے جلد سے جلد پہنچا۔ مرحوم میرے خطوط سینت کر رکھتے تھے، پہنچتے ہی کاغذات کا جائزہ لیا اور اپنے خطوط کا بنڈل قبضے میں لے کر آگ کے حوالے کردیا۔ خدا کرے مرے اس قسم کے خطوط جن بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کے پاس ہوں، وہ اُن کو تلف کر چکے ہوں۔ وہ میرے اور

Marfat.com

اُن کے درمیان پرائیویٹ گفتگو تھی جس کا مشتہر کرنا اخلاقی جرم ہے۔ فائدہ کوئی نہیں، فتنے کا امکان زیادہ ہے۔ میرے نزدیک اچھے خطوط وہ ہوتے ہیں جن کو شائع نہ کیا جاسکے۔ مجھے لکھنے پر جو قدرت تھی، اُس کی واقعی خوشی اُس وقت حاصل ہوتی تھی جب بے تکلف احباب، مخلصوں اور عزیزوں کو خط لکھنے بیٹھتا''۔

یہ اقتباس رشید صاحب کے مزاج و کردار کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک طرف تو وہ خطوط نگاری سے لطف حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف اِس سے خوف زدہ بھی ہیں کہ اُن کے خطوط کہیں عام نہ ہو جائیں۔ یہ خوف آخری وقت تک اُن پر طاری رہا اور وہ اپنے خطوط کی اشاعت کو سختی سے ناپسند کرتے رہے۔ ایک مرتبہ جب اُنھیں معلوم ہوا کہ ایک صاحب اُن کے خط جمع کر رہے ہیں تو اُنھوں نے ایک مراسلہ شائع کرایا اور اُس میں یہ لکھا:

> ''میرے تمام کرم فرما جانتے ہیں کہ بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کے نام میں نے جو نجی خطوط لکھے ہیں، اُن کا شائع کیا جانا مجھے کسی حال میں منظور نہیں۔ اِس کو میں امانت میں خیانت سمجھتا ہوں... اپنے بچوں تک کو ہدایت کردی ہے کہ وہ میرے خطوط شائع نہ کریں۔ میری اِس خواہش یا درخواست کو اگر کوئی ناقابلِ التفات سمجھے تو میں کیا، کوئی بھی اُس کا کچھ نہیں کرسکتا۔ البتہ مجھے اِس کی بڑی تکلیف ہوگی اور رہے گی کہ متعلقہ اصحاب نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا''۔

خطوط کی اشاعت سے خوف زدہ ہونے کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ رشید صاحب اپنے مکتوب الیہم پر اعتماد کر کے بعض ایسی باتیں بھی لکھ دیتے تھے جو اُن کے معروف خیالات کے برعکس ہوتی تھیں۔ خصوصاً بعض شخصیات کے حوالے سے اُن کی جولانیِ طبع حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتی تھی، اِس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی تضاد بیانیوں کی وجہ سے اُن کے کردار پر انگشت نمائی کی جائے۔ اِس بات کو ایک مثال سے واضح کیا جاتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی سے رشید صاحب کے گہرے مراسم تھے۔ مولانا سے وہ نیاز مندی کا تعلق رکھتے تھے۔ مولانا کے نام رشید صاحب کے جو خطوط شائع ہو چکے ہیں، اُن میں سے اکثر کا آغاز اِس طرح ہوتا ہے۔ ''قبلہ محترم مدظلہ العالی، آدابِ خادمانہ عرض ہے''۔ ان خطوں میں رشید صاحب نے جس طرح اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کی ہستی اُن کے لیے رہنما کا درجہ رکھتی تھی، لیکن دوسروں کے نام کے خصوصاً پروفیسر آل احمد سرور

Marfat.com

کے نام کے خطوں میں رشید صاحب ہی نہیں بلکہ مولانا دریا بادی بھی یکسر مختلف نظر آتے ہیں۔ مولانا نہ صرف یہ کہ انتہائی زہرناک طنز کا ہدف بنتے ہیں بلکہ اُنھیں نشانۂ تضحیک بھی بنایا جاتا ہے۔ یہی نہیں ''تف ہے مولانا دریا بادی پر'' اور ''لعنت اللہ علی الماجدین'' جیسے الفاظ لکھنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ انتہا یہ ہے کہ وہ مولانا کو مشہور متعصب کانگریسی لیڈر سمپورنانند کی قبیل کا آدمی سمجھتے ہیں اور اُنھیں مسلمانوں کا بہی خواہ ماننے سے بھی انکار کردیتے ہیں۔ (اس سلسلے میں پروفیسر آل احمد سرور کے نام ۲۸؍مئی ۱۹۵۱ء کا ایک طویل خط پڑھنے کے قابل ہے جو پورے کا پورا مولانا دریا بادی کے خلاف ہے)

رشید صاحب اپنی انھیں تضاد بیانیوں کی وجہ سے خوف زدہ رہتے تھے، موقع ملتا تھا تو اپنے خطوں کو خود ضائع کر دیتے تھے یا مکتوب الیہم سے درخواست کرتے تھے کہ اُنھیں تلف کردیں۔ اپنے بچوں کو اُنھوں نے ہدایت یا وصیّت کر رکھی تھی کہ وہ خطوں کو نہ صرف یہ کہ شائع نہ کریں بلکہ تلف کردیں۔ مگر رشید صاحب کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ اوروں کا تو کیا ذکر، اُن کے بچوں نے بھی باپ کی ہدایت یا وصیّت کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنے اپنے نام کے خطوط چھپوا دیے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خطوط کی اشاعت پر پابندی عائد کردے یا اُنھیں تلف کرنے کی ہدایت کرے۔ عام لوگوں کی بات دوسری ہے کہ وہ اپنے خطوط کے ساتھ جیسا سلوک چاہیں کریں، لیکن کسی بڑے ادیب کے خطوں کا معاملہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔ اُس کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ادبی سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کی کسی تحریر کا تلف ہو جانا، اُس ادیب کا نہیں، ادب کا نقصان ہے۔ اور پھر خطوط کی اہمیت عام تحریروں سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ اُن سے نہ صرف خط نگار کے سوانحی کوائف مرتب کرنے میں بیش بہا مدد ملتی ہے، بلکہ اُس کے عہد اور معاصرین کے بارے میں بھی بہت سی نادر معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔ رشید صاحب کے مکتوب الیہم نے رشید صاحب کی خواہش کا احترام نہ کر کے، ممکن ہے اخلاقی وضع داری سے انحراف کیا ہو، لیکن ادبی نقطۂ نظر سے یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ اگر رشید صاحب کے خطوط ضائع کر دیے جاتے تو یہ اردو ادب کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ خطوط، کاتب کی نہیں، مکتوب الیہ کی ملکیت ہوتے ہیں۔ قانونی طور پر خطوں کو تلف کرنے یا شائع کرنے کا حق اُسی کو حاصل ہوتا ہے۔ رشید صاحب کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنے خطوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے۔

رشید صاحب خطوط لکھنے کے اتنے شائق تھے کہ ہر وقت کچھ پوسٹ کارڈ اپنی جیب

Marfat.com

میں رکھتے تھے۔ اِدھر کسی کا خط آیا اور اُدھر انھوں نے اُس کا جواب لکھا۔ لیکن خط لکھنے کے لیے ضروری نہیں تھا کہ کسی کا خط آئے اور وہ جواب لکھیں۔ وہ از خود بھی خط لکھتے تھے۔ یہاں تک کہ جو لوگ علی گڑھ ہی میں رہتے تھے، اُن سے ملاقاتوں کے باوجود خط کتابت بھی جاری رہتی تھی۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ کسی سے صبح ملاقات ہوئی اور شام کو اُس ملاقات کے حوالے سے خط لکھ دیا۔ اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ۸۵ برس کی طویل عمر پانے والے نے اپنی زندگی میں کتنے خط لکھے ہوں گے۔ یہ تعداد ہزاروں ہی میں ہوسکتی ہے۔

۱۹۹۵ء تک رشید صاحب کے خطوط کے چھ مجموعے چھپ چکے تھے۔ دو مجموعے اِس سال شائع ہوئے ہیں۔ ایک میں پروفیسر مسعود حسین خان اور دوسرے میں پروفیسر آل احمد سرور کے نام کے خطوط شامل ہیں۔ اوّل الذکر مکتوب الیہ کے نام کے خطوط کا ایک مجموعہ (''رقعات رشید صدیقی'') پہلے بھی شائع ہو چکا ہے۔ اُس وقت بعض خطوط دستیاب نہیں ہوئے تھے۔ مسعود صاحب کا خیال تھا کہ یہ ضائع ہو گئے مگر خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ یہ محفوظ رہے اور اُنھیں خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ) کے شمارہ ۱۰۴ میں شائع کر دیا گیا ہے۔ مگر اُن کا شائع ہونا نہ ہونا تقریباً برابر ہے کیوں کہ خطوں کے عکس چھاپے گئے ہیں، اُنھیں نستعلیق میں منتقل نہیں کیا گیا۔ اِن خطوں کو پڑھنا خاصا مشکل ہے۔ جن لوگوں کو پرانی قلمی کتابیں پڑھنے کا تجربہ ہے، وہ تو اِن سے استفادہ کر سکتے ہیں لیکن عام قاری کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ ایک ایک لفظ پر غور کر کے معلوم کرے کہ خط نگار نے لکھا کیا ہے۔ پھر اِن خطوط پر حواشی بھی تحریر نہیں کیے گئے۔ اِس وجہ سے بہت سی عبارتوں کا مفہوم واضح نہیں ہوتا نیز بہت سے ایسے اشخاص کا ذکر ملتا ہے جن کے بارے میں معلوم نہیں کہ وہ کون تھے۔

پروفیسر آل احمد سرور کے نام رشید صاحب کے خطوں کا مجموعہ گزشتہ مہینے علی گڑھ سے شائع ہوا ہے جسے خود سرور صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اِس کا نام ہے ''رشید احمد صدیقی کے خطوط''۔ اِس مجموعے میں دو سو سے زیادہ خط ہیں جو ۱۹۳۴ء سے ۱۹۷۳ء تک لکھے گئے۔ گویا یہ خط کتابت چالیس برسوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اِن خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کاتب اور مکتوب الیہ میں بے انتہا قربت تھی۔ رشید صاحب شاید ہی کسی دوسرے پر اتنا اعتماد کرتے ہوں جتنا اُنھیں سرور صاحب پر تھا۔ اپنی ذاتی زندگی سے لے کر ادب اور قومی زندگی کے ہر مسئلے اور معاملے میں وہ سرور صاحب سے مشورہ کرتے تھے اور اُن کی رایوں کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ایک زمانے میں مشہور ہو گیا تھا کہ دونوں میں استادی شاگردی کا تعلق تھا۔ رشید صاحب نے اِس تعلق کو اپنے لیے باعث فخر سمجھا اور اس کی تردید کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ایک خط میں اِس پر

Marfat.com

اظہارِ خیال اِس خوب صورت انداز میں کیا ہے:

''آج کل اِدھر اُدھر یہ خبر زیادہ پھیلنے لگی ہے کہ آپ میرے شاگرد ہیں اور لطف یہ ہے کہ جب آپ کو برا بتانا ہوتا ہے تو میری شاگردی کا واسطہ دیتے ہیں اور جب آپ کی تعریف کرتے ہیں تو مجھے بھول جاتے ہیں۔ آپ کی شرافت ہے کہ آپ اِس غلط فہمی کی تردید نہیں کرتے۔ اپنی بے غیرتی کو کیا کہوں کہ چُپکا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے۔ چُپکا میں چ کو زیر بھی دے سکتے ہیں''۔

سرور صاحب کے نام کے خطوں کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ ان میں دوسرے خطوں کی نسبت رشید صاحب کے حالاتِ زندگی سے متعلق معلومات زیادہ ملتی ہیں۔ چالیس برسوں میں رشید صاحب کی کیا کیا مصروفیات رہیں، کن کن شخصیات سے اُن کا کس نوعیت کا تعلق رہا، اِن شخصیات میں سے کس کو پسند کرتے تھے اور کسے ناپسند۔ اردو زبان اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر وہ کس طرح سوچتے تھے، علی گڑھ یونی ورسٹی سے اُنھیں کیسا تعلق خاطر تھا، ان سب سوالوں کے جواب اِن خطوں میں مل جاتے ہیں۔ ادبی مسائل اور ادبی تحریکات (خصوصاً ترقی پسند تحریک) کے بارے میں بھی جا بجا اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ رشید صاحب کے ادبی خیالات و نظریات جیسے اِن خطوں میں ملتے ہیں، وہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتے۔ مثلاً اپنی تنقید نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تنقید وغیرہ کا میرا علم بالکل فنی یا کتابی ہے۔ میں تو اپنے تاثرات پر جاتا ہوں اور اُسی کو اپنا قوی پوائنٹ سمجھتا ہوں۔ میرے تاثرات میرے لیے یقین اور عقیدے کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی کو میں اپنا مخلصانہ نقطۂ نظر سمجھتا ہوں''۔

اِن خطوں کے اور بھی بہت سے پہلوؤں پر لکھا جا سکتا ہے لیکن اس مختصر کالم میں تفصیل میں جانے کی گنجایش نہیں ہے، تاہم ایک اہم پہلو پر لکھے بغیر بات مکمل نہیں ہوگی اور وہ یہ ہے کہ یہ خطوط رشید صاحب کے اسلوب کی نہایت عمدگی سے نمایندگی کرتے ہیں۔ جا بجا خوب صورت جملے بکھرے ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مزاح پیدا کرنے کے لیے رشید صاحب کو کسی شعوری کوشش کی ضرورت نہیں تھی، یہ ان کے اندر سے اُسی طرح پھوٹتا تھا جیسے زمین سے کوئی چشمہ۔ صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

''یہ الزام تو مجھے بے بنیاد سا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے خط لکھنے میں

Marfat.com

کوتاہی کی ہو۔ میں عورتوں اور مولانا ماجد کے خطوں کا بڑی پابندی سے جواب دیا کرتا ہوں۔ عورتوں سے دنیا سنورتی ہے، مولانا ماجد سے عاقبت۔ آپ حد اوسط پر ہیں، اِس لیے بگاڑ آپ سے بھی اچھا نہیں''۔

''یہ آپ نے کیا کیا، آپ ادب برائے زندگی کے اور میں خالص ادب کا قائل ہوں۔ آپ نے مجھے غلام امام شہید یا نوح ناروی کیوں سمجھ لیا۔ ادب یا زندگی ترقی پسندوں کے نزدیک دو حقیقتیں ہوں گی، پیغمبروں کے یہاں یہ ایک ہی چیز ہے''۔

اِن خطوں میں بہت سے دلچسپ واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک واقعہ یہ ہے:

''ہر طرح کے نامعقول مشاغل سے فرصت پا کر بیٹھا تھا کہ اب کچھ معقول کام کروں گا۔ برآمدے کے بورے کے پردے امتدادِ زمانہ سے چھلنی ہوگئے ہیں۔ بعض اتنے پھٹ گئے ہیں کہ پہلے لڑکوں نے اور اب دوسروں نے اُن میں آنا جانا شروع کردیا ہے۔ بازار سے بوریاں اور سُتلی منگائی ہے۔ اِس وقت سب کی مرمت کرنے جارہا تھا۔ اِن پردوں کی مرمت اتار کر نہیں کر سکتا تھا، اِس لیے کہ پھر اُن کو اُن کی جگہ پر نہیں لایا جاسکتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اِس وقت جب کہ جھکڑ چل رہا ہے، اِن کی مرمت کیسے کی جائے۔ میں نے دو بچوں کو آمادہ کیا کہ وہ پردے کے نچلے ڈنڈوں کے سرے تھامے رہیں۔ اُن میں سے ایک صاحب سرے کو تھامے رہنے کے بجائے اس پر بیٹھ گئے۔ بوری جواب دے گئی کام اور بڑھ گیا''۔

اِس مجموعہ خطوط کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور نے نہایت جامع اور عالمانہ دیباچہ لکھا ہے جس سے رشید صاحب کی خط نگاری اور اُن کی شخصیت کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ خطوط پر مفصّل حواشی بھی لکھے ہیں جن کی وجہ سے بعض غیر واضح مقامات کو سمجھنے میں آسانی ہوگئی ہے۔ ترتیب و تدوین کے اعتبار سے یہ ایک مثالی کتاب ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ خطوط کے مجموعے مرتب کرنا، دوسری تحریروں کے مرتب کرنے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔

(۲رجنوری ۱۹۹۷ء)

Marfat.com

ترجمہ یا مجموعۂ لطائف

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ جب تک دونوں زبانوں پر قدرت نہ ہو، اِس کام میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے کیوں کہ یہ ایک خطرناک کام بھی ہے۔ مترجم کی غلطیاں قارئین کی گمراہی کا باعث بن سکتی ہیں۔ وہ لوگ جو اپنی زبان میں چار صحیح جملے بھی نہ لکھ سکتے ہوں، اُنھیں تو ترجمہ کرنے سے اُسی طرح پرہیز کرنا چاہیے جس طرح ذیابیطس کا مریض شکر سے پرہیز کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اُس کے پس ماندگان کا جو حال ہوگا، وہی غلط ترجمہ پڑھنے والوں کا ہوگا۔

اکبر کے زمانے میں سنسکرت کتابوں کے ترجمے کا کام ہوا تو سنسکرت اور فارسی کے جید علما ایک ایک جملے پر غور کرتے تھے تب کہیں برسوں میں کسی کتاب کا ترجمہ مکمل ہوتا تھا، مگر جب انگریزوں نے اپنے منشیوں کی مدد سے برصغیر کی کتابوں کو انگریزی میں منتقل کیا تو بعض تراجم مجموعۂ لطائف بن گئے۔ اِس کی بہترین مثال سی۔ ٹی منکاف کی وہ کتاب ہے جس میں معین الدین حسن خاں اور جیون لال کے ۱۸۵۷ء کے روزنامچوں کے انگریزی ترجمے شامل ہیں۔ جیون لال نے اپنے روزنامچے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک گھوڑا جو فروخت کے لیے آیا تھا، بادشاہ نے ملاحظہ کیا۔ منکاف نے ''فروخت'' کو ''فرید کوٹ'' پڑھا اور ترجمہ کیا، ایک گھوڑا جو فرید کوٹ سے آیا تھا، بادشاہ نے ملاحظہ کیا۔ جیون لال کے روزنامچے کی ایک عبارت ہے: ''ایک اشتہار بہ مضمون ٹھیکہ افیون و بھنگ و چرس کا شہر دہلی میں مشتہر کیا گیا''۔ منکاف نے اس کا ترجمہ کیا:

A proclamation was issued selling the Bank

Marfat.com

House and some opium.

قطع نظر اِس سے کہ ٹھیکہ دینے اور فروخت کرنے میں بڑا فرق ہے، منشیات کے ذکر میں یہ بینک ہاؤس کہاں سے آ گیا؟ قصہ یہ ہے کہ مُتکاف نے ''بنگ و چرس'' کو ''بنک ہاؤس'' پڑھا۔ اُس زمانے میں دہلی میں ایک انگریز خاتون کے مکان کا نام ''بنک ہاؤس'' تھا۔ مٹکاف نے سوچا کہ اشتہار میں اِسی ''بنک ہاؤس'' کا ذکر ہے۔ یہ نہ سوچا کہ بھنگ اور چرس بھی افیون کی طرح نشہ آور چیزیں ہیں اور یوں اُس نے ترجمے کے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔

یہ سب باتیں ہمیں اِس لیے یاد آئیں کہ مٹکاف کے ترجمے جیسا ایک ترجمہ حال ہی میں ہماری نظر سے گزرا ہے، اُس کا نام ہے: ''لطف اللہ کی آپ بیتی''۔ اِس کے مترجم مشہور ''مورخ'' ڈاکٹر مبارک علی ہیں۔ اِس ترجمے کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ لطف اللہ کون تھا۔

لطف اللہ ۱۸۰۲ء میں دھارنگر (مالوہ) میں ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اُس کا سلسلۂ نسب پندرہ واسطوں سے بابا فرید گنج شکرؒ تک پہنچتا ہے۔ گھریلو حالات کی خرابی کی وجہ سے لطف اللہ دس برس کی عمر میں گھر سے بھاگ نکلا۔ اُس نے عجیب و غریب حالات میں زندگی بسر کی۔ ڈاکوؤں اور ٹھگوں سے لے کر علما و فضلا تک، ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑا۔ روح و تن کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے مختلف طرح کے مشاغل اختیار کیے۔ عربی و فارسی کی ابتدائی کتابیں تو وہ بچپن ہی میں اپنے گھر میں پڑھ چکا تھا۔ گھر سے نکل کر بھی علم حاصل کرنے سے غافل نہ رہا۔ طب اور مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ اپنے شوق کی بنا پر انگریزی زبان بھی سیکھ لی اور اِس میں اتنی استعداد حاصل کی کہ ہندوستان میں نووارد انگریز فوجیوں کو عربی، فارسی، مراٹھی اور اردو سکھانے کا شغل اختیار کیا۔ لطف اللہ کو گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔ انگریزوں کو پڑھانے کی وجہ سے سیر و سفر کے بے شمار مواقع ملے۔ ۱۸۳۸ء میں وہ سندھ میں بھی آیا۔ شکارپور، سکھر، حیدرآباد، ٹھٹھہ، کراچی اور بعض دوسرے شہروں میں اُس کا قیام رہا۔ میرانِ سندھ سے انگریزوں کا جو معاہدہ ہوا تھا، اُس کا فارسی ترجمہ لطف اللہ ہی نے کیا تھا اور جب فریقین نے اِس معاہدے پر دستخط کیے تو وہ وہاں موجود تھا۔

۱۸۴۳ء میں سورت کے نواب افضل الدین خاں کا انتقال ہوا۔ انگریزوں نے اُن کے خاندان کو تمام مراعات سے محروم کر دیا۔ اِس ناانصافی کے ازالے کے لیے مرحوم نواب کے داماد میر جعفر علی خاں نے لندن جا کر اپنے حقوق حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ اُس نے جن لوگوں کو اپنے ساتھ لیا اُن میں لطف اللہ بھی تھا تاکہ اُس سے ترجمانی اور وکالت کا کام لیا جا سکے۔

Marfat.com

مارچ ۱۸۴۴ء میں لطف اللہ لندن گیا اور اسی سال اکتوبر میں واپس آیا۔ لندن میں اس نے بہت مصروف وقت گزارا۔ تاریخی عمارتیں دیکھیں، پارلیمنٹ کے اجلاس کا مشاہدہ کیا، عمائد سے ملاقاتیں کیں۔ جان شیکسپیئر اور کرنل سائیکس جیسے مستشرقین سے رسم و راہ پیدا کی۔ لندن کے عوام کے مختلف طبقوں میں گھوم پھر کی اُن کی معاشرت سے آگاہی حاصل کی۔

لندن سے واپس آنے کے چند برس بعد لطف اللہ نے انگریزی میں اپنے حالاتِ زندگی قلم بند کیے اور ۱۸۵۴ء میں اپنی کتاب کا مسودہ کرنل سائیکس کو لندن بھیجا کہ وہ اُسے بہ نظرِ اصلاح دیکھ کر چھپوا دے۔ کرنل سائیکس نے یہ مسودہ لطف اللہ کے ایک شاگرد ایڈورڈ ایسٹ وک کو دیا۔ اُس نے اُسے مرتب کیا۔ مسودے کے بعض حصے حذف کر دیے جو انگریز قارئین کی دلچسپی کے نہیں تھے۔ ۱۸۵۷ء میں یہ کتاب Autobiography of Lutfullah کے نام سے لندن سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد بھی ایک ایڈیشن شائع ہوا جس سے کتاب کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں دہلی سے اس کتاب کا عکس ڈاکٹر اکبر علی ترمذی کے عالمانہ مقدمے کے ساتھ شائع ہوا۔ لطف اللہ کی صحیح تاریخ وفات معلوم نہیں لیکن ۱۸۷۴ء تک اُس کا زندہ رہنا ثابت ہے۔

لطف اللہ کی آپ بیتی ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اُس نے اپنے مشاہدات و تجربات کے بیان میں بے شمار ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن سے انیسویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی و معاشرتی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتاب ہر اعتبار سے اس لائق ہے کہ اِسے اردو میں منتقل کیا جاتا۔ مگر ڈاکٹر مبارک علی نے جو ترجمہ شائع کیا ہے، وہ کسی اعتبار سے بھی مطابقِ اصل نہیں ہے۔ اِس کا اندازہ کرنے کے لیے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل کتاب کے کسی بھی صفحے کا مقابلہ ترجمے سے کیا جائے تو منشائے مصنف کے برعکس مترجم کی جولانیِ طبع کے مظاہرے دیکھے جاسکتے ہیں۔ افسوس کے یہاں زیادہ مثالوں کی اور پھر بڑی عبارتوں کے غلط تراجم کے نمونے پیش کرنے کی گنجایش نہیں ہے، اس لیے چند چھوٹی چھوٹی عبارتیں بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کی جاتی ہیں۔ اصل کا ایک سادہ سا جملہ ہے:

Anand Rao was succeded by his brother. Syaji Rao.

اِس کا ترجمہ کیا گیا ہے: ''آنند راؤ اپنے بھائی سیاجی راؤ کے بعد گدی نشین ہوا۔'' اصل کا مفہوم اِس کے برعکس ہے۔ آنند راؤ کا جانشین اُس کا بھائی سیاجی راؤ تھا۔ لطف اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے:

"...bathing in the river Jamna here. frees him from

Marfat.com

the one third of the sins at least."

اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ''جمنا میں نہانے سے صرف تین گنا گناہ ختم ہو جاتے ہیں''۔ بات ہو رہی ہے ایک تہائی گناہوں کی اور مترجم نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین گنا گناہ معاف کر دیے اور وہ بھی لفظ ''صرف'' کی قید کے ساتھ۔

معاہدے کے بعد میرانِ سندھ نے ریزیڈنٹ کو مٹھائی بھیجی۔ اِس کا ذکر کرتے ہوئے لطف اللہ لکھتا ہے:

Resident, having received a number of trays of sweetmeats from their highnesses as an entertainment to all the gentlemen of the camp,had the kindness to send me two of them, containing about eighty pounds of excellent confection etc.

ڈاکٹر مبارک علی نے اس عبارت کا یہ ترجمہ کیا ہے: ''ریزیڈنٹ کو میرانِ حیدر آباد کی جانب سے مٹھائیوں کے تھال ملے تاکہ وہ کیمپ کے تمام لوگوں کا منہ میٹھا کرائیں۔ اِس کے جواب میں ریزیڈنٹ نے اچھی قسم کی آٹھ پاؤنڈ کی شیرینی لے کر اُن کی خدمت میں بھیجی''۔

دیگر غلطیوں کا تو کیا ذکر، مٹھائی کے بیان میں جناب مترجم ایسے ریشہ خطمی ہوئے کہ پہلے تو اسّی پونڈ کو گھٹا کر آٹھ پونڈ کر دیا، اور پھر یہ مٹھائی لطف اللہ کی بجائے میرانِ سندھ کو بھجوا دی حالاں کہ میرانِ سندھ کے رتبے کو دیکھتے ہوئے مٹھائی کا وزن گھٹانے کی نہیں، بڑھانے کی ضرورت تھی۔

جناب مترجم کی بعض ستم ظریفیاں بھی قابلِ توجہ ہیں۔

اُنھوں نے اصل کی درجنوں عبارتوں کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے اور بہت سی عبارتوں کی تلخیص کر دی ہے۔ کتاب کے شروع میں کرنل سائیکس کے نام لطف اللہ کا خط ہے۔ اُس کے آخری پیراگراف کا ترجمہ نہیں کیا۔ مرتّب کے دیباچے کے صرف ایک چوتھائی حصے کا ترجمہ کیا ہے۔ آپ بیتی کے شروع میں لطف اللہ کا نسب نامہ ہے۔ یہ پورے کا پورا حذف کر دیا ہے۔ کتاب کے صفحہ ۵۳۔۵۲ پر پانچ عورتوں کی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ یہ کہانی ترجمے میں موجود نہیں۔ صفحہ ۶۱۔۵۸ پر سیاروں کا بیان ہے۔ ترجمے سے یہ غائب ہے۔ لطف اللہ نے ایک جگہ (صفحہ ۶۷۔۵۴) پورے چودہ صفحوں میں مصری قاضی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ یہ چودہ صفحے بھی ترجمے سے محروم رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کہیں جناب مترجم کو انتقالِ مطالب میں دقت محسوس ہوئی، وہاں اُنھوں نے ترجمے کی زحمت نہیں اٹھائی۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ

Marfat.com

زیرِنظر ترجمہ پوری کتاب کے مطالب کا احاطہ نہیں کرتا۔

مترجم نے کتاب کے شروع میں ڈھائی صفحات کا ایک تعارف بھی لکھا ہے لیکن اُس میں مصنف کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ وہ کون تھا۔ صرف یہ اطلاع دی ہے کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا۔ یہ واحد اطلاع بھی غلط ہے۔ لطف اللہ نے کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت نہیں کی۔ کمپنی کے ملازم ذاتی طور پر اُس کی خدمات حاصل کرتے تھے اور اُس کے کام کا معاوضہ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ مترجم نے کتاب کا ہندوستانی ایڈیشن بھی نہیں دیکھا جس کے مقدمے میں سید اکبر علی ترمذی نے لطف اللہ کے بارے بہت سی معلومات فراہم کی ہیں۔ اِس سے پہلے مشہور محقق ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی بھی لطف اللہ پر ایک جامع مقالہ لکھ چکے ہیں۔ ان کا لطف اللہ سے خاندانی تعلق تھا اور آپ بیتی کا اصل مسودہ بھی اُن کے پاس تھا۔ ڈاکٹر مدنی نے سورت میں لطف اللہ کی حویلی اور شان دار کتب خانہ بھی دیکھا تھا جس میں انگریزی، فارسی اور عربی کی ہزاروں نادر و نایاب کتابیں تھیں۔ ڈاکٹر مدنی نے بتایا ہے کہ لطف اللہ کا بیٹا فضل اللہ بھی صاحبِ علم تھا۔ اس نے گجرات کی تاریخ ''مرأتِ سکندری'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اسے خان بہادر کا خطاب ملا تھا۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے بھی لطف اللہ کی آپ بیتی پر ایک مقالہ لکھا تھا جو اُن کی کتاب ''اشخاص و افکار'' میں شامل ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے اِن محققانہ اور عالمانہ تحریروں سے استفادہ نہیں کیا۔ اگر وہ اِن تحریروں کو دیکھ لیتے تو اپنے ترجمے کے تعارف کو بامعنی بنا سکتے تھے۔ رہی ترجمے کی زبان تو اس کا اندازہ اس ایک جملے سے کیا جا سکتا ہے: ''پانی کی کافی تعداد ہمارے ساتھ تھی''۔ پانی کے لیے تعداد کا لفظ اردو زبان میں پہلی مرتبہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسے جناب مترجم کی اولیات میں شمار کرنا چاہیے۔

(۱۶/ جنوری ۱۹۹۷ء)

Marfat.com

گمراہانِ جادۂ تحقیق

اردو کے عام مصنفین سے ہمارا معاہدہ ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے لکھتے رہیں اور ہم آنکھیں بند کر کے پڑھتے رہیں۔ اِس میں دونوں کا بھلا ہے کہ اول الذکر کو اپنے لکھے پر اور ثانی الذکر کو پڑھنے پر شرمندگی نہیں ہوتی۔ لیکن اہلِ تحقیق سے ہمارا اِس قسم کا کوئی معاہدہ نہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اُس کا زندوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ تو مردہ شوئی، گورکنی اور کفن کھسوٹی کا فن ہے۔ ظاہر ہے اِن کاموں سے دلچسپی رکھنے والے قبروں کے کتبے ہی لکھ سکتے ہیں، ادب تخلیق نہیں کر سکتے۔ عام ادبی تحریریں پڑھنے سے پہلے ہم عمداً آنکھیں بند کر لیتے ہیں، لیکن کوئی تحقیقی مقالہ دیکھ کر آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔

جب کوئی اچھا خاصا معقول آدمی تحقیقی کاموں سے دلچسپی لینے لگے تو ہمیں حیرت ہی نہیں افسوس بھی ہوتا ہے۔ حیرت اِس پر کہ ایک اچھے خاصے معقول آدمی نے جادۂ تحقیق پر قدم رکھا اور افسوس اِس کا کہ گمراہانِ جادۂ تحقیق میں ایک کا اضافہ ہوا۔ اِس وقت حسن رضوی کا تحقیقی مقالہ ہمارے سامنے ہے جو ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن کے بارے میں ہے اور ہم سوچ رہے ہیں کہ اِس پر مقالہ نگار کو مبارک باد دیں یا اظہارِ ہمدردی کریں۔ مبارک باد اِس پر کہ مقالہ لکھ کر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہوگی اور اظہارِ ہمدردی اِس پر کہ اب اُن کا شمار محققوں میں ہوگا۔ حسن رضوی نے تین سال پہلے جس طرح حسنِ کارکردگی کا صدارتی اعزاز حاصل کیا تھا، اُسی طرح اگر وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی اعزازی لے لیتے تو کم از کم محقق ہونے کی تہمت سے بچ سکتے تھے۔ بہرحال اب جب کہ انھوں نے مقالہ نہ صرف لکھ لیا ہے بلکہ چھپوا بھی دیا ہے تو یہ توقع رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی اِس پہلی غلطی کو آخری سمجھیں گے اور تحقیقِ مزید سے پرہیز

Marfat.com

کریں گے تاکہ اُن کی عاشقانہ و فاسقانہ شاعری کے راستے میں رکاوٹیں پیدا نہ ہوں۔ ایک تخلیق کار کا درجہ محقق سے کہیں بڑا ہوتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ موصوف شاعری میں اگر میر تقی میر نہ بن سکیں تو میر صاحب کے بیٹے میر کلو عرش ہی کے برابر ہو جائیں کہ ادب میں میر کلو عرش بننا قاضی عبدالودود بننے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

حسن رضوی نے ناصر کاظمی پر تحقیق کرنے میں جس محنت، ہمت اور صبر و ضبط سے کام لیا ہے، دنیائے تحقیق میں اُس کی پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ مقالے کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں: ''جب میں نے ناصر کاظمی پر کام شروع کیا تو میری پہلی کار چوری ہوگئی جس میں میرے اور بہت سے ضروری کاغذات اور اشیا کے علاوہ میرا ریسرچ ورک بھی شامل تھا۔ خاص طور پر اُس میں ناصر کاظمی کے کئی احباب کے انٹرویوز کیسٹ تھے جو گاڑی کے ساتھ چوری ہو گئے، سو مجھے ازسرِنو پھر ہمت سے کام لینا پڑا۔ اِس کے بعد پھر میرے ساتھ یہی حادثہ دوبارہ پیش آیا اور میری دوسری کار بھی چوری ہو گئی۔ اِس میں بھی میری تحقیق سے متعلق کافی مواد شامل تھا جو چوری ہو گیا''۔

تحقیق کی خاطر دو کاروں کی قربانی دے دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ تحقیق جہاں دوسروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی وہیں محقق کے لیے بھی خاصی نقصان دہ ہوتی ہے۔ بہرحال یہ حسن رضوی ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ بھاری نقصانات کے باوجود دل برداشتہ نہیں ہوئے اور بالآخر ایک نہایت ضخیم مقالہ لکھنے میں کامیاب ہوگئے جس کا وزن بقول شخصے غیر مطبوعہ حالت میں پانچ کلو سے زیادہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کار چور حضرات سخن فہم نہیں تھے۔ وہ مقالے کے خام مواد ہی کو چوری کرتے رہے۔ مقالے کے مکمل ہونے کا انتظار تو کر لیتے۔ پانچ کلو وزنی کاغذات کے پلندے کا بھی کوئی نہ کوئی گاہک مل ہی جاتا۔

عام محقق اپنے گھروں میں یا لائبریریوں میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ پاؤں توڑ کر بیٹھنے ہی سے تحقیق کے تقاضے پورے کیے جاسکتے ہیں۔ حسن رضوی نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ناصر کاظمی کے آبائی شہر انبالے گئے۔ لکھتے ہیں: ''میں اُس شہر اور اُس کے محلّوں میں گھوما پھرا اور ناصر کی شاعری کی خوشبو کو مختلف حوالوں سے اُن گلیوں اور محلّوں میں محسوس کیا''۔

حسن رضوی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اُنھوں نے ایک بالکل نیا نظریۂ تحقیق پیش کیا ہے کہ جس شاعر پر تحقیق کرنی ہو، اُس کے آبائی شہر کے محلوں اور گلیوں میں سیر کی جائے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ایک جگہ جم کر بیٹھے رہنے سے محققوں کی صحت خراب رہتی ہے۔ حسن رضوی کے طریقِ تحقیق پر عمل پیرا ہونے کا خوش گوار نتیجہ سامنے آئے گا۔ تحقیق تو کمزور ہو

Marfat.com

جائے گی لیکن خود محقق صحت مند و توانا رہیں گے۔

اقبال کے بعد کی گزشتہ نصف صدی میں ہمارے جن چند شاعروں نے اردو شاعری کو فکر و فن کی نئی جہتوں سے آشنا کیا، اُن میں ناصر کاظمی سرِفہرست ہیں۔ غزل جیسی پامال صنفِ سخن میں اُنھوں نے اپنے لیے ایک نیا راستہ نکالا۔ غزل کی روایت میر و غالب سے ہوتی ہوئی جب اُن تک پہنچتی ہے تو طرزِ احساس اور طرزِ بیان دونوں کی ندرت ہمیں ایک نئے رنگِ سخن سے متعارف کراتی ہے۔ حسن رضوی نے اِسی طرح دار اور رجحان ساز شاعر کی شخصیت اور شاعری کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ ناصر کاظمی کی زندگی اور شاعری کے پس منظر کے بارے میں اُنھوں نے اتنا مواد اپنی کتاب میں جمع کر دیا ہے کہ آنے والے محققین اِس مواد کو کام میں لا کر مزید کتابیں لکھیں گے۔ گویا حسن رضوی نے کتاب نہیں لکھی، مستقبل کے محققین کو روزگار فراہم کر دیا ہے۔

حسن رضوی پیشہ ور محقق نہیں ہیں مگر بقول انتظار حسین کام اُنھوں نے پیشہ وروں یعنی کھلے کھلائے محققوں جیسا دکھایا ہے۔ کمال یہ کیا ہے کہ ناصر کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے، خود ناصر کے بعض بیانات کی بھی تردید کر دی ہے۔ مثلاً ناصر کاظمی نے اپنی ڈائریوں میں اپنی تاریخ پیدائش ۸؍ دسمبر ۱۹۲۵ء لکھی ہے۔ حسن رضوی نے ناصر کا میٹرک کا سرٹیفکیٹ ڈھونڈ نکالا جس میں تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۲۳ء درج ہے۔ اگر ناصر کاظمی کو معلوم ہوتا کہ حسن رضوی اتنی دور تک اُن کا پیچھا کریں گے تو وہ میٹرک کا امتحان ہی نہ دیتے۔

ناصر کاظمی اپنے آپ کو خاندانی رئیس کہتے تھے۔ حسن رضوی نے بزورِ تحقیق ثابت کیا ہے کہ وہ ہرگز خاندانی رئیس نہیں تھے۔ ہاں کھاتے پیتے خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اِسی طرح بعض حاسدوں نے یہ مشہور کر دیا کہ ناصر کاظمی سادات میں سے نہیں تھے۔ حسن رضوی نے بڑی تلاش و تحقیق سے ناصر کا شجرۂ نسب ڈھونڈ نکالا اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ کھرے اور سچے سیّد تھے۔ کیا ہی اچھا ہو حسن رضوی اگر استاد لاغر مراد آبادی کا شجرۂ نسب بھی تلاش کر دیں کہ استادِ گرامی کے بعض بدخواہوں نے یہ اُڑا رکھی ہے کہ اُن کا تعلق مراد آباد کے کھٹیروں سے نہیں جالندھر کے انصاریوں سے ہے۔

ناصر کاظمی نے اپنی ڈائریوں میں اپنے اُس زمانے کے ایک عشق کا ذکر کیا ہے جب اُن کی عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ حسن رضوی کہتے ہیں کہ ناصر کی رومانی زندگی صرف اِسی عشق تک محدود نہیں۔ دس برس کی عمر سے پہلے بھی وہ یہ شغل فرماتے رہے ہیں۔ اُنھیں بچپن ہی سے چڑیوں سے عشق تھا۔ وہ اُن کے گھونسلوں کا کھوج لگایا کرتے تھے۔ بچپن کے اِس عشق نے ناصر

Marfat.com

کو زندگی بھر پریشان رکھا۔ بقول حسن رضوی: ''ناصر نے تمام عمر چڑیوں سے عشق کیا۔ وہ صبح سویرے جب چڑیوں کو بولتے سنتے تو اداس ہو جاتے''۔ حسن رضوی کی تحقیق سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ ناصر کی شاعری میں جو اتنی ڈھیر ساری اداسی ملتی ہے، اُس کا سبب یہی چڑیاں ہیں۔ افسوس کہ ناصر کاظمی کی خوشیوں کا کھیت اِن ظالم چڑیوں نے چگ لیا۔

ناصر کے دس گیارہ برس کی عمر والے عشق کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے حسن رضوی بتاتے ہیں کہ یہ عشق اِس لیے ناکام ہوا کہ لڑکی کا تعلق دھوبیوں کے گھرانے سے تھا اور ناصر سیّدزادے تھے۔ اِس طبقاتی اختلاف کی وجہ سے عشقِ پیچاں کی بیل منڈھے نہ چڑھی۔ ناصر نے اپنے بزرگوں کو راہ پر لانے کی خاطر یہ دلیل پیش کی کہ لڑکی کا باپ دھوبی نہیں، ڈرائی کلینر ہے۔ مگر اِس لفظی ہیر پھیر سے بزرگوں کی رائے میں تبدیلی نہ آئی۔ حسن رضوی کے مقالے کا یہ حصہ اتنا دلچسپ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ افسوس کہ حسن رضوی نے یہ داستان بیان کرتے ہوئے اِس پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کم از کم وہ دھوبی اور ڈرائی کلینر کا فرق واضح کر سکتے تھے کہ ایک کا تعلق تری سے ہے اور دوسرے کا خشکی سے اور یہ ساری دنیا خشک و تر ہی کا مجموعہ ہے۔

حسن رضوی نے ناصر کاظمی کا ایک اور عشق کا بھی ذکر کیا ہے۔ جب اُن کی عمر چودہ پندرہ برس کی تھی۔ یہ بہت سچا اور کھرا عشق تھا مگر اِس کی قسمت میں بھی ناکامی لکھی گئی۔ حسن رضوی لکھتے ہیں: ''ناصر نے جس سے بھرپور عشق کیا، اُس کا نام تک زبان سے ادا نہ کیا اور نہ ہی اپنے کسی دوست سے اُس کا ذکر کیا۔ اِس لیے کہ وہ کسی کی رسوائی نہیں چاہتے تھے۔ اِس لیے کہ اُنھیں جس سے عشق تھا، وہ سیّد زادی تھی... اُن کی بیگم اور بھائی نے بھی اس کا کبھی کسی سے ذکر تک نہیں کیا۔ بیٹوں نے بھی کھل کر کوئی بات نہیں کی''۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسن رضوی نے ناصر کاظمی کے بھائی، بیگم اور بیٹوں کو اپنی تحقیقی ضروریات سے پوری طرح آگاہ نہیں کیا، ورنہ وہ تمام ضروری معلومات فراہم کر دیتے۔ نیز حسن رضوی اگر تحقیق کی بجائے پولیس والی تفتیش سے کام لیتے تو زیرِ بحث معاشقے کے ساتھ ساتھ دو چار اور معاشقوں کی تفصیلات بھی دستیاب ہو جاتیں جن کی طرف زیرِ نظر کتاب کے دیباچے میں انتظار حسین نے اشارہ کیا ہے۔

انتظار حسین لکھتے ہیں: ''حسن رضوی نے ناصر کی بعض ایسی جذباتی وابستگیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کا قرائن کے اعتبار سے مجھے عینی شاہد ہونا چاہیے۔ مگر میں حسن رضوی کو اپنے پچھے پہ ہاتھ نہیں رکھنے دوں گا۔ ناصر کے بعض ہم عصروں کی طرح میں قطعی

Marfat.com

انداز میں تو اِس کی تردید نہیں کرسکتا۔ ایسے کسی معاملے کے بارے میں آپ قطعی انداز میں کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔ مگر میں ایسی کسی فرضی یا اصلی جذباتی وابستگی کے بارے میں تصدیق بھی نہیں کرسکتا۔ میں کہیں چپکے سے کچھ لکھ لکھا کر اب سے سو سال بعد والے محقق کے لیے تو کوئی بیان چھوڑ سکتا ہوں مگر آج کے کسی محقق یا سوانح نگار کو میں کوئی سہولت فراہم کرنے یا ٹپ دینے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا''۔

انتظار حسین دراصل پرانے زمانے کے آدمی ہیں۔ اُن کی رائے میں کسی ادیب پر صحیح طور پر اُس وقت تک تحقیق نہیں ہوسکتی جب تک اس کے انتقال کو سو برس نہ گزر گئے ہوں۔ چوں کہ حسن رضوی نے ناصر کاظمی پر بہت جلد ہاتھ ڈال دیا ہے، اِس لیے اُن کی مدد نہیں کرنی چاہیے۔ انتظار حسین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب تو ادیبوں کی زندگی ہی میں اُن پر تحقیق ہونے لگی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ زندہ ادیبوں پر نہ صرف یہ کہ مواد آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے بلکہ وہ خود بھی بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں اور خود ہی مقالہ لکھ کر محقق کو دے دیتے ہیں۔ پاک و ہند کے کئی ایسے ادیبوں کو ہم جانتے ہیں جنھوں نے اپنے بارے میں پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے ہیں۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ یہ مقالے اُن کی دوسری تحریروں سے بدرجہا بہتر ہیں۔

(۶؍ مارچ ۱۹۹۷ء)

Marfat.com

Marfat.com

کالم نگار خامہ بگوش کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ اُن کی تحریریں اوّلاً کراچی کے ایک ہفت روزہ میں شائع ہونے کے بعد پاکستان، ہندوستان کے متعدد رسائل و جرائد اور اخبارات میں نقل ہوتی رہی ہیں۔ طنز و مزاح کے مخصوص اسلوب میں لکھے گئے یہ ادبی کالم اپنی گہری علمی بصیرت اور نکتہ سنجی کے باعث قریب و دور کی پوری اردو دنیا میں موضوعِ گفتگو رہے ہیں، اور آج بھی قارئین کی ایک بڑی تعداد ان کالموں کی کتابی صورت میں اشاعت کی منتظر نظر آتی ہے۔

خامہ بگوش کی تحریروں کے پہلے مجموعے (خامہ بگوش کے قلم سے) کی طرح یہ انتخاب بھی ممتاز نقاد مظفر علی سیّد کا مرتب کیا ہوا ہے۔ ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۶ء تک کی تحریروں کا یہ انتخاب مرتب نے اصلاً ایک جلد کے لیے کیا تھا لیکن کتاب کی ضخامت کے پیشِ نظر بعد ازاں اسے دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ اب یہ دونوں جلدیں ''سخن در سخن'' اور ''سخن ہائے ناگفتنی'' کے ناموں سے بیک وقت شائع کی جا رہی ہیں۔

سخن ہائے ناگفتنی

مرتب
مظفر علی سید

ACADEMY BAZYAFT

Marfat.com